

# بُرْہَان

شمارہ ۱

جلد ۴۱

جولائی ۱۹۵۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ

## فہرست مضامین

۲	سعید احمد اکبر آبادی	نظرات
۱۳	جناب مولانا محمد ظیفرا الدین صاحب مفتاحی دارالافتاء دارالعلوم دیوبند	اسلام کا نظام امن و امان
۳۱	جناب مولوی رشید احمد صاحب ارشدائیم استاذ ادبیات عربی کراچی یونیورسٹی	جدید عربی شاعری کے علم بردار
۴۶	جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فائق استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی	عربی کی ایک قلمی کتاب ہے تاریخ ہند پر نئی روشنی
۵۶	جناب مولوی سید محمد انظر شاہ صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند	رفاء عام
۶۳	جناب آتم مظفرنگری	ادبیات
۶۴	(م)	غزل تبصرے

# نظریات

## حیدرآباد میں چار دن

گزشتہ ہفتہ تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ حیدرآباد جانے کا اتفاق عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک ضرورت سے ہوا تو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ اگرچہ انقلاب کے اثرات درودیوار سے ظاہر ہیں لیکن حیدرآباد کی تہذیبی و تمدنی - اور علمی و ادبی روایات بدستور قائم ہیں اور اس بنا پر آج بھی اُس میں کوشش اور عظمت ہے جو پہلے تھی۔

۱۶ جون کو سہ پہر میں پہنچا اور مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب کا وہاں ہوا تو معلوم ہوا کہ میرے چار روزہ قیام حیدرآباد کا پروگرام جو تقریروں اور دعوتوں پر مشتمل تھا پہلے ہی بن چکا ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کے مطابق ۱۷ کی شام کو ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی دعوت پر اُن کی کوٹھی پر رکانِ ادارہ ادبیات اُردو کے ساتھ چار پی اور پھر ڈاکٹر صاحب نے مع اور چند ارکان کے ادارہ کے تمام صیغوں کا معائنہ کرایا۔ ادارہ اپنی گونا گوں اور ٹھوس ادبی خدمات کی وجہ سے ہندوپاک کا ایک نہایت موقر اور وسیع ادارہ ہے لیکن اس کے مختلف شعبوں کو دیکھنے کے بعد توجرت کے ساتھ مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ قدیم مخطوطات، سکے، مکاتیب، تصاویر، کتبات، اردو زبان و ادب کے عہد بہ عہد نشوونما سے متعلق مختلف چارٹ اور نقشے۔ غرض کہ تاریخ اور ادب اُردو پر ریسرچ کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں سے کوئی چیز ایسی نہیں تھی جو یہاں موجود نہ ہو اور حسن سلیقہ سے رکھی ہوئی نہ ہو۔ اس کے علاوہ ادارہ کے کام خود نوع در نوع ہیں۔ اب تو ادارہ نے اُردو کے مصنفوں اور ادیبوں کی ایک نسل پیدا کر دی ہے جو زبان و ادب کی قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ



کیا کرایا ایک ہی شخص یعنی ڈاکٹر زور کلہے۔ موصوف میں جہاں تحقیق اور تصنیف و تالیف کی اعلیٰ صلاحیت ہے ساتھ ہی تنظیمی قابلیت بھی بلند درجہ کی ہے وہ خود بھی کام کرتے ہیں اور دوسروں سے کام لینا بھی خوب جانتے ہیں۔ آج کل بڑے سلیقہ اور شوق سے ادارہ کی اپنی بلڈنگ بنوا رہے ہیں۔ یہ بلڈنگ موجودہ پلان کے مطابق مکمل ہو گئی تو پچھلے محضر اردو محل ہوگی۔ حیدر آباد کے مشہور اہل قلم نصیر الدین صاحب ہاشمی اور بعض مشاہیر حیدر آباد سے بھی چائے پر ملاقات ہوئی اور دیر تک گفتگو رہی۔ اسی روز شب میں چوک کی مسجد میں تقریر کا اعلان ہو چکا تھا لیکن ٹمپر پھر ہو جانے کی وجہ سے اس کو منسوخ کرنا پڑا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لوگ دور دور سے بڑی تعداد میں آئے تھے اور جب میں نہیں پہنچا تو مجھ کو برا بھلا کہتے ہوئے واپس ہوئے واللہ! ۸۔ اکاڈمی آف اسلامک اسٹڈیز کے زیر اہتمام ”ہم انسانیت کی بہترین خدمت کس طرح کر سکتے ہیں“ کے موضوع پر تقریر ہوئی جو شام کے چھ بجے سے سات بجے تک ایک گھنٹہ جاری رہی اکاڈمی حیدر آباد کے ارباب علم کی خاص انجمن ہے چنانچہ اس جلسہ میں بھی یونیورسٹی کے ممتاز ہندو مسلم اساتذہ اور دوسرے ارباب علم کا بڑا اچھا منتخب اجتماع تھا۔ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاد ڈاکٹر سید معین الدین قادری اکاڈمی کے جنرل سکریٹری اور ڈاکٹر سید عبداللطیف اس کے صدر ہیں اکاڈمی مقالات اور مذاکرات کی ماہانہ نشستوں کے علاوہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ بھی انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں سلامیات کا علمی ذوق پیدا کر کے مفید خدمات انجام دے رہی ہے یہاں جو تقریر ہوئی تھی وہ صرف خواص کے سامنے تھی۔ ۱۹۔ کو مفرج کے بعد سکندر آباد کی جامع مسجد میں رحمتہ للعالمین کے موضوع پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی۔ اس اجتماع میں عوام اور خواص دونوں کا کثیر مجمع تھا اسنوس ہے کہ اس در میں بھی حیدر آباد میں دیوبندی اور بریلوی اختلافات کی بڑی گرم بازاری ہے چنانچہ جب میری تقریر کا اعلان ہوا اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں دیوبند سے نسبت رکھتا ہوں تو ان میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں اور طرح طرح کی باتیں کہی گئیں۔ لیکن الحمد للہ! تقریر کے بعد جیسے گویا مطلع صاف



ہو گیا جو حضرات دیوبندی مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں انہوں نے بھی مصافحہ کیا اور تقریر کی تعریف کی وجہ یہ ہے کہ میری تقریر ہمیشہ اسلام کی اصولی اور بنیادی تعلیمات پر مبنی ہے۔ فروعی اور جزئیاتی مسائل سے میں تعرض نہیں کرتا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کو حیدرآباد پہنچتے ہی دیکھ لیا تھا۔ یہاں اب ذریعہ تعلیم بجائے اُردو کے انگریزی ہے گویا

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

ہندی اور کوئی علاقائی زبان اس لائق نہیں تھی کہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم بن سکے۔ لیکن بہر حال سالہائے دراز کے کامیاب تجربہ کے باوجود اُردو کو برداشت کیا نہیں جاسکتا تھا اس لئے جو پورے ملک میں کہیں نہیں ہوا وہ یہاں ہو گیا یعنی اُردو کو ہٹا کر انگریزی کو اُس کی جگہ دے دی گئی جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کیے

اس کے علاوہ شعبہ دینیات کا نام بدل کر مذہب و ثقافت رکھ دیا گیا ہے اور اب اسلامی دینیات کے ساتھ ایشیا کے مختلف مذاہب کی دینیات کی بھی تعلیم ہوتی ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس وقت میں یونیورسٹی پہنچا اُسی وقت مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب شعبہ مذہب و ثقافت کی صدارت سے سکدوش ہو رہے تھے اور ڈاکٹر یوسف الدین صاحب اُس کا چارج لے رہے تھے۔ اُس وقت میں پہلی بار حیدرآباد گیا تھا تو یونیورسٹی میں ہر طرف ترکی ٹوپیاں اور شیر و انیاں نظر آتی تھیں۔ آج کل وہ بات نہیں ہے۔ لباس اور وضع قطع میں یکسانیت باقی نہیں رہی اُردو اگرچہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم نہیں ہے لیکن بعض کالجوں میں اب بھی ہے۔ آصفیہ لائبریری جس کا نام بے سنٹرل اسٹیٹ لائبریری ہو گیا ہے کئی مرتبہ جانا ہوا۔ ایک دن لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں کتابیں دیکھ رہا تھا کہ مس سمنہ شوکت سے ملاقات ہوئی یہ اُردو میں فرسٹ کلاس ایم۔ اے ہیں اور آج کل پی۔ ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہی ہیں گفتگو سے کافی ذہین اور صاحب ذوق و نظر معلوم ہوتی ہیں کتب خانہ سعیدیہ جو



ڈاکٹر یوسف الدین صاحب کے خاندانی کتب خانہ کا صرف ۱۲ حصہ ہے اس کو بھی دیکھا۔ اس میں پانچ ہزار عربی کے اور ایک ہزار فارسی کے مخطوطات ہیں اور پھر ٹری بات یہ ہے کہ بعض کتابیں خود اصل مصنف مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی وغیرہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور بعض کتابیں وہ ہیں جن میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ایسے نامور بزرگوں نے کئی کئی مرتبہ درس دیا ہے دقت کی کمی کا بہت انوس رہا کتب خانہ کے محافظ اور کارکن دونوں بڑے خوش سلیقہ ہیں اور کتب خانہ کو جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، سر سالار جنگ کا کتب خانہ اور میوزیم بھی دیکھا۔ اللہ اکبر، دونوں چیزیں کس قدر عظیم الشان اور بلند مرتبہ ہیں اگر مقدور ہو تو بس! زنگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

یہاں کیا کیا دیکھا اور کیا کیا محسوس کیا؟ اس کو قلم بند کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے اس لئے اور کچھ کیا لکھا جائے، اگر کسی شخص نے حیدر آباد جا کر اس میوزیم اور کتب خانہ کو ہی نہیں دیکھا تو اس کی بدذوقی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا! اس وقت میوزیم میں جو سامان ہے اس کی قیمت کا اندازہ ۵۰ کروڑ روپیہ کیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ سامان صرف ۱۲ حصہ ہے ان چیزوں کا جو سالار جنگ مرحوم نے دنیا کے کونہ کونہ سے جمع کی تھیں ابھی درحقہ سامان غیر مرتب پڑا ہوا ہے اور میوزیم کی زیرت نہیں بنا۔ اسی سلسلہ میں زمانہ کالج بھی جانا ہوا، یہ کالج اب سابق انگریز ریڈیڈنٹ کے عالی شان محل میں منتقل ہو گیا ہے اس کی پرنسپل ہمیشہ کوئی انگریز خاتون ہوتی تھی مگر اب ڈھائی برس سے ڈاکٹر شری دیوی ایک ہندوستانی خاتون اس عہدہ پر فائز ہیں۔ موصوفہ نہایت ذائقہ و قابل اور بڑی خوش اخلاق و شگفتہ زاج خاتون ہیں۔ انگریزی کی تو مشہور مقررہ ہیں ہی اردو بھی بہت اچھی بولتی ہیں۔ بڑے اخلاق سے پیش آئیں، پورے کالج کا معائنہ کرایا۔ ایک ایک شعبہ دکھایا۔ کالج کے اسٹاف کی دوسری نمبر خواتین سے ملاقات کرائی اس کالج میں آرٹس۔ سائنسی میڈیکل گروپ۔ عربی۔ فارسی۔ اردو، ہندی، تیلگو وغیرہ زبانوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ پھر ذریعہ تعلیم اردو اور انگریزی دونوں زبانیں ہیں



اس لئے اسٹاف بہت وسیع ہے اور استانیاں ایک سے ایک قابل ہیں، پرنسپل اور دوسری استانیوں کو اس کا افسوس رہا کہ چونکہ کالج موسم گرما کی تعطیل کے بعد اسی دن کھلا تھا اور داخلہ شروع ہو رہا تھا اس لئے وہ کالج میں میری تقریر کا بندوبست نہ کر سکیں۔ آئندہ کے لئے بہر حال ابھی سے انھوں نے تقریر کا وعدہ لے لیا ہے۔ پورا کالج دکھانے کے بعد پرنسپل صاحب نے درج ذیل ممبران اسٹاف کے ساتھ بڑی پُر تکلف چار سے ضیافت کی میں ان سب کا دل سے شکر گزار ہوں امید قوی ہے کہ کالج موجودہ لائق و فاضل پرنسپل کے ماتحت بڑی ترقی کرے گا۔

کھڑے کھڑے تھوڑی دیر کے لئے اسلامک کالج کا دفتر بھی دیکھا انگریزی میں اسلامیات کا یہ بلند پایہ مجاہد تک تو جوں توں کر کے پابندی اور باقاعدگی سے نکلتا رہا ہے لیکن آئندہ اُس کی راہ میں دشواریاں معلوم ہوتی ہیں۔ اسٹیٹ ڈسٹریکٹ لائبریری کو اس پر توجہ کرنی چاہیے۔ دائرۃ المعارف اور ادارۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد کے مشہور علمی ادارے ہیں۔ ارادہ پختہ ان کے دیکھنے کا بلکہ چند کتابیں خریدنے کا بھی تھا مگر افسوس کہ وقت میں اس کی گنجائش ہی نہیں نکل سکی۔ اول الذکر ادارہ کی اگرچہ اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی ہے چنانچہ کتابوں کی تصحیح میں وہ اہتمام نہیں ہوتا جو اس ادارہ کا طرہ امتیاز تھا پھر دفتری نظم و نسق کا معاملہ بھی یہ ہے کہ میں نے سال گذشتہ اپنے دفتر کی جانب سے بعض کتابوں کے سلسلہ میں دو تین خط لکھے مگر ایک کا بھی جواب نہیں ملا۔ تاہم حکومت کی سرپرستی میں یہ ادارہ اب بھی قائم ہے۔ یہ بھی سبب غنیمت ہے۔

حیدرآباد کے چار درہ قیام میں بزرگوں اور دوستوں نے جو کرم پاشی کی ہے بغوائے من لم یسکر الناس لم یسکر اللہ اُس کا ذکر بھی میرا اخلاقی فرض ہے مولانا سید فضل اللہ شاہ صاحب مولانا مونگیری صاحب خاتقاہ رحمانیہ کے پوتے اور خود بلند پایہ اور وسیع النظر عالم اور صاحبِ ذرع و تقویٰ بزرگ ہیں۔ مولانا نے بڑی تحقیق اور کادش سے امام بخاری کی ادب المفرد کی شرح لکھی ہے جو مصر میں طبع ہو رہی ہے۔ صاحبِ علم و درس ہونے کے ساتھ دنیوی معاملات میں بھی بڑی سوجھ بوجھ



رکھتے ہیں۔ چنانچہ حیدر آباد میں چمڑے کی بنی ہوئی چیزوں کا کاروبار بڑے پیمانہ پر کر رہے ہیں اور اُس کی وجہ سے بہم و بوجہ ”رئیس العلماء“ کہلانے کے مستحق ہیں۔ عرصہ دراز سے اس ناچیز کو مولانا کی شفقت بے غایت کا شرف حاصل ہے۔ لیکن اس مرتبہ براہ راست مولانا کا جہان بننے کی سعادت حاصل ہوئی تو مولانا کی فیاضی۔ عالی حوصلگی اور غیر معمولی دل جوئی نے قدم قدم پر شرمندہ کر دیا۔ روزمرہ کے تمام مشاغل چھوڑ چھاڑ ہر وقت میرے ساتھ ہیں اور صبح سے شام تک کی ٹیکسی کے سخت گراں اخراجات میرے سخت اصرار کے باوجود خود اٹھا رہے ہیں۔ جانتے ہیں کہ صبح کو ناشتہ میں صرف دو پیالی چاڑ اور ایک چھوٹے سے بسکٹ کے علاوہ کوئی اور چیز بالکل نہیں کھا سکتا مگر اس کے باوجود روزانہ دسترخوان پر پلوں تخت جمع ہو رہے ہیں یہ سب کچھ لکھا تو گیا میرے ہی حساب میں لیکن کام آیا میرے رفیق سفر مولانا کی سب بی کام کے جن کو میں بطور سرکاری لے گیا تھا اور ان حضرات کے جو صبح کے وقت مجھ سے ملنے آتے تھے میری طبیعت خراب ہو گئی تو گھڑی گھڑی مولانا دا پلار ہے ہیں۔ شب میں دو بجے تین بجے اُٹھ کر میری نبض دیکھ رہے ہیں۔ ہوا ستر ہو گئی تو چادر اڑھا رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ کے فضل و کرم سے گھر میں نوکر چاکر سب موجود ہیں مگر میرا ہر کام خود کر رہے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ تصوف کا ذوق لطیف بھی انسان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔ پھر اگر صوفیائے اسلام کو دیکھ کر ہی کافر مسلمان ہو گئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں ہچیر نہ مولانا اور مولانا کی رابعہ فطرتا ہلیہ محترمہ کا کیا شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔ بس اللہ رب العالمین دونوں کو میری طرف سے اس خلاص و محبت کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

ڈاکٹر میر دلی الدین عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ فلسفہ ہیں اور تصوف پر اپنے مقالات اور تصنیفات کی وجہ سے ہندو پاک میں مشہور ہیں۔ حد درجہ مخلص اور شریف ہیں۔ دیرینہ تعلق کے باعث کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ۱۸ کی شام کو طعام شب پر یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ اور دوسرے ارباب علم کے ساتھ مدعو کیا تقایہ مجمع بڑا منتخب تھا۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد



در تک علمی مذاکرہ رہا۔

سید مظہر احسن صاحب گیلانی ایم۔ اے مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے برادر خورداور عثمانیہ یونیورسٹی میں معاشیات کے استاذ ہیں مولانا گیلانی کے ساتھ ہم لوگوں کو جو تعلق تھا اُس کی وجہ سے بالکل برادرانہ گرم جوشی اور محبت سے پیش آئے۔ ۱۷ رکو طحام شب پر پہلے سے مدعو کر رکھا تھا پرنسپل عبدالقادر۔ شری دلش پاڈے کنٹرولز آف اکرا مینسٹرز اور پرنسپل امتیاز علی وغیرہ اصحاب بھی مدعو تھے اس لئے ان حضرات سے خوب بات چیت رہی اور طبیعت محفوظ ہوئی۔ ڈاکٹر راحت اللہ خاں ایم۔ اے ڈی فل میرے دیرینہ حمیم اور مخلص دوست ہیں سینئر سٹیف لائبریری (سابق آصفیہ) کے لائبریرین اور بڑے بادضع انسان ہیں ان سے بار بار ملاقات رہی اور ایک دن پنج اور ۱۹ رکو عشائیہ (ڈنر) انھیں کے ہاں کھایا۔ محترمہ سید جہاں بیگم حیدر آباد کے ایک ممتاز خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ اُردو کے ساتھ عربی میں فرسٹ کلاس ایم اے ہیں اور کامل التفسیر بھی ہیں پھر ان سب پر مستزاد یہ کہ عشرہ قرات کی ماہر ہیں۔ پہلے حکومت کے محکمہ تعلیم میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھیں اب اُس سے مستعفی ہو کر لڑکیوں اور عورتوں کو تجوید و قرات کی تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دے رہی ہیں اور یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی بھی کر رہی ہیں۔ ازراہ کرم خود میرے قیام گاہ پر آئیں اور بڑے اصرار کے ساتھ کھانے پر مدعو کر گئیں۔ چنانچہ ۲۰ رکو جمعہ کی نماز کے بعد موصوفہ کی کوٹھی پر پرتکلف کھانا کھایا۔ یہیں کھانے پر آن محترمہ کے والد ماجد جناب محمد ابراہیم صاحب ان کے بھائی جناب محمد ایاس صاحب ایڈوکیٹ۔ قاری بسم اللہ بیگ صاحب۔ خواجہ محمد احمد صاحب ایم۔ اے اور دوسرے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ کھانے سے فراغت کے بعد میری درخواست پر محترمہ سید جہاں بیگم نے عشرہ قرات سنائیں۔ اول تو عشرہ قرات اور پھر وہ بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کی زبان سے! یہ زندگی میں میرا پہلا تجربہ تھا۔ طبیعت بے حد متاثر اور محفوظ ہوئی اور بے ساختہ دل سے دعا نکلی کہ خدا اپنی برکتیں نازل فرمائے اُس گھرانہ پر جس میں قرآن مجید کے ساتھ شرف



رکھنے والی ایسی خاتون ہو۔ یہ پورا گھر شرافت و نجابت اور اعلیٰ تہذیب و ثقافت کا منظر ہے  
 قاری سیم سنگ صاحب جن کا ذکر ادیر یا حیدر آباد کے نامور قاری ہیں پہلے فوج میں بریگیڈیر  
 تھے اب اُس سے سکندرش ہو کر شب و روز فنِ تجوید کی خدمت میں مصروف ہیں۔ سید جہاں  
 انھیں کی شاگرد ہیں۔ جناب قاری صاحب سے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آج کل حیدر آباد  
 میں تین سو فنِ تجوید کے ماہر مرد و عورت ہیں جو مردوں اور عورتوں کو قرأت کی تعلیم دے رہے  
 ہیں۔ اللہ ہم زو فرزد۔ ہمارے اطراف میں جگہ جگہ ناچ اور گانا اور حیدر آباد میں تجوید کا یہ عام ذوق  
 یہ حیدر آباد کے مسلمانوں کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔ خدا اُن کا حامی و ناصر اور کفیل ہو۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے نامور ادیب اور  
 مصنف ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے برادرِ خورد تو ہیں ہی سورت اور سیرت میں بھی اُن  
 کے مشی ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں پالیٹیکل سائنس کے پروفیسر تھے۔ اب اس سے سکندرش ہو کر  
 مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر چانسری ہو کر رہے ہیں موصوف نے مولانا سید فضل اللہ  
 صاحب کی معرفت ۱۹ کی شام کو چار پر مدعو کیا۔ دیر تک علمی اور مذہبی مسائل پر گفتگو رہی۔ ڈاکٹر  
 صاحب کی کوٹھی جوبلی ہل پر ایسے عمدہ موقع سے ہے کہ جی میں آیا کہ اگر ڈاکٹر صاحب مجھ کو اپنے  
 یہاں قیام کی دعوت دیں تو چاہے کچھ ہو جائے حیدر آباد میں پانچ چھ دن قیام کی اور گنجائش  
 مکال لوں اردو زبان کے نامور ادیب اور مصنف پروفیسر عبدالقادر سروری میرے دیرینہ  
 کرمفرما اور دوست ہیں۔ اُن سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اور بڑے اخلاص اور محبت سے  
 پیش آئے ہر چند اُنھوں نے کوشش کی میرے پروگرام میں کسی طرح ایک وقت اُن کے ہاں  
 کھانا کھانے کی گنجائش کھل آئے۔ مگر ممکن نہ ہوا اور خود مجھ کو بھی اس کا افسوس ہے کہ میں ان کے  
 مکان پر چند منٹ کے لئے بھی حاضر نہ ہو سکا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے حیدر آباد میں جو ایک  
 نئی نسل ایسے لوگوں کی پیدا کی ہے جو علومِ جدیدہ کی اعلیٰ ڈگریاں رکھنے کے ساتھ علومِ اسلامیہ



ودینیہ کے بھی مبشر اور محقق ہیں اور یہ صرف علما نہیں بلکہ عملاً بھی۔ ڈاکٹر یوسف الدین صاحب  
 اس نسل کے گل سرسبد ہیں عمر چالیس سے زیادہ نہیں ہوگی مگر اب تک انگریزی اور اردو  
 میں متعدد اہم علمی کتابیں لکھ چکے ہیں آج کل مستند عبدالرزاق کو اوڈٹ کر کے خود اس کی اشاعت  
 میں منہمک ہیں مولانا گیلانی اور ان کے واسطے سے حضرت الاستاذ مولانا سید انور شاہ کے گویا  
 نام کے عاشق ہیں۔ میری ان کی صرف ایک سرسری ملاقات کئی برس ہوئے کلکتہ میں ہوئی تھی۔  
 لیکن علمی۔ روحانی اور معنوی تعلق کی وجہ سے اس مرتبہ حیدرآباد میں اس خلوص و محبت کا معاملہ  
 کیا کہ میں اُس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ کئی بار قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اکثر تقریبات میں شریک  
 رہے اور پھر پونیرسٹی سے رخصت ہونے کے ایک دن تو مسلسل چھ سات گھنٹے ساتھ رہے۔ مولوی  
 ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بھتیجے ہیں۔ یہ خاندان کس قدر خوش نصیب ہے جس میں بیک وقت علوم جدید  
 کے ساتھ علوم اسلامیہ کے ماہر۔ اور عملاً دین کے سچے خادم دودو شخص پیدا ہو گئے ہیں اور مشرق  
 و مغرب کی علمی دنیا میں اسلام کا نام روشن کر رہے ہیں۔ بارک اللہ فی اعمارہم و اعمالہم  
 خواجہ حمید الدین شاہد ایم۔ اے چادر گھاٹ کالج میں لکچر دار ادارہ ادبیات اردو کے رکن کین  
 اور اردو کے ادیب و صاحب قلم ہیں۔ سراپا خلوص و محبت ہیں۔ میرے ساتھ اس طرح ملتے  
 تھے کہ گویا ان کے گھر میں عید آگئی ہے۔ روزانہ کئی کئی گھنٹے ساتھ رہے اُن کا تبسم چہرہ اور جذباتی  
 انداز میں اظہار محبت اب بھی رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ خدا ان کو خوش رکھے اور سکون قلب عطا فرمائے۔  
 ان حضرات کے علاوہ مولانا محمد علی حیدر آبادی۔ مولانا محمد حامد صدیقی۔ مولانا سید حسین قادری  
 شوریہ ایم۔ اے۔ محمد جمال شریف صاحب ایم۔ اے۔ جناب عبدالوہاب صاحب بی۔ اے۔  
 مولوی محمد نعیم صاحب کا بھی صمیم قلب سے شکر گزار ہوں کہ برابر کرم فرماتے رہے اور تشریف لاتے  
 رہے۔ حیدرآباد کے بزرگوں میں مولوی عبدالرحمن خاں صاحب صدر حیدرآباد اکاڈمی۔ پروفیسر  
 ہارون خاں شیروانی۔ مولانا حکیم مقصود علی خاں صاحب۔ حکیم الشعراء حضرت امجد سے دیرینہ  
 تعلق نیاز مندی کا ہے۔ اس لئے اس بھاگ دوڑ میں کھڑے کھڑے ان کے ہاں بھی حاضری دی۔



یہ حضرات اب زندگی کی بہاریں لٹ کر اس کے دورِ خزاں سے گزر رہے ہیں۔ امجد صاحب تو آنکھوں سے بھی معذور ہو گئے ہیں۔ حکیم صاحب انقلاب روزگار کی خاموش تصویر بن کر رہ گئے ہیں البتہ سعد آفریں ہے مولوی عبدالرحمن خاں صاحب اور پروفیسر شیردانی کو کہ اس ضعیف العمری میں بھی بڑی علمی کاموں میں مصروف ہیں اور ان کا ایک لمحہ بے کار نہیں۔ پروفیسر صاحب نے بڑا کرم فرمایا کہ اکاڈمی میں میری تقریر میں بھی موجود تھے۔ اور پھر اسٹیشن پر الوداع کہنے بھی آئے تھے۔ مگر یہ راستہ میں موٹر کے خراب ہو جانے کی وجہ سے اسٹیشن پر اس وقت پہنچے جب کہ ٹرین روانہ ہو چکی تھی۔ مولانا تمیز الدین قمر سنبھلی میرے بچپن کے ساتھی اور دوست ہیں۔ لیکن ان سے ملاقات نہ فائن و حصوں میں ہوئی جن میں یہی تقریر تھی معلوم نہیں کیوں کچھ شرمائے شرمائے درجائے سے رہے۔

اب کہ یہ داستان ختم ہو رہی ہے اپنے چند شرات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ میں نے نامی گرامی مسلم اداروں میں دیکھا ہے کہ کسی تقریر یا جلسہ کے موقع پر غمت یا مغرب کی نماز کا وقت آگیا ہے تو دوپہر نمازیوں سے اٹھ کر دینہ خاں روادی ادا کر لیا ہے۔ درباقی لوگ یونہی بیٹھے رہے ہیں۔ لیکن حیدر آباد میں دیکھا کہ اکاڈمی کے جلسے میں میری تقریر نماز مغرب کے وقت ختم ہوئی تو باقاعدہ صفیں بھی ہوئی تھیں اور بلا استثناء ایک اونٹ سے اونچے درجے کا پروفیسر بھی ایسا نہیں تھا جس نے جماعت سے نماز نہ پڑھی ہو یہاں تک کہ جو نیا تون شریک جلسہ تھیں انھوں نے بھی الگ نماز ادا کی۔ اسی طرح ڈاکٹر بہار علی شاہ کوئی ریونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے جو سربراہان اور بزرگ ہوتے ہوئے جلسے یا اجتماعات میں حشر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد نماز پڑھ کر یہ جلسے نہ کرتے ہیں۔ انیس چوتھ نماز کا پابند نہیں ہو گا۔ لیکن اس درمی شعور کا ادب و احترام بھی ضروری چیز ہے۔ میرے یوں میں اس کا پختہ یہ ہے اس بات کا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں بی۔ اے تک دینیات ایک لازمی مضمون تھا اور پھر اس شعبہ کا صدر تھا مورا گیدنی جیسے شخص جس نے گریجوی تعلیمات البتہ تین دین کی بنیاد پر دی۔ اسی لئے مقدمہ



لیکن افسوس ہے آپس کے اختلاف و افتراق سے حیدر آباد کے مسلمان بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ علماء میں باہم حقیقتش۔ تمار اور مشائخ میں کشمکش۔ ادارہ دارہ کا حریف۔ اردو زبان و ادب کے کارکن ایک دوسرے سے دست و گریب۔ اختلاف کی یہ عیبت کسی راج بھی مستحسن نہیں لیکن موجودہ دور میں بھی اگر باہمی روابط ان کے مابین بل کر کام نہ کر سکے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ گردشِ روزگار نے اب تک ہماری آنکھ نہیں کھولی ہے ورنہ شاید ہم ابھی کسی اور بڑے انقلاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ فسوس بہ بہت سے حضرات جو وقت فوقتاً کرم فرماتے رہتے و جوائنٹیشن پر بھی الوداع کہنے کے لئے تشریف لے جاتے ان کے نام محفوظ نہیں رہ سکے۔ تاہم ان کا خلاص رسمی شکریہ سے بالا ہے۔ **فجزاھم اللہ عتی۔**

۲۰ کو محترمہ سعید چوں سلیم کے ہاں کھانا کھاتے ہی ان کے بھائی کی موٹر میں سیدھے اسٹیشن پہنچا۔ اور پے پیچ کی ٹرین سے روانہ ہو گیا۔

سلاطین ہند  
جلد دوم

[illegible]



# اسلام کا نظام امن و امان

(جہاں مولانا محمد ابراہیم صاحب، مفتاحی ارا لائق دارالعلوم دیوبند)

(۳)

قتل و خور ویزی کو بڑے گنہگار سمجھا گیا ہے، وہ اپنی آپ  
مثال ہے، اور اس سلسلہ میں جو شرعی امور جو اسلوب بیان ہو سکتا ہے، وہ سب  
اختیار کیا گیا ہے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

میزال الموت، مقتدا صحت میں  
بہت دھماکا ہے۔  
دھماکا ہے۔  
میزال الموت، مقتدا صحت میں  
بہت دھماکا ہے۔  
دھماکا ہے۔  
میزال الموت، مقتدا صحت میں  
بہت دھماکا ہے۔  
دھماکا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے، ان مہلک امور میں سے جن میں انسان اپنے  
آپ کو ڈال کر بھی نہیں سکتا اور اس کی ہمت ضروری ہے۔ یہ بھی ہے کوئی ناخوش خون  
بہاؤے، اس کی کوئی شریعتی وجہ نہ ہو۔  
اعانت قتل سلو کی ہے۔  
کرتا، ایک طرح سے۔  
جو کر خطا اٹھانے کے لئے دی ہو ہے۔  
کسی عمل سے متعلق جو ضرر ہو۔  
میں اعلیٰ میں سے ہے۔

ملہ بخاری کتاب القیات ج ۲ ص ۱۰۱



کلمۃ جاء یوم اقامۃ مکتوبہا بین  
عندہ آیس من رحمۃ اللہ  
(ابن کثیر ج ۱ ص ۵۰۰ - -)

خواہ وہ ایک کلمہ ہی سے کیوں نہ ہو، تو وہ قیامت  
کے دن اس طرح آئے گا کہ اس کی پیشانی پر  
لکھا ہوگا کہ خدا کی رحمت سے پاؤس۔

انسانی فریضہ | پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر ایک مسلمان کا فریضہ یہ ہے  
کہ قاتل کا ہاتھ تھام لے، اور اس کو اس جرمِ عظیم سے جس طرح بن پڑے روک دے،  
ارشادِ نبویؐ ہے

لا یقف احدکم موقفا نفس  
فیہ رجل ظلمہ فان لم یقف  
علی من حضاہ حاض بہ فحوا  
عنہ ولا یقف احدکم موقفا  
مظور فہرجل ظلمہ فان لم یقف  
عنہ فحوا عنہ (تبع نفوذ حاشیہ ۱)

تم میں سے کوئی ایسی جگہ موجود نہ ہو، جہاں ظلم  
درجہ سے ایک انسان قتل کیا جا رہا ہو، مگر بائیں  
ہمہ وہ اس کی طرف سے مدافعت نہیں کرتا تو وہ  
قابلِ لعنت ہے جس پر لعنت نازل ہوتی رہتی  
ہے۔ اور میں سے کوئی ایسی جگہ موجود نہ ہو، جہاں  
کوئی ایک شخص زبردستی یا جابرانہ طور پر  
بھی وہ اسے نہیں بچاتا اور نہ اس کی حمایت میں  
کرتا ہے تو وہ مستحقِ لعنت ہے کہ اس پر لعنت  
رہتی ہوگی، بس اس کی حالت سے نوگ مدافعت  
نہ کریں۔

جس طرح ایک مسلمان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ کسی فوج کے ساتھ ظلم سے  
روک دے، اور خونِ مومن سے باز رہے، اور اس مقتول کو جان بچانا  
بھی حتی الوسع انسانی فریضہ ہے۔

اشارۃً تنبیہاً | قتل کی ایک شے یہ بھی ہے کہ انسان خود تو اپنا ہاتھ خون آلود نہ کرے، مگر  
اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر کسی دوسرے کو اس سلسلہ میں استعمال کرے، اور



اس کے ذریعہ کسی بے گناہ کا سر قلم کرنے کی ناپاک کوشش کرے، اسلام اس صورت کو کبھی برداشت نہیں کرتا، اور اصل مجرم صاحب اثر و رسوخ ہی کو قرار دیتا ہے، حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قاتل با در امر کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا

قسمت الناس سبعین جزءاً دمر

تسعة وسعون واثنتی عشر

(جمع فوائد ج ۱ ص ۱۰۱)

بستہ حصوں میں بانٹ دی گئی ہے ان میں سے انتہر جتنے اس کے لئے ہوگی جو قتل کا حکم دیتا ہے اور صرف ایک حصہ اس قاتل کے لئے ہوگی جو دوسرے کے کھنہ سے قتل کرتا ہے

اسی طرح حدیث میں ہے کہ نیامرت کے دن تانل و مفتول لائے جائیں گے، پس مقتول کہے گا، اے رب! پوچھئے کہ اس نے مجھے کس تصور پر قتل کیا، قاتل امر کی طرف اشارہ کر کے جواب دے گا، اس نے مجھے حکم کیا تھا چنانچہ ان دونوں قاتل و امر کے ہاتھ پکڑے جائیں گے اور دونوں کو یک ساتھ جہنم میں جھینک دیا جائے گا۔

خودکشی قتل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود اپنے کو مار کر ڈالے، جس کو خودکشی سے تعبیر کرتے ہیں، اس صورت میں بھی چوں کہ انسان جان و اعضاء کرنا ملتا ہے، اس لئے اسلام نے خودکشی کو بھی پوری قوت کے ساتھ دیکھا ہے اور ترمیم کے وہ تمام ذرائع استعمال کئے ہیں، جس سے ڈر کر انسان اس کام سے باز آجائے، بلکہ اس کو ایسے ارادہ کی جڑ تک نہ ہو، خود قرآن میں اعلان ہے

ولا تقتلوا انفسکم (النساء ۵)

آگے اس کی سنرا کا بھی تذکرہ ہے ارشادِ ربانی ہے

ومن یفعل ذلک عداۃ علیّ وعلیہ

فسوف نصیبہ نارا (النساء ۵)

اور جو یہی تعدی اور ظلم سے یہ کام کرے گا، ہم

س کو آگ میں ڈالیں گے۔



لا تفتلوا کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں، مگر ظاہر الفاظ سے خود کشی کی، نفعیت بھی ثابت ہوتی ہے، اور خاکسار نے اسی لئے اس آیت کو یہاں نقل کیا ہے اور حدیثیں تو اس سلسلہ میں کافی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

وَمَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِنَفْسِهَا أَوْ دَارًا  
عَذَابٌ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اسْمُهُ

ایک حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں

مَنْ ذَكَرَ نَفْسَهُ شَوْراً أَوْ كَرْهًا  
فَإِنَّهُ يَمُوتُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

یوم القیامہ روزِ قیامت میں جو شخص اپنے آپ کو یاد کرے گا وہ

خود کشی کی سزا ایک ریش میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کشی کر سہ رالے کا حشر بیان کیا کہ وہ کس طرح کے عذاب میں قیامت کے دن مبتلا ہو گا، خود کشی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے کو کسی زنجیری جگہ سے لگا کر ہلاک کر دے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زہر پی کر اپنے کو موت کے گھاٹ اتار دے، اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ زہر کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی طریقے ہیں، مگر کسی صورت میں سے وہ نیک نہ ہو گا، آیت مذکورہ

مَنْ ذَكَرَ نَفْسَهُ شَوْراً أَوْ كَرْهًا  
فَإِنَّهُ يَمُوتُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

یوم القیامہ روزِ قیامت میں جو شخص اپنے آپ کو یاد کرے گا وہ

خود کشی کی سزا ایک ریش میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کشی کر سہ رالے کا حشر بیان کیا کہ وہ کس طرح کے عذاب میں قیامت کے دن مبتلا ہو گا، خود کشی کا ایک طریقہ یہ

ہے کہ آدمی اپنے کو کسی زنجیری جگہ سے لگا کر ہلاک کر دے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زہر پی کر اپنے کو موت کے گھاٹ اتار دے، اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ زہر کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی طریقے

ہیں، مگر کسی صورت میں سے وہ نیک نہ ہو گا، آیت مذکورہ

مَنْ ذَكَرَ نَفْسَهُ شَوْراً أَوْ كَرْهًا  
فَإِنَّهُ يَمُوتُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

یوم القیامہ روزِ قیامت میں جو شخص اپنے آپ کو یاد کرے گا وہ

خود کشی کی سزا ایک ریش میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کشی کر سہ رالے کا حشر بیان کیا کہ وہ کس طرح کے عذاب میں قیامت کے دن مبتلا ہو گا، خود کشی کا ایک طریقہ یہ

ہے کہ آدمی اپنے کو کسی زنجیری جگہ سے لگا کر ہلاک کر دے، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ زہر پی کر اپنے کو موت کے گھاٹ اتار دے، اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ زہر کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی طریقے



مخلد ایںہا ابدًا زلستہ الاماکا؛ پیٹ میں بھونکتا رہے گا۔

(جمع الفوائد ج ۱ ص ۲۷۵)

اپنا آپ گلا گھوٹنے کے متعلق ارشاد نبوی ہے

اے ای بخت نفس میچ قہ فی لانا بر شخص اپنا آپ گلا گھوٹتا ہے جہنم کی آگ میں

(جمع الفوائد) (اسی طرح) گھوٹتا رہے گا۔

اپنے آپ کو بھالا، نیزہ، اور بندر ق کی گولی مار لینا، اس کے متعلق ارشاد

نبوی ہے

وانذی یطعن نفسه لظہری اور عوا اپنے کو نیزہ، مار مار دیتا ہے وہ جہنم کی

فی الناس۔ للبخاری (ریضہ) آگ میں اپنے آپ کو نیزہ، مار رہا ہے گا۔

قتل کا ارادہ اور حکم قاتل کے جذبہ کی خواہ وہ کسی بھی ناجائز موقع سے ہو، اسلام مذمت

کئے بغیر نہیں رہتا، چنانچہ ایک دفعہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنس دو

مسلمان ہوا رہے اگر باہم مقابلہ کے سے نہیں، اور کو ان بن سدا، جو سدا تو قاتل

مقتول دونوں ہی جہنم میں جا رہے۔ یہ حدیث کا تعلق تو ہے کہ میں نے یہ کہہ سکتا ہوں

کیوں؟ آئیے فرمایا

اب کاب حریص علی قتل صدا۔ رہنے کہ وہ اپنے لئے قتل کا خواہش

(بخاری ج ۱ ص ۷۷) مند تھا۔

مہتمم یا ریگنڈرل اور یہی وجہ ہے کہ قتل تو بہ حال قتل ہے، اسلام یہ بھی پسند نہیں کرتا آدمی کسی

مہیت اختیار کرے جس سے کسی کو زخم پہنچنے کا معمولی اندیشہ ہی ہو، کسی کے قتل میں

کی طرف سے شبہ بھی پیدا ہو، ارشاد نبوی ہے

من حمل سبیلہ اسلحہ فیس جو کہ مسلمانوں پرستیہ رفتہ نہ وہ تم میں سے

متا رواۃ البخاری) نہیں ہے



حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں

المداد من حمل عليهم السلاح  
لقتالهم لمانية من اذخا لرب  
عليهم لا من حمد لجر استهم  
(فتح الباری ج ۲ ص ۱۴۳)

یعنی مراد یہ ہے کہ جو مسلمانوں سے قتال کے لئے ہتھیار  
اٹھائے، اس لئے کہ اس صورت میں ان کو مدعوب  
کرنا ہے، ہاں وہ مطمئن نہیں ہے جو مسلمانوں  
کی حفاظت کے لئے ایسا کرے۔

نگلی تلوار کا حکم ارجمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نگلی تلوار سے کر چلنے کی ممانعت فرمادی تھی،  
کہ مبادا کسی کو دھوکہ سے کوئی خراش آجائے، یا کسی کو قلب کی کمزوری کی وجہ سے نگلی تلوار  
دیکھ کر خطرہ محسوس ہونے لگے۔

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان يتعاطى السيف مسلوا  
رواه الترمذی (مشکوٰۃ کتاب القصاص)  
رسوں کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے روکا کہ نگلی  
تلوار لی۔ دی جائے۔

تلوار اٹھانے کا گناہ قتل و خون کی برائی ذہن نشین کرنے اور دنیا سے فتنہ و فساد کے مٹانے کے  
لئے آپ نے ارشاد فرمایا

لجھنم سبعة ابواب، باب منها  
لمن ملّ السيف على امتي او  
على امة محمد رواه الترمذی  
(مشکوٰۃ کتاب القصاص)  
دوزخ کے سات دروازے ہیں، ان میں سے ایک  
دروازہ اس مجرم کے لئے ہے جو میری امت یا امت  
محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تلوار چلائے،

گویا کوئی ایسا پیرایہ باقی نہ چھوڑا گیا، جس سے امت کا ذہن اس سلسلہ میں راہِ راست  
پر لگ سکتا تھا، مختلف انداز سے کوشش کی گئی ہے کہ انسان قتل اور خون ریزی کے  
نقصان کو سمجھ کر اس سے بے زاری کا اعلان کر دے اور فتنہ و فساد سے ہاتھ اٹھالے، ایک  
موقع سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا



من اشار لی الخیمجدیدۃ  
فان الملائکۃ تلعنہ حتی یضعہا  
وان کان الخکا لا یبید و امہ ذرۃ  
البخاسری (مشکوۃ کتاب قصص)  
جو شخص اپنے سہمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ  
کرتا ہے اس پر فرشتے لعنت کرتے ہیں، تا آنکہ وہ  
اسے رکھ نہ دے، اگرچہ وہ اس کا سکا بھائی ہی  
کیوں نہ ہو۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں  
آجنا قصد وجد کجائش نذر دہلوی  
لعلب خواہد بود، با وجود آن متوجہ می  
شود لعنت نبوی  
نبی (اشدہ العتات ج ۳ ص ۲۵۲)

اس حدیث میں اشارہ سے مراد ہنسی مذاق کے طور  
پر ہے، کیوں کہ قصد دارادہ کے معنی نئے جانے کی  
گنجائش نہیں ہے اور بائیں ہمد بھر بھی لعنت کا متوجہ  
ہونا قابل عبرت ہے۔ گویا اس سے شدت کے  
ساتھ روکنا ہے

پیرایہ بیان ہر موقت سے یہ اندیشہ رکھ گیا ہے کہ انسانی ذہن میں انسانی خون، اور امن و  
امان کی تدریقیت مضبوطی سے جمے رہے، اور پھر اس کو اس سلسلہ میں مزید سوال کی ضرورت  
باقی نہ رہے۔

اسلام کے سوا یہ اہتمام انسانی امن، ان کا کہاں مل سکتا ہے؟ اور ہمارے اس موجودہ دور میں ایسے امن و امان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا ہے، اور کیسے ہو سکتا ہے جب کہ جانوروں  
کی قدر و قیمت انسان کے مقابلہ میں مذہبی پنج ستہ زیادہ ہو، یہ تو اسلام ہی کو فخر ہے کہ اس نے  
پوری قوت سے انسانی احترام کی برتری کا اعتراف کیا، اور برتری مخلوقات کو اس کا تابع اور  
خدمت گزار قرار دیا۔

ہتھیار کو تھپاکر رکھنا یہی ہے، کھلے ہتھیار سے اشارہ کرنے کو کیوں روکا گیا؟ خود حدیث ہی میں اس  
کی وجہ یہی بیان کی گئی ہے کہ رستہ ہم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں کوئی اپنے بھائی کی طرف  
ہتھیار سے اشارہ نہ کرے۔



فانہ لایدرسی لعل الشیطان یزیرع  
فی یدہ لا یقع فی محضر لامنت النار  
(مشفق علیہ ایما)

کیوں کہ اسے خبر نہیں کہ شاید شیطان دوسو ڈال  
دے اور ہاتھ غلطی پر آمادہ ہو جائے اور اس طرح  
وہ جہنم کے غار میں جا پڑے :

اسلام نے یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ دوسرا تیز متعیا رکس طرح لے کر چلنا چاہیے اس  
سلسلہ میں تاکید ہے کہ طرفہ ایسا ہو کہ جس سے نہ کسی کو ضرر پہنچے کہ اندیشہ رہے اور نہ کسی کے  
قلب میں کوئی خطر پیدا ہو سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اذا امر لحدکم فی مسجدنا و فی  
سوقنا و معہ نبل فلیمسک علی نصھا  
ان یصیب احد امرئ مسلمین  
منہم استوفی مہلتہا و یمن

تم میں سے جب کوئی مسجد یا بازار سے گزرے اور  
اس کے ساتھ میں تیر ہو، تو اسے چاہیے کہ اس  
کی پہلی کو تمام لے، تاکہ دھوکہ سے بھی کسی مسلمان  
کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر بازار یا مسجد میں  
مرد خواہ وہ زندقہ یا کافر ہو، اسے نہ مارنا چاہیے نہ شیخ عبد اللہ  
حدیث دہلوی نے لکھا ہے

وہ سائر مجامع در علم آسمت (استغفار اللہ)

خون میں مساوات پھر یہ کہ انسانی جانوں کا یا حرام ایسا ہے، جس میں آزاد و غلام، امیر و غریب  
سلطان و گدا کسی کی کوئی تمیز نہیں، سب کے لئے حکم برابر ہے۔ اور سب کی جان لائقِ حد  
احترام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مسلمون متکانفوا ما عہد

مسلمانوں کے خون برابر ہیں

مشکوۃ کتاب القصاص

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس حدیث کے فہن میں رقمطراز ہیں

گفت آن حضرت مسلمان برابر است

آن حضرت صلعم نے فرمایا کہ مسلمانوں کے خون

مسئلہ قصاص و دیت میں برابر ہیں، اس باب

میں نہ شریف کو کفینہ پر فضیلت ہے، نہ بڑے

کو چھوٹے پر، نہ عالم کو جاہل پر، اور نہ مرد کو عورت

پر، جیسا کہ جاہلیت میں تھا، اسلام اس کے

برعکس مساوی درجہ کرتا ہے

جو تھا ایشان در قصاص و دیت فاعل

نیست در آن شریف را بر وضع و کبیر را بر

صغیر، و عالم را بر جاہل و مرد را بر زن بر

قتل و عادت جاہلیت را منقہ الہیۃ (۳)

غلام کے خون کا احترام | چنانچہ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ رسولؐ ثقلین علی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جو شخص اپنے غلام کو قتل کرے گا، ہم اسے قتل

کر دیں گے جو اپنے غلام کی صورت بگاڑے گا ہم

اس کی صورت بگاڑیں گے۔

من قتل عبدہ قتلہ و من جلد

عبدہ جلد عنہ رواہ الترمذی

(مشکوٰۃ کتاب قصاص)

اس پر اعلیٰ درجہ کی سزا یعنی قتل و عادت بھی پائز نہیں ہے جس کی تفصیل قصاص کی بحث میں آئے گی، اس سے متعلق سنو حدیث میں سے فرمایا

پہلے وہ قتل کرے پھر عادت

کرے تو جس نے قتل کیا ہے وہ قصاص میں قتل

کیا پائے گا اور جس نے پکڑا ہے اسے قید کیا جائے گا۔

و من قتل عبدہ قتلہ و من جلد

عبدہ جلد عنہ رواہ الترمذی

ایضا

مسند شیخ محدث اہلوی لکھتے ہیں

یہ بات غنی نہ رہے کہ مقتول کے بھائی قاتل کی اعانت

ہے اور قتل میں عادت ایسا جرم ہے کہ دوسری

جہتوں میں یہ ہے کہ اس پر دیا جس سے لیکن عذر

اباوسیدہ ریانہ میں اعانت مسند زور

اعانت پر قتل سمجھنا حدیث بخاری میں

اس سے متعلق آئندہ احادیث میں

بائیں درجہ مسند زور

اس زمانہ میں کبھی خشت باری سے بھی ہوتا ہے کہ دھوکہ سے کہیں کسی کو چوڑا  
آگئی، تو پھر وہی بڑھ کر جنگ کا سلسلہ بھر کا سکتی ہے اور ان میں انسانوں کا سارا



اطمینان و سکون اس کی نذر ہو سکتا ہے ، حفظ و تقدم کے طور پر اسلام نے اس طرح کی چیزوں سے بھی منع کیا ہے ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ خشت باری نہ کیا کرے چنانچہ عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ انہوں نے کسی کو ڈھیلہ بازی کرتے ہوئے دیکھا تو اس سے کہا ایسا نہ کرو کیوں کہ

فاتر من سوان اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سنگ باری سے  
وسم نہی عن الخذف و التالیہ منع فرمایا ہے اور آپ کا ارشاد ہے کہ اس سے  
لا یصاد بہ حیدر ولا ینکا عذو نہ کوئی شکار تھکا کر کیا جاسکتا ہے اور نہ اس سے  
ولکنہ قد تکسر السن و تلف العین دشمن کو قتل کیا جاسکتا ہے ، ہاں یہ البتہ ہوتا ہے  
متفق علیہ ( یضاً ) کہ کبھی اس سے دانت ٹوٹتے ہیں اور کبھی آنکھیں پھٹتی ہیں

امن امان کی ناکہ ان تمام گوشوں پر اسلام کی نظر ہے ۔ جہاں سے امن و امان میں خلل کا اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے ۔ محبت کی بناء پر دوست و دشمن پر کتنی ہے ۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی کے آخری ایام میں امت کو تاکید فرمائی تھی کہ وہ امن و محبت کی جگہ قتل و خون ریزی کے بندہ کو نہ آمنے دیں ۔

لا ترجعوا بعدی کفاراً عنی و بعضکم مرے بعد کا فزوں کا ساتھ نہ اختیار کر لینا ، کہ تم  
اذا بعض ( بخاری ) میں سے بعض بعض کی گردن مارنے لگے ۔

جس درد کے ساتھ یہ فرمایا تھا اس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے ، کہ اہل بیت نبوی سے پہلے کی تاریخ سامنے ہو ، اور پھر آپ کی جد و جہد کا منظر آنکھوں میں پھر رہا ہو ۔  
حجۃ الوداع میں پیام نبوی | جس انداز میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امن و امان کی تبلیغ کی ، قتل و خون ریزی کے دروازہ کو بند کیا ، اور کائنات انسانی میں انسانی جان کی قدر و قیمت بتائی اس کا اجمالی نقشہ آپ کے سامنے آگیا ، خیر میں وہ حدیث بھی سن لیجئے جس کا تعلق حجۃ الوداع کے خطبہ سے ہے ، جہاں تک قریب انسان موجود تھے ، آپ نے ارشاد فرمایا ۔

فان الله تعالى قد حرم عليكم دماءكم  
واموالكم واعراضكم الا بجهنم كعنة  
يومكم هذا في بدركم هذا في شهركم  
هذا (بخاری باب ظہر المؤمن حی) شہر اور اس مہینہ میں، مگر یہ کہ حق کے لئے ہوں۔

اس کی اہمیت جتانے کے لئے پھر اخیر میں انسانوں کے سیلاب کو مخاطب کر کے فرمایا  
الاہل بلغت ثلاثا کل ذلک  
یحییوہ الا نعم (ریض) کیا میں نے پیغام حق پہنچا نہیں دیا؟ اے تین مرتبہ  
ذمایا، سمجھوں نے سیکر، ان جواب دیا، حی ہاں ضرور

کوئی معاشرہ اس سے زیادہ انسان کی تدریج و تربیت ازر کیا جتا سکتا ہے، جو  
کچھ عرض کیا گیا اسے بار بار دہرائے، ورسوچئے کیا کوئی گوشہ انہام و تنہیم کا اپنے اٹھارکھا،  
جس مومن کی ان تمام احادیث پر نظر ہوگی، غرض ممکن ہے کہ وہ انسانی جان کا جیسا احترام چاہئے  
اس میں کوئی کسر اٹھا رکھے۔

خون کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں زندگی ہے، انسان کی خون کی قیمت عام ہے۔ اس حدیث سے  
لگائیے، بس میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ وہ ترک کیا کرتے تھے۔

اول ما یقضی یوم القیامہ فی الدما  
(بخاری کتاب البیوت ج ۲ ص ۱۸۱)  
قیامت میں جس دم کا یہ فیصلہ ہو جائے گا، وہ  
خون کا پس ہوگا۔

امام نووی لکھتے ہیں

فیہ تغلیظ اہل الدماء شرح مسلم

(ج ۲ ص ۱۸۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں

ای اول القضاء یوم القیامۃ اخصا  
فی الدماء ای فی اہل متعلق۔ دم  
یہی ثابت ہے۔ فیصلہ خون کا فیصلہ ہوگا یعنی  
خون سے متعلق منکرات کے فیصلے ہوں گے۔



وفیہ عظم امر القتل لان اربداء  
اس حدیث میں مسد قتل کی اہمیت ہے کہ بتدکام  
انما یقع بالادھم (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۶۹) میں اہم معاملہ سے ہوتی ہے۔

عبادات اور انفرادی چیز میں نماز سے متعلق سوال ہوگا، دراجتماعی اور حقوق العباد  
امور میں سب سے پہلے اہمیت کے پیش نظر خون کا مقدمہ سامنے آئے گا، کیوں کہ بندوں پر  
مظالم کے سلسلہ میں سب سے بڑا ظلم یہی ہے۔

### ابن العربی فرماتے ہیں

ثبت الیہی عن قتل الیہی مہر  
حق و ابو عبد شاذان قبیف  
القتل ارادھی تکلیف المسلم تکلیف  
بالتقی الصالح (فتح الباری ج ۱۲ ص ۱۶۹)  
جب حق جو راہوں کے قتل کی بھی ممانعت ثابت  
ہے اور اس سلسلہ میں دعوں میں بھی پھر قتل  
الان کی کتنی اہمیت ہوگی اور اس سے بڑھ کر  
مسوں کی اور اس سے بڑھ کر خدا ترس اور سیکڑ کی  
اسلام سب سے پہلے دل پر قبضہ کرتا ہے اور ہر چیز کی اہمیت سب سے پہلے دل ہی میں  
جاگزیں کرنے کی غی کرنا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں اس نے پہلے اپنا سارا زور اسی پر صرف  
کیا ہے کہ انسان کے رگ و پھل میں یہ بات چھوہرت ہو جائے کہ انسان جان کی بڑی  
قیمت سے اور اس کی غارت ہر شخص کا دینی حقوق اور انسانی فریضہ ہے۔

دین قیم کے یہ وہ رری اصول ہیں جن کے قتل میں راسخ ہو جانے لے بعد ساری  
عدالتوں کے باوجود مسلمان ایک لمحہ کے لئے قتل، حق کے سلسلہ میں تذبذب میں مبتلا نہیں  
ہوتا ہے بلکہ اس خیال کے آتے ہی اس کی زبان پر لاجول ولا قوۃ الا بالشرکاء جملاتا ہے، اور  
بے زاری کا اعلان کر کے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

قاتل کی سزا اسلام میں مگر یا اس ہمارے انسان ہے، فرشتہ نہیں ہے، کبھی وہ ان تمام  
خائن کے باوجود شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور جو نہ کرنا چاہیے وہ کر گزرتا  
ہے، مختلف محرکات ہیں جو عقوڑی دیر کے لئے اس کی عقل پر پردہ ڈالتے ہیں، اور دین قیم

کے رشتہ کے باوجود وہ اپنے آپ کو تاریکی میں محسوس کرتا ہے ، اور پھر وہ ناجائز قتل و خون ریزی پر اتر آتا ہے اسلام نے انسان کی ان نفسیاتی بیماریوں کے پیش نظر شہری قانون نافذ کیا ہے کہ اگر وہ خدا نخواستہ اپنے مقتول کو خون آلود کرے تو اس کی ایسی سزا ہونی چاہیے ، جو آئندہ دوسروں کے لئے عبرتناک ہو۔

قصاص وراس کی نوعیت اسلام نے ایسے موقع کے لئے ”قصاص“ کا حکم نافذ کیا ہے ، ارشادِ ربانی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سَبَّ عَلَيْنَكُمْ  
الْقَتْلُ فِي الْقَتْلِ كَالْحَرْبِ  
وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأَنْثَى بِالْأُنْثَى

مسلمانو! مقتولوں کا قصاص (خون کا عوض)  
تم پر ظمن کیا گیا ہے ، آزاد بدلے آزاد کے ، اور  
غلام بدلے غلام کے ، اور عورت بدلے عورت کے

(بقرہ ۲۲)

حضرت تھانویؒ کا تفسیری ترجمہ ملاحظہ فرمائیے ، لکھتے ہیں

”اے ایمان والو! تم پر قانون قصاص ظمن کیا جاتا ہے ، مقتولین بقتلِ عمد کے بارے میں  
یعنی ہر آزاد آدمی قتل کا جائزے ، دوسرے آزاد آدمی کے عوض میں ، اور اسی طرح ہر غلام  
دوسرے غلام کے عوض میں ، اور اسی طرح ہر عورت دوسری عورت کے عوض میں ، گویا  
قاتلین بڑے درجہ کے درمقدومین جیسے درجہ کے ہوں ، جب بھی سب کو برابر سمجھا کہ قصاص  
لیا جائے گا ، یعنی قاتل کو سزا میں قتل کیا جائے گا“

قصاص میں عدل و مساویت ہے جس میں بوجہ قصاص لکھتے ہیں

۱۔ ہر آدمی برابر ہے ہر قتل احقر  
۲۔ ہر آدمی برابر ہے ہر قتل احقر  
۳۔ ہر آدمی برابر ہے ہر قتل احقر

۱۔ ہر آدمی برابر ہے ہر قتل احقر  
۲۔ ہر آدمی برابر ہے ہر قتل احقر  
۳۔ ہر آدمی برابر ہے ہر قتل احقر

لے میں قتل کا



الخطاب ايجاب عموم القصاص کیا ہے کہ خطاب کے ابتدائی حصہ کا اقتضا تمام مقتولین  
فی سائر القتلی (احکام القرآن ج ۱) ۱۲۵ میں قصاص کا وجوب سمجھ میں آتا ہے۔

قصاص میں عدل و مساوات کی صراحت اس آیت قرآنی میں موجود ہے ارشادِ باری  
تعالیٰ ہے :-

وَكُتِبَ عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنْ يَنْقُسَ  
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنِ بِالْعَيْنِ  
وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ  
بِالْأُذُنِ ، وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ،  
وَالْجُرُوحَ قِصَاصًا (المائدہ ۴۵)  
اور ہم نے اس میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلہ جان  
اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک  
اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے  
دانت، اور سب زخموں کا بدلہ برابر۔

حضرت مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں

”النفس بالنفس میں آزاد اور غلام، اور مسلمان اور کافر ذمی، اور مرد اور عورت اور کبیر  
اور صغیر اور شریف اور رذیل اور بادشاہ اور رعیت سب داخل ہیں“ (بیان القرآن ج ۳ ص ۳۱۷)  
قصاص عہد نبویؐ میں حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک مسلمان عورت کو ایک یہودی نے مار ڈالا،  
اس کے عوض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس یہودی کو بھی قصاص میں قتل کر ڈالا۔  
(بخاری باب قتل الرجل بالمرأة)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ خدمت نبویؐ میں ایک مسلمان پیش کیا گیا، جس نے  
ایک ذمی کافر کو قتل کر دیا تھا چنانچہ آپؐ نے حکم فرمایا اور اس قاتل مسلمان کو قتل کیا گیا  
(شرح معانی الآثار ج ۲ ص ۱۱۱)

قصاص میں یہ شرط نہیں ہے کہ مقتول کمال ذات و صفات میں قاتل کے بالکل  
برابر ہو چنانچہ اعضاء کا صحیح و سالم اس شخص کے قصاص میں قتل کیا جائے گا جس کے اعضاء  
کٹے ہوئے ہوں، یا جس کے اعضاء شل ہوں، اسی طرح عالم، جاہل کے بدلے ذلیل

کمینہ کے بدلے قاتل، مجنون کے بدلے تندرست بیمار کے بدلے اور بالغ، بچے کے بدلے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

اگر ان مذکورہ اوصاف کا لحاظ کیا جائے، تو قصاص کا قانون ہی ناقد العمل باقی درجے اسی درجہ سے جان کے معاملہ میں ان اوصاف و کمالات کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے بلکہ جان اور اس کی قیمت کا لحاظ قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔

قصاص کا فائدہ | اسلام نے یہ قانون اس لئے بنایا ہے کہ قتل کا مجرم اپنے جرم کی پاداش پالے اور پھر اس سے ہمیشہ کے لئے باز آجائے اور ساتھ ہی دوسرے اس سزا کو دیکھ کر عبرت و بصیرت حاصل کریں اور ظلم و زیادتی کی ان میں جرأت پیدا نہ ہو سکے، دوسری طرف اس کا فائدہ پہنچے کہ مقتولین کے ورثاء، ور حامیوں کا غیظ و غضب ٹھنڈا پڑ جائے اور ان میں ردِ عمل و انتقام کا جوش موجزن ہو کر امن و امان کے خرم کو خاکستر نہ بنائے پائے، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قصاص کو حیات سے تعبیر کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے۔

وَلِكُمُ فِي الْقَتْلِ حَيَاةٌ يَا أُولِي  
الْأَلْبَابِ (بقرہ - ۲۲)

تو تم میں حکمت کا لحاظ بن کر کثرتِ حکمت میں

وَفِي شَرِّهِ الْقَتْلِ لَكُمُ دَهْرٌ  
قَتْلُ الْقَاتِلِ حِكْمَةٌ عَظِيمَةٌ وَهُوَ بَقَاءُ  
الْمُهْجِمِ وَصَوْنُهَا لَا نَهْ إِذَا عِلِمَ الْقَاتِلُ  
أَنَّهُ يُقْتَلُ أَنْكَفَ مِنْ صَنِيعِهِ  
فَكَانَ فِي ذَلِكَ حَيَاةٌ أَنْفُوسٍ  
(تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۲۳۷)

قصاص کی مسروریت میں عظیم الشان حکمت ہے  
اور وہ یہ کہ جان کی حفاظت اور اس کی بقا ہے اس  
وجہ سے کہ جب قاتل کو یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ بھی  
قصاص میں قتل کیا جائے گا تو وہ اپنے جرم سے  
رک جائے گا۔ اور اس طرح یہ چیز لوگوں کے لئے  
باعثِ حیات بن جائے گی۔



## ابوالعالیہ کا بیان ہے

جعل الله القصاص حبة قلم

من يعل ويريد ان يقتل فتحمه

مخافة ان يقتل (اصناف)

اللہ تعالیٰ نے قصاص میں زندگی رکھی ہے اس

سے کہ کہتے ہیں ہو قتل کا ارادہ کر لے میں نگریہ

خوف نہ کو روک دیتا ہے کہ یہ تم بھی بدلے

میں قتل کئے جاؤ گے۔

بھی ہندو پاک میں رد عمل کے نام پر جس طرح نہ کھوں ہندو مسلم ناک و خوں میں تڑپے، وہ

نتیجہ تھا، مذہبی جذبہ انتقام کا، اگر دونوں حکومتیں قائمیں کو واجب سزا نہیں دیتیں تو یہ تعداد سیکڑوں

سے آگے نہ بڑھتی، اس لئے کہ یہ دیکھ کر نسکین ہوتی کہ حکومت تانوں کو ان کے جرم کی سزا خود

دے رہی ہے، دوسری طرف تانوں کی حوصلہ افزائی بھی نہ ہوتی، درپہرن کی سمیتیں فیرا ٹوٹ جاتی

ورثائے مقتولین کو ہدایت اسلام سے پہلے جیسا پہلے ان رہ کر آیا ہوں، انتقام کے نام پر خوں بڑی

کا بازار گرم رہا کرتا تھا، اسلام نے قصاص کا عدل پرور قانون، تذکر کے اس مرض کا خاتمہ کر دیا،

قرآن نے جہاں جہاں قصاص کا قانون بیان کیا ہے وہاں پوری فوج سے ورثاء مقتولین کو زیادتی

سے منع بھی کیا ہے، چنانچہ پہلی آیت سورۃ الحجۃ ۱۷۰ ص کے آخر میں یہ بھی اعلان فرمایا گیا،

فمن اعتدى بعد ذلک دبراً علیکم

قرۃ ۳۰

مشکین سے قتال کا جہاں نہ کرے گی یہاں تک کہ جہاں نہ ہوئے پائے،

بس برابر سزا پر ہو۔

الشہر الحرام یا لشہر الحرام

قصاص فمعت اعتدی علیکم

عیسائے منسل یا اعتدی علیکم

اللہ واحموا ان الله یستغفر

حرم الحرام یا لشہر الحرام

قصاص فمعت اعتدی علیکم

عیسائے منسل یا اعتدی علیکم

اللہ واحموا ان الله یستغفر

اللہ واحموا ان الله یستغفر

قرۃ ۳۰

صاحب تفسیر المیزان لکھتے ہیں

وهذا الشروط والاداء

التي لا يفسد من اثار

قل تعالیٰ بعد شرح الفصص

والله اعلم بالله عن تقديره

عی احد ولا تغوا ولا مضمو

فی الفصص من تنزیل فی

الايداع (ج ۲ ص ۲۳)

یہ آداب و شروط اسلام کے سوا اور کہیں نہیں

دئے جانے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قصاص

و ممانعت کا حکم بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ

مذہب سے ڈرو، کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو اسی طرح

قصاص میں ظلم و جور پر نہ آؤ، کہ تم اذیت کو شہی

میں نمبر ۷ سے جاؤ۔

مسد قصاص میں غلط فہمی | اسلام نے قصاص میں جس عدل و مساوات کا ثبوت دیا، یہ پس اسی کا  
اور اس کا ازالہ | حصہ ہے درجن آداب و شرائط کا بخاطر رکھا ہے، یہ اسی کے مآل ہے،  
کہیں ڈھونڈے نہ جا بہت نہیں مل سکتی ہے، مگر بایں ہمہ کچھ لوگ اپنی کم ہی سے اسلام کے  
اس قانون پر مذا آتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ قتل کی جان لینا بہت بڑا ظلم ہے، ان کا منہ یہ  
ہے کہ قتل کے بجائے اسے جیل کی سزا دی جائے۔ سچے ہیں کہ اس طرح ملک کی ایک جان  
سزا یا کر پھر کارآمد ہو سکتی ہے۔

لیکن جن لوگوں کو جو عقیقہ نظام کا بخر ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ملک سے فتنہ و فساد  
زیریں و خون ریزی کا بند کسا جائے، اگر عذر دہی ہے تو اس کی صورت اس عدل و مساوات والے  
نص میں سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتی، دعوت افراد گریں پس قتل کے بدلہ قتل نہیں ہے جیل  
ہے تو دنیا جانتی ہے کہ وہ جرم و رنج و مرگ سے نہ بچ سکتے ہیں۔ درخت سے پھر میں چلو  
فلان کو مار ڈالو، جیل میں جا رہی کھانا ملے گا، سونے کا وقت بھی ہے گا۔ درکم و دین کچھ  
وں بعد یہاں سیاسی آرام و امن بھی محسوس ہونے لگے گا۔

پھر دھرم مقدس کے حامی۔۔۔ عرصہ کی بھی نہیں سے ہیں۔ چاہتے رہا بھی دوسری طرف



سے موقع پا کر قتل و خون ریزی شروع کر دیں گے، اور کوشش کریں گے کہ بدلہ سودر سود و سودی ہو اُس طرح ملک کا امن و امان جاتا رہے گا، ہم نے اپنے ملک میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آزادی کے بعد قتل و خون ریزی میں کئی گونا گونا اضافہ ہو گیا، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے، کہ بدبختوں نے سمجھ لیا کہ بدلہ میں قتل ہونا تو نہیں ہے، مذہب کے نام پر ہمارے ساتھ رعایت ہوگی۔

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

کا

## اسلامی قانون نمبر

پاکستان  
میں  
اسلامی  
فکر و نظر  
کے  
مشہور  
علمبردار

دستور اسلامی کے موضوع پر ماضی و حال کی اشرافیہ میل ایک یگانہ و منفرد  
اور بفضلِ خدا کامیاب کوشش

اس نمبر میں پہلی مرتبہ

ہندوستان کے ساتھ ساتھ تمام عالم اسلام کے مشاہیر علماء و متقنین اسلام کے ثمراتِ فکر و تحقیق پیش  
کئے جا رہے ہیں۔

اسلامی قانون کے ضوابط کی جدید ماحول میں ضرورتاً اُن کے عرقِ نفاذ پر خیال افروز بحث و بصیرت افروز  
رہنمائی پیش کی گئی ہے۔

جدید پیرایہ اخبار میں اسلامی ضوابط و تعزیرات و قواعدِ حکمرانی کی تشریح، نیز اُن میں مضمر عظیم فوائد و منافع کی وضاحت کی گئی ہے  
چراغِ راہ اپنی بلند پایہ اور دلنشین و دلچسپ نگارش کی وجہ سے ایک عام صحافتی نمبر کی بجائے

انشاء اللہ۔ ایک نہایت مستند علمی دستاویز  
اسلامی قانون۔ ایک عظیم و مستقل کتاب۔ ایک برداشت و تحقیق کا دلچسپ و دلکش نمونہ۔

نمبر اور۔ ایک تاریخی پیش کش۔ ثابت ہوگا  
یہ نمبر عصرِ حاضر کی واحد دستوری اسلامی ریاست یعنی مملکتِ پاکستان کے نئے آئین  
و معاشرتی تقاضوں کے پیش نظر جون میں شائع کیا جا چکا ہے

ماہنامہ۔ چراغِ راہ۔ کراچی نمبر۔ قیمت ۱/۴ روپے

سائز بڑا  
صفحات ۲۵۰  
کتابت، اعلیٰ  
طباعت، نفیس  
قیمت ۱/۴ روپے

# جدید عربی شاعری کے علم بردار

از

(جناب مولوی رشید احمد صاحب ارشد ایم اے استاذ ادبیات عربی کراچی یونیورسٹی)

(۲)

حافظ ابراہیم | حافظ ابراہیم شاعر میں پیدا ہوئے۔ ان کا ابتدائی زمانہ بہت تنگی اور عسرت میں گذریا۔ اس سے ان کے ابتدائی کلام میں شکایتِ زمانہ اور اہل وطن کی ناقدری کا شکوہ ہے۔ اس غریبانہ ماحول اور فوج کی ابتدائی ملازمت کی وجہ سے ان کا تعلق عوام سے گہرا رہا۔ وہ عوام کے دکھ درد میں شریک رہے، وہ ان کے جذبات و احساسات سے اچھی طرح واقف تھے کیونکہ وہ خود بھی عرصہ دراز تک انہی کے ایک فرد تھے اسی وجہ سے انھوں نے مصر کے عوم کی ترجمانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ فوجی ملازمت چھوڑ دینے کے بعد ان کا تعلق مصر کے حریت پسند قومی لیڈروں سے رہا۔ وہ قلم ہو گیا جو جمال الدین افغانی کے تربیت یافتہ تھے اس وجہ سے ان کی شاعری عوام اور قوم کے لئے وقف ہو گئی انھوں نے قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی شاعری کے ذریعے مصر کے فوجوانوں میں سیاسی معاشرتی اور علمی بیداری پیدا کی۔ ان کا دیوان مصر کی قومی تحریکات اور اہم واقعات کی منظوم تاریخ ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ادبی محسوس اور شاعرانہ جذبات سے خالی نہیں ہے۔ ہمارے اردو شعرا و قبال، نثر نویس غلام احمد علی جوہر کی طرح ان کی پرجوش قومی نظموں نے تحریک آزادی کو کامیاب بنایا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مولانا خاں کی نظموں کی طرح ان کی قومی اور معاشرتی نظموں نے بھی مسند و شام کے لوگوں کو نئے سماجی اور اخلاقی عیوب سے آگاہ کیا انھوں نے خواتین کی حالت کو بہتر بنانے اور انھیں معتدل طریقے سے تعلیم دلانے کی ندرت کی۔

حافظ ابراہیم نے حضرت عمر فاروق کے سیرت و کردار پر ایک بہت بڑی نظم لکھ کر عربی ادب میں بلند پایہ شاعر اسلمی نظموں کی کئی کوپوریاں۔ اس طرح قدیم عربی شاعری میں حیرت



پسندانہ، قومی و سماجی نیز خالص اسلامی نظموں کی جو کمی تھی، اس کی بڑی حد تک تلافی کر دی۔

حافظ ابراہیم اپنے الفاظ، طرز بیان اور موضوع کے لحاظ سے سامی اُبّار و ودی کے صحیح جانشین تھے انھوں نے جدید خیالات کو قدیم فصیح عربی زبان میں پیش کیا، اور علمِ عروض کے اوزان کی پوری پابندی کی۔ ان کے اشعار جدید گونا گوں خیالات کے باوجود ان کی قدردانی کلامی کا ثبوت دیتے ہیں اور سہل ممتنع کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ ان کی سیدھی سادھی زبان اور خیالات کو معمولی پڑھا لکھا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ کبھی قسم کی پیچیدگی اور اشکال نہ الفاظ میں ہے اور نہ معانی میں۔ ان کی یہ خصوصیت بھی انھیں بہ دل عزیز اور رشاد عرواحہ "بنائے میں کامیاب ثابت ہوئی اور وہ شاعرِ انیل کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

حافظ کے ابتدائی کلام میں تنقیدی اور قیمرنگ جھلکتا بن قدیم انداز کے مطابق انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز بڑے لوگوں اور بادشاہوں کی قصیدہ خوانی سے کیا۔ چنانچہ شروعات کے کلام میں خلیفہ مصر عباس اور ترکی خلیفہ سلطان عبدالعزیز کی تعریف، منگہ و کشوریہ کا مہر، پید و رُہ ہفتم کی تاج پوشی پر مبارکباد اور لارڈ کرومر منسہ کے ہائی کمانڈر پر الوداعی قصیدہ بھی شامل تھا۔ مگر تب مفتی محمد عبیدہ و مسطقی کمال کی جماعت سے ان کا تعلق پیدا ہوا تو انھوں نے تحریک آزادی میں روشور سے حصہ لینا شروع کیا۔ بہر حال وہ اپنے اور قوم کے سنج و غم اور جذبات کے اظہار اور ان کے عیوب کی سخت تنبیہ کرنے میں مفرد ہیں۔ اس معاشے میں ان کا کوئی ہم عصر شاعر مقابلہ نہیں کر سکتا۔

حافظ ابراہیم نے نہ کوئی نہیں کی کیونکہ انہیں قوم کے عشق و محبت کے سوا اور کسی سے عشق نہیں ہوا اسی طرے کے کلام میں منازقہ رست اور قاسم نے گہرے غلوں کی کمی ہے بلکہ ان کی شاعری "روحانیت" سے بھی خالی ہے مگر انھوں نے مصر اور سرزمینِ شہ فی کے تمام بڑے لوگوں کے نمایاں عمدہ مہرے کیے ہیں ان میں سی سی ایڈر، علی، شعراء اور مصنف

لغات کی دہائی ہدایات۔







دوش بدوش فخر کے ساتھ انھیں پیش کیا جاسکتا ہے۔ مخالفین کی سخت تنقیدوں کے باوجود ان کی شاعرانہ کمالات لافانی ہیں اور جدید ادب کے رہنماؤں کی حیثیت سے انھیں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

شوقی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ اصل ذوق اسے متنبی اور معری کے بعد عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر متنبی، جس کا یہ طلب ہے کہ تقریباً ایک ہزار برس کے درمیانی عرصے میں اتنا بڑا شاعر پیدا ہو، حافظ کے برخلاف وہ امیر اندھوں میں پروان چڑھا وہ عرب، ترک، یونانی اور چرکی انسانوں سے بے ملامت کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی پروردہ طبیعت ان تمام فنون کی بہترین خصوصیات سے متصف رہی۔ عربی شاعری میں تنوع پیدا کر کے، وجود اس نے عربی زبان کے قدیم اوزان اور جوہر و قوافی کی پابندی روا رکھی اور طویل، بڑوں میں نظمیں لکھیں، ان نظموں میں اس نے قوافی میں بھی کوئی زبرد تنوع یا تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اس نے کئی طویل اور مختصر نظمیں لکھ کر عربی شاعری میں جدید باب کا انشاؤں کی جن میں دول العرب، وادی النيل کی نظمیں قابل ذکر ہیں میں اس نے نہایت قادر الکلامی کے ساتھ اسدائی اور قریہ منہدی تاریخ کے اہم واقعات کو نظم کیا ہے۔ "عظمیٰ رائے" کے زمانے میں اس نے ایک طویل نظم لکھی تھی جس میں اکابر اسلام کے کارناموں کو قہقہہ کیا ہے۔ چوں کہ اس نے نہایت عمدہ نظمیں اور گیت تحریر کئے ہیں۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عربی شاعری میں منظوم ڈراموں کی کمی کو پورا کیا اور مندرجہ ذیل عمدہ منظوم ڈرامے تحریر کیے جو اس کا رفیق "رنامہ" ہیں۔

”مجنوں کی“ ”عنت“ ”نیکبخت“ ”نہر“ ”ست“ ”دری“ ”منہدی“ ”قوسپرا“

وہ عربی زبان میں چند منظوم ڈرامے تحریر کر چکے ہیں جن میں نے ان کے حالات و سابقہ قہقہے

سلف تاریخ ادب عربی مزینات ص ۱۲۰ و ۱۲۱





اب وہ نگریزوں اور شاہیوں کا مقرب شاعر تھا۔ اسے قوم کے سب سے زندگی گزارنی تھی۔ لہذا اس نے دل و دماغ کی بہترین صلاحیتیں اپنی شاعری کے لئے وقف کر دیں اور عوام سے بہت گہرے تعلقات قائم کر لئے۔ اس طرح وہ مصری عوام اور مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی بھی کرنے لگا۔ اور تمام اصناف شاعری کا بڑا ہر گز۔

شوقی حافظ ابراہیم کے برخلاف منظر قدرت کی نظموں تغزل و رعنائیں نظموں میں بھی تالیف شاعر تھا اس طرح وہ عربی زبان کی تمام اصناف میں کا جادو اور شاعر تھا۔ تیشیں گاری کی نئی صنف کا وہ بانی ہے جس کی بیشتر نظموں میں روحانی عنصر گہرا ہے اور فلسفیانہ انداز پایا جاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ہمارے خیال میں شوقی کا مجموعہ بہت ہی بہت بلند ہے۔ کیونکہ وہ مشرقی و مغربی ادب دونوں سے واقف رہا۔ اس نے دینی بہت بھی سونے تھی۔ اس لئے اس کی شاعری ہر قسم کے شاعرانہ صنفوں سے مستفاد ہے۔ سنہ نقادوں کی یہ رائے ہے کہ ان فنکارانہ خوبیوں کوئی ترقی نہ ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی شاعری میں شوقی سے بڑے بڑے شاعرانہ عناصر بھی نظر آتے ہیں۔ شوقی کی شاعری کا بانی و روح ہے کہ وہ نے ہر صنف میں بہت ہی بدست گاری اور معنی فرمائی ہیں۔ وہ ہر فن سے آگاہ رہا۔ اس کے ہر شعر میں ایک فلسفیانہ پس منظر تسلیم کا تحقق ہے۔ اس لئے اس سے میں شوقی کے ساتھ ساتھ ہر شاعر کو بھی ملتا ہے۔ شوقی کا مستند بھی تھا۔ شوقی نے ہر فن میں اپنی ترقی حاصل کی۔ اس کے ہر شعر میں حکومت نے سے یہ شعر بہت ہی خوب ہے۔

شوقی کی زندگی میں عربی ادب کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں ہر صنف میں ہر قسم کی ترقی ہوئی ہے۔ ان کی شاعری میں ہر صنف میں ہر قسم کی ترقی ہوئی ہے۔



خلیل مطران، امیہ شکیب، ارسلان وغیرہ نے قصائد میں اسے خراج تحسین ادا کیا اور دیگر نثر  
رہنماؤں نے بھی تقریریں کیں۔

ڈاکٹر محمد حمید کی رائے [ڈاکٹر محمد حسین نے شوقی کی وفات پر ایک مقالہ تحریر کیا تھا جس میں شوقی کو  
خراج تحسین ادا کرتے ہوئے اس کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تحریر کرتے ہیں۔  
"شوقی کو ترکی اور فرنیچ میں مہارت حاصل تھی اس کا مطالعہ وسیع تھا لہذا اس کا  
مطالعہ کی بنا پر دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ فرانسیسی عنصر بھی اس کے کلام میں شامل ہو گیا تھا  
تاہم ترک و عرب کے اثرات اس پر غالب رہے وہ قدمائے یونان کی محض سے محروم رہے  
ورنہ مصر کا ردِ شاعرِ کامل ہوتا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شوقی نے فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ صحیح طریقہ سے نہیں کیا کیونکہ  
نے فرانسیسی ادیبوں کا بہت تذکرہ کیا ہے اس موقع پر اس نے فرانس کے اعلیٰ قسم کے ادیب  
اور فلسفیوں کا ذکر نہیں کیا ہے مثلاً وہ بودلین، فرین، سوفی بریدم، مالارامیہ وغیرہ سے ناواقف  
معلوم ہوتا ہے وہ جدید فرانسیسی ادب کے بجائے قدیم ادب سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے۔  
دوسری نئی جوس میں باقی رہ گئی تھی وہ یہ ہے کہ ابتدا میں اس نے اپنی طبیعت کو آزاد نہیں کیا  
بلکہ محرابی کی سیست میں الجھ کر رہ گیا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس کی جدت پسند قوت اور قوت  
منتیہ اس کی شاعری کا نہ بدل دیتی۔ اگر وہ مشہور یونانی شاعر ایلیڈ اور اوڈیسہ کو اچھی طرح  
سمجھ کر پڑھ لیتا تو وہ عربی زبان میں نئی حیثیت پر مشتمل منظوم زمریہ گوئی کی دنیا ڈھال سکتا تھا۔

اسی طرح اگر وہ قدیم یونانی اور جدید مغربی ڈراموں کو اچھی طرح مطالعہ کر لیتا اور اپنی  
فطرت کو بہ طرح سے آزاد کرتا تو وہ عربی نثر و نظم میں جدید تشریں نگاری کے اعلیٰ نمونے پیش  
کے سکتا تھا۔ اسی طرح اگر وہ جدید شعریے فرانس سے ربط ضبط قائم کرتا اور ان کے  
کلام کا مطالعہ کرتا تو اس کی شاعری میں اور گہرائی میں بہت بلند پایہ کی ہوتی۔ مگر کچھ تو مطالعہ کی  
نئی اور نئی ذمہ داریاں سننے سے اس کے پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے۔

ڈاکٹر ظہ حسین کی پیرائے انتہا پسندی پر مبنی ہے وہ نقاد کی حیثیت سے یہ چاہتے تھے کہ جس قدر وسیع معلومات یونانی اور مغربی ادب کے بارے میں انھیں حاصل ہے، وہ ہر مصنف ہر ادیب اور ہر شاعر میں ہونی چاہئے نیز وہ یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہر شاعر میں وہ تمام اوصاف پائے جائیں جو قدیم یونانی اور مغربی ادب کے شعرا میں موجود ہیں۔ مشتق کے حالات اور شاعر کے رجحانات کے لحاظ سے ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ شاعری ایک فطری سکھ ہے جو وسیع مطالعے سے نہیں حاصل ہوتا۔

بہر حال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شوقی اور حافظ عربی ادب میں مستثنیٰ اور ابوالعلا مہر کی کے بعد ایسے دوز بردست شاعر تھے جنہوں نے عربی شاعری میں انقلاب برپا کیا اور جدید شاعری کے نئے اس طرز راہ ہموار کی کہ قدیم عربی و فارسی و قوافی کی پابندیوں سے بغاوت بھی نہیں کی بلکہ شوقی نے قدیم شعرا کی مشابہت شعروں کی تقلید و تہمت میں انہی قافیوں بھر اور وزن میں ان کے جواب میں اپنی بعض مشہور نظمیں تحریر کر دیں جن میں سے چند درجہ ذیل نظمیں قابل ذکر ہیں۔ رسول کریم کی نعت میں مشہور بیت شاعر یونانی کے قصیدہ بردہ کے اقتباس میں اور اسی طرز میں اس نے ایک طویل نظم لکھی جو اب بردہ کے نام سے مشہور ہے اسی طرح وطن کی یاد اور اس کے شوقی و محبت میں ابن زبیر و زکریا کے نونیہ قصیدہ کے جواب میں اس نے بھی اسی طرز پر ایک نونیہ قصیدہ تحریر کیا۔ نیز اس کی ایک نظم بختیاری کے مینیہ قصیدہ کے مشابہ گزشتہ ایام اور ملک کے کھنڈروں کی یاد میں ایک نظم تغزل میں حقائق کے دائرہ قصیدہ کے تراب میں اسی قافیہ میں ہے یہاں تک کہ اس نے مشہور ابن سینا کے غنیہ قصیدہ کے جواب میں فلسفہ نفس پر اسی قافیہ و راسی طرز پر ایک نیا بیت حمد و ثناء لکھی اس طرح مشہور قدیم شاعر کے جواب میں نظمیں لکھ کر اس نے اپنی قدر و شان کا بہترین ثبوت دیا اس سے اجتناب لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ مت، شاعر، شاعر اور اس کے علاوہ شاعرانہ درجہ و دستاویز ادب پر سید کی جیسا کہ ان تمام شعرا قافیہ روایات سے بہت رشتہ میں اس کے علاوہ بہت سے شاعرانہ نظموں، قصیدوں





نقصہ ذیل میں مختلف نقطہ نگاہ پیش کرنے کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

”شوقی انفرادی عظمت اور شخصی پروپیگنڈہ کا قائل رہا ہے گذشتہ نصف صدی میں اسی قسم کے رجحانات بہت زیادہ تھے جن کا سرچشمہ محل شاہی تھا جس سے شوقی وابستہ تھا اور ابھی تک قدیم ادبی حلقوں میں ان رجحانات کا تھوڑا بہت اثر باقی ہے۔ جن کا نمائندہ انشا پر دازوں میں محمد حسن الزیات اور شعراء میں عزیز آبادی ہے۔“

شوقی سب سے پہلے درباری شاعرہ چکا تھا۔ ایک طرف وہ متنبی کا مقصد تھا تو دوسری طرف فرانسیسی شاعری کا آئینہ دار بھی تھا اور صحیح معنوں میں حافظ ابراہیم کی طرح کبھی بھی قوی شاعر نہ بنا وہ متنبی کی نفسیاتی خصوصیات اس میں پائی گئیں۔ حافظ ابراہیم کا پیغام شاعری انتہائی درجہ کا وطنی، سیاسی اور قومی پیغام تھا مگر شوقی کے بنیادی پیغام میں مصر کی قدیم عظمت، اسلامی اور عرب کی تاریخ کے گیت گائے گئے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اس کی گونا گوں تاریخی نظموں میں خلوص پایا جاتا ہے اور ان کے ذریعے اس کی غیر معمولی دماغی صلاحیت اور ذہانت کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر عام طور پر شوقی کے کلام میں اس کی اپنی شخصیت زیادہ نمایاں اور واضح نہیں دکھائی دیتی اس معاملہ میں وہ متنبی کے مشابہ نہیں ہے کیونکہ متنبی کی زبردست شخصیت کا آئینہ اس کا کلام ہے۔ تاہم بعض باتوں میں وہ متنبی کے مشابہ ہے جن میں غور و انایت کی صفت بھی ہے۔“

آگے چل کر شاعر موصوف کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ شوقی کی شاعری میں قدم ترقی کی طرف آگے بڑھایا گیا ہے اس کے کلام سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ غزلی زبان میں جدید خیالات و معانی کو قدیم طرز کے سحر آفرین انداز سے جس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ تصورات و معانی اور موسیقی قارئین کی نگاہوں کے سامنے جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہم شوقی وہ فقط کی مصری تصویر کشی میں یہ فوق ہے کہ حافظ موجودہ مصر کی زندہ تصویر پیش کرتا ہے جس میں عوام کے مصائب و ترقی کی کشش، درخوف و ہراس کے جذبات بھی شامل ہیں۔ مگر شوقی قدیم مصر کی تصویر کشی کے اس کی قدیم عظمت کے گیت گاتا ہے۔“



خلیل مطران آشوتی اور حافظ کے بعد مصر و شام کا مشہور شاعر خلیل مطران تھا جو ۱۸۷۷ء میں بمقام بعلبک پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اس نے بیروت میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ ۱۸۹۳ء میں مصر آیا یہاں آکر اس نے کئی اخبارات و جرائد نکالے۔ وہ خدیو مصر عباس حلمی کے زمانے میں شاعری سرپرستی میں عزت و احترام کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا۔ اس نے مصری تھیٹر اور مصری ڈراموں کی اصلاح و ترقی کے لئے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ اور انگریزی اور فرانسیسی زبان کے بعض مشہور ڈراموں کو عربی زبان میں منتقل کیا اس طرح عربی ڈراموں کی زبان کو درست کر کے ان کے ادبی معیار کو بہت بلند کیا۔ ۱۹۴۹ء میں اس کا انتقال ہوا۔

خلیل مطران کی شاعری پر فرانسیسی شعرا کا اثر غالب ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے وہ آشوتی اور حافظ سے کم درجہ پر ہے مگر شاعری کے جدید رجحانات و خیالات کے لحاظ سے وہ موجودہ عربی شعرا کا رہنما ہے۔ فرانس کی سیاحت اور وہاں کے قیام نے اس کے خیالات میں زبردست تبدیلی پیدا کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے کلام میں مغربی شعرا کی دقتِ آفرینی، خیالات کی یکسوئی، اور موضوع کے مطابق مکمل اور مسلسل اشعار کی نظمیں لکھنے کا رجحان غالب ہے۔ اس کی نظمیں مشہور فرانسیسی شاعر الفریڈی موسیہ کے پہلے دیوان کی ہو ہو عربی شکل ہے چنانچہ موسیہ کے مانند وہ بھی محبت اور رنج و غم کے جذبات کا اظہار کرتا ہے اور اسی کے طریقہ کے مطابق صنفِ نازک کو معنی طلب کر کے اپنی وارداتِ عشق بیان کرتا ہے۔

نام سماجی اور مجبسی تقریبات کے موقعوں پر اس نے حافظ اور آشوتی کے بہ نسبت کم نظمیں تحریر کی ہیں تاہم قوی اور سیاحتی تحریکوں کی حمایت میں اس نے کافی عمدہ نظمیں تحریر کی ہیں۔ مصطفیٰ کامل اور سعدیہ غاوی کی تحریکات آزادی کے زمانے میں اس نے نہایت عمدہ قومی نظمیں لکھی تھیں جو اس زمانے کی آزادی کی تاریخ کا کام دے سکتی ہیں۔

مصر میں طویل قیام کے باوجود اس کے دل سے اپنے آبائی وطن شام و لبنان کی محبت محو نہیں ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی بعض دلکش اور مشہور نظموں میں اپنے پیدائشی اور

تاریخی وطن شہر بعلبک کا مؤثر الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ اور مصر و شام دونوں ملکوں کے شاندار ماضی اور عبرت انگیز حال پر آنسو بہاتا رہا ہے اس لحاظ سے محض مصر کا قومی شاعر نہیں تھا بلکہ شام و لبنان کا علاقہ بھی اسے اسی قدر محبوب تھا جس قدر وہ مصر کا دلدادہ تھا اسی وجہ سے اسے شاعر القطنین کہتے ہیں اس کی قومیت تنگ دائرہ میں محدود نہ تھی۔ اس نے حافظہ شوقی کی جید روایات کو بھی برقرار رکھا چنانچہ حافظ کی طرح اس نے اپنے دوستوں کی وفات پر نہایت دلگداز اور پرتاثر مرثیے بھی تحریر کئے اور شوقی کی طرح اس نے بعض عمدہ اور دلکش تاریخی نظمیں بھی تحریر کیں جو خاص و عام میں بہت مقبول ہوئیں۔ اس قسم کی نظموں میں اس کی مشہور ترین وہ نظم ہے جس میں اس نے رومن شہنشاہ نیروں کے حکم سے قدیم روم کو نذر آتش کرنے کی تفصیلات بیان کی ہیں جو ایک مشہور ادیب و نقاد زکی المیسی کی رائے میں عربی زبان میں آتش زدگی کے اسی قسم کے موضوع پر تین لافانی نظموں میں سے ایک نظم ہے۔ اس قسم کی پہلی نظم ابو تمام نے تحریر کی تھی جب مقتسم بانی نے رومیوں کو شکست دے کر عموریہ کا سرحدی شہر فتح کر لیا تھا اور اسے نذر آتش کر دیا تھا۔ اسی موقع پر ابو تمام نے بوقصیدہ لکھا تھا اس میں آتش زدگی کا حال نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کیا تھا اور یہ قصیدہ اس کے دیوان کا لافانی شاہکار ہے۔

دوسری سی قسم کی نظم ابن الرومی کی ہے جو اس نے اس موقع پر لکھی تھی جب حبشیوں (زنوج) نے بصرہ میں بغاوت کر کے شہر کو آگ لگا دی تھی۔ اس نظم میں بھی شہر کی آتش زدگی کا حال عمدہ اور مؤثر طریقے سے بیان کیا گیا تھا۔ جب سیکڑوں برسوں بعد شاعر موصوف نے مذکورہ بالا نظم لکھی تو اپنے بے مثل انداز بیان کی بنا پر اس موضوع پر یکساں طور پر اسے تیسرے درجے پر رکھا جاسکتا ہے۔

شاعر موصوف اپنے پیدائشی وطن کی یاد میں اپنی چچ زاد بہن نجد، صباغ کو خطاب کرتے ہوئے لکھتا ہے

لو مقدار زکی الی سنی محمد نفع النبی دمشق ۲۵ جنوری ۱۹۵۰ء



هل تذکرین و نحت طفرن  
عہد ابزحلتہ ذکرہ غنم  
اذ یلتقی فی الکرم ظلات  
فیضا حکان ویالین الکرم

(۱) کیا تمہیں زحل کے مقام پر وہ زمانہ یاد ہے جب ہم دونوں بچے تھے۔ وہ یہ ادب غنیمت معلوم ہوتی ہے

(۲) جب انگوروں کی بیڑوں کے پاس دو سائے بنستے ہوئے ملتے تھے۔ اس وقت انگوروں کی وہ ہیں ہم

سے مانوس تھی۔

شاعر موصوف نے اس قسم کی نظمیں بھی تحریر کی ہیں جن میں قوم کے نوجوانوں کو ہمت و جرأت پر آمادہ کیا گیا ہے۔ ایک نظم میں اس نے اس وقت کا ذکر کیا ہے جب اٹالوی بحری بیڑہ ساحل شام پر لنگر انداز ہو گیا تھا۔ ایسے نازک موقع پر شاعر موصوف نے قوم کو آنے والے خطروں سے آگاہ کیا تھا اور انہیں ہمت و جرأت کے ساتھ ان خطروں کا مقابلہ کرنے پر متوجہ کیا تھا۔ اس نے نیولین پر بھی ایک عمدہ نظم لکھی تھی جس میں اس کے اولوالعزمانہ کارناموں کا تذکرہ تھا۔

مصر کے موجودہ شعراء کا رہنما ڈاکٹر احمد زکی ابوشادی، جس کا چند سال ہوئے، امریکہ میں انتقال ہوا ہے، خلیل مطران کا بچہ مداح تھا۔ ابوشادی خود بھی ہم عصر مصر کے تجدید پسند شعراء کا قائد تھا۔ مگر وہ خلیل مطران کو تجدید پسند عربی شعراء کا قائد اول قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک شوقی قدیم کلاسیکل عربی شاعری کا رہنما تھا مگر مطران صحیح معنوں میں جدید عربی کا بانی مبنی ہے۔ اس کی رائے میں مطران نے نہ فقط، اور شوقی کی طرح قدیم شعراء کا اتباع نہیں کیا اور نہ قدیم کلاسیکل عربی شاعری کے طرز کو زندہ کرنے کی کوشش کی بلکہ مغربی شعراء کی طرح نئے نئے اور اچھوتے موضوعات پر تخیل آرائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام تکلف و تصنع اور قدامت پسندانہ تقلید سے خالی ہے۔ ابوشادی کی رائے میں اس کے اشعار نہ صرف عربی ادب کے بلکہ آفاقی ادب اور آرٹ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ بلا شک و شبہ

۱۹ جولائی ۱۹۵۸ء دب الدہاشمی

وہ رومانیت اور جدت پسند شعرا کا پیش رو ہے اور اسی وجہ سے جدید عربی شعراء کے تخلیقی شاہکاروں پر خلیل مطران کا سب سے زیادہ اثر ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی کوششوں سے جدید عربی شاعری کو تنقید کے اثرات سے آزاد کیا جبکہ مسلسل اور مربوط خیالات کی نظموں کو رائج کر کے زبان کو خیالات کا تابع بنایا۔

خلیل مطران کے شاعرانہ کمالات پر بہترین کتاب ڈاکٹر اسماعیل ادہم نے تحریر کی تھی جو ادارہ المقطف نے شایع کی تھی۔

۱۵ ریزہ شعر الحدیث حصہ دوم بعد النعم خفاہ صفحات ۶۳-۶۹

## ”ندوة المصنفین کی تازہ ترین کتاب“

### ”صدیق اکبرؑ“

خلیفہ اہل حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نہایت مفصل و مبسوط اور محققانہ تذکرہ جس میں آپ کے حالات و سوانح، عظیم الشان کارناموں، دینی و سیاسی خدمات، حکام اخلاق، اور عہد صدیقی کے تمام واقعات کے علاوہ اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی مباحث و مسائل پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے، ”صدیق اکبر“، نئے اسلوب بیان اور انداز تحقیق کے اعتبار سے ایک لاثانی کتاب ہے جس کی خصوصیتوں کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

صفحات تقریباً ۵۰۰ بڑی تقصیحاً بت و طباعت نہایت نفیس و دیدہ زیب

قیمت غیر مجلد سات روپے۔

مجلد آٹھ روپے۔



# عربی کی ایک قلمی کتاب سے

## تاریخ ہند پر نئی روشنی

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارسی استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

کتاب کا نام مَسَالک الْأَبْصَارِ فی مَمَالِک الْأَمْصَارِ ہے، مؤلف ابن فضل اللہ عمری ہیں جو مشرق میں بمقام دمشق پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی۔ پھر حکومت وقت سے تعلق پیدا ہوا اور رنج اور سکریٹری کے معزز عہدوں پر فائز رہے۔ عمری کہلانے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا نسب عمر فاروقؓ سے ملتا تھا۔ اڑتالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ ادب اور انشاء میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ ان کے ہم عصر صلاح الدین صفدی، مصنف الوافی فی الوئیات، (م ۷۶۴) کی رائے ہے کہ انشاء مرسلت میں مصر کے مشہور اور صاحب طرز قاضی فاضل (م ۵۹۶) سے بھی بازی لے گئے تھے۔ صفدی نے ان کے حافظ اور ذہانت کی بڑے جوش بھرے الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ان کی ادبی بیاقت اور نشر و نظم میں ان کی ہمارت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں: چنگیز خاں اور اس کے جانشین مغل بادشاہوں، سلاطین ہند اور ترکوں کی تاریخ پر ان جیسا ہمارت رکھنے والا میں نے نہیں دیکھا اور جہاں تک مختلف ممالک کے حالات اور ان کی شاہراہوں، حدود، اور مخصوص پیداوار سے واقفیت کا تعلق ہے تو اس میں وہ امام وقت تھے۔ (فَوَاتُ الْوُئِیَاتِ، تالیف ابن شاکر کُتبی، مصر) مَسَالک الْأَبْصَارِ عام معلومات یا جنرل نالج کی بہت ضخیم کتاب ہے جو بقول صفدی مؤلف نے بڑی تقطیع کی میں جلدوں میں لکھی تھی اور جس کا نوٹو نسخہ اس وقت تیار ہیں

جلدوں میں مصر کی قومی لائبریری میں محفوظ ہے۔ عربی میں جنرل تالچ پر تصنیف کی ابتداء تیسری صدی ہجری میں ہوئی۔ اس کا محرک سرکاری ملازمین بالخصوص سکریٹریوں اور وزیروں کی معلومات میں وسعت، ہمہ گیری اور توازن پیدا کرنا تھا جہاں تک معلوم ہے ابن قتیبہ (م ۲۷۰) کی عُیون الأخبار اس صنف کی اولین تصنیف تھی۔ آٹھویں صدی ہجری کے دُورِ ہم عصر ادیبوں نے جنرل تالچ پر دو بڑی کتابیں لکھیں: نویری (م ۷۳۲) نے نہایت الأرب فی فنون الأدب اور ابن فضل اللہ عمری نے زیادہ وسیع پیمانہ پر مسالک الأیصار۔ اس کتاب میں مؤلف نے معلومات کے منفرد اصناف کو یک جا کر دیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کی تالیف کا اکثر مواد پچھلے مصنفوں سے مستعار ہے، ان مصنفوں کی متعدد کتابیں اب نایاب ہیں، اس کے علاوہ کتاب کا ایک قلیل حصہ ن کے ذاتی آراء، مشاہدات یا ہم عصر اشخاص مثلاً سیاحوں اور سفیروں کے بیانات پر مبنی ہے۔ ہندوستان پر ان کا جو طویل باب ہے وہ بیشتر زبانی معلومات پر مشتمل ہے۔ مؤلف نے کتاب کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا ہے: ایک حصہ میں ملکوں کے جغرافیہ، شاہراہوں، ہواؤں، خشکی اور سمندر کے عجائبات، بڑے بڑے شہروں کی جائے وقوع کا ذکر ہے، دوسرے میں دنیا کے حیوانات، جمادات اور اقوام کا۔ حیوانات میں چرندوں، پرندوں، کیڑے مکوڑوں کا، جمادات میں غلوں پھلوں، ترکاریوں اور کانوں کا۔ اور اقوام میں شرق و غرب کے نئے پُرانے لہجے والوں کا۔ مؤلف نے اسلامی دنیا کے مشہور سیاسی، اور اداری شخصیتوں، طبیب، عالموں اور فقیہوں کے سوانح اور حالات بھی دئے ہیں اور ہر ملک کی تاریخ سنہ دار ۴۴۴ ہجری تک بیان کی ہے۔ جٹلیز خانی مغلوں، ہندوستانیوں، ترکوں اور گردوں کے حالات خاص اہتمام و تفصیل سے پیش کئے ہیں: (تاریخ آداب اللغة العربیہ، از جرجی زیدان، مصر ۱۹۳۱ء / ۲۲۷)



قاہرہ کے دارالکتب میں مسالک الأَبصار کے دُر نسخے ہیں : ایک مُصَوِّر  
تینالیس جلدوں میں ، دوسرا ہاتھ کا لکھا . دونوں میں کتابت کی غلطیاں بہت ہیں  
اور وہ حصہ زیادہ مسخ ہے جس میں ہندوستان کا ذکر ہے . نوٹورالاً نسخہ نسبتاً بہتر  
ہے . اس کے علاوہ دونوں میں مضمونی کمی بیشی ، تقدیم و تاخیر اور لفظی اختلاف  
بھی ہے . مؤلف نے ہندوستان کے حالات دُر عنوانوں کے تحت قلم بند کئے  
ہیں ، ایک عجائب الہند ، جس میں پرانے ہندوستان کے کچھ انوکھے رسم و رواج  
عقاید اور کلچر کی جھلکیاں پیش کی ہیں . دوسرا عنوان مملکت الہند و السند ہے ،  
اس میں اپنے ہم عصر سلطان محمد بن تغلق کے حالات ، سیرت اور داد و دہش  
پر سیاہوں اور سفیدوں کی زبانی روشنی ڈالی ہے . یہ ذکر خاصہ تفصیلی ہے اور اس  
سے تغلق شاہ ، ان کی حکومت اور ان کے عہد میں ہندوستان کی اقتصادی و اجتماعی  
حالات کے بعض اہم پہلوؤں پر ، ایسے حقائق بیان ہوئے ہیں جن سے ہندوستان  
میں لکھی تاریخی تاریخوں کا دامن خالی ہے .

## مملکت ہند و سند

۶/۵ یہ ایک عظیم الشان مملکت ہے ، روئے زمین پر کوئی دوسری سلطنت نہ تو  
وسعتِ حدود ، اور نہ کثرتِ دولت و لشکر میں اس کا مقابلہ کر سکتی ہے اور نہ سفر  
و حضر میں اس کے بادشاہ کی ٹھاٹھاٹ اور اس کے پایۂ تخت کی شان و شوکت  
میں . ساری دنیا میں اس سلطنت کا شہرہ ہے . میں اس کے بارے میں جو  
خبریں سُنتا اور کتابوں میں جو حالات پڑھتا وہ مجھے بہت بھاتے اور میرے اوپر  
اثر ڈالتے . لیکن یہ مملکت چوں کہ بہت دور تھی ، اس لئے متعلقہ خبروں کی توثیق  
سے قاصر تھا . جب میں نے یہ کتاب (مسالک الأَبصار) لکھنا شروع کی اور

۳۶  
سے دُر حکومت چھبیس سال ۴۲۵-۴۵۲ھ  
۱۳۲۵-۱۳۵۱ھ

ثقہ راویوں سے اس کے حالات دریافت کئے تو میں نے جو سنا تھا اور اُس کے بارے میں جو رائے قائم تھی، اُس سے اُس کو بہت بڑھا چڑھا پایا۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ اس ملک کے سمندر میں موتی ہوتے ہیں، خشکی میں سونا، پہاڑوں میں یاقوت و الماس، وادیوں میں صندل و کافور، شہروں میں بادشاہوں کے تخت ہیں، یہاں ہاتھی اور گینڈا (کرگدن) پایا جاتا ہے، اس کے لوہے سے مشہور ہندی تلواریں بنتی ہیں، یہاں لوہے، پارہ اور سیسے کی کانیں ہیں، اس کا ایک پودا زعفران ہے، اس کی بعض وادیوں میں بلور ملتا ہے، انسانی منافع کا سامان اس ملک میں فراوان ہے، چیزوں کے زرخ سستے ہیں، فوج بے شمار ہے اور ریاستیں آن گنت۔ یہاں کے لوگ بڑے دانا اور فلسفی عقل ہوتے ہیں، خواہشات نفس پر قابو رکھنے اور تقرب الہی کی خاطر مستعدی سے جان دینے میں اپنی مثال آپ ہیں۔

اپنی کتاب تحقیق الاسباب میں (انڈسی موائف) محمد بن عبد الرحیم غزنائی نے لکھا ہے :- ”ہند اور چین میں شاندار حکومتیں ہیں۔ یہاں اعلیٰ درجہ کا نصاب ہوتا ہے، خدا نے بڑی بڑی نعمتیں ان کو عطا کی ہیں، یہاں کی سیاست و حکومت عمدہ ہے، یہاں خوش حالی اور امن کا ہمیشہ دور دورہ رہتا ہے، فلسفہ، طب، ہیئت اور صنعت گری میں اس ہند، سب قوموں سے بازی لے گئے ہیں۔ ہند کے پہاڑوں، درجیروں میں صندل، کافور پیدا ہوتا ہے اور ہر قسم کی خوشبودار بوٹیاں جیسے لونگ، کاشن، دارچینی، سچ، بید کے پھل، خوشبودار ترس، الاجی، کدو، سہرہ زری، اور مختلف قسم کی طبی بڑی بوٹیاں منسکی، ہرن اور زباد بی بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر اسکا میں مختلف قسم کے یاقوت کی کانیں ہیں۔“



ابن عبد رب نے اپنی عقد الفرید میں نعیم بن حماد کی سند پر بیان کیا ہے کہ  
 شاہ ہند نے عمر بن عبدالعزیز (۹۹-۱۰۲) کو ایک مراسلہ بھیجا جس کا مضمون تھا:  
 ”شاہ شاہان کی طرف سے جو ہزار بادشاہوں کا بیٹا ہے اور  
 جس کی بیوی ہزار شاہوں کی بیٹی ہے، جس کے اصطل میں ہزار  
 ہاتھی ہیں، جس کے دو دریا ہیں جن کے پانی سے صندل، ناریل  
 اور کافور آگتا ہے جن کی ہبک بارہ میل دور تک جاتی ہے، اُس  
 عرب سلطان کے نام جو خدا کی ذات و اختیار میں کسی کو شریک  
 نہیں ٹھہراتا، واضح ہو کہ میں آپ کی خدمت میں ایک تحفہ بھیج  
 رہا ہوں، تحفہ تو کیا، سلام و آداب، میری خواہش ہے کہ  
 آپ میرے پاس کوئی عالم بھیجیں جو اسلام کی تعلیم مجھے سمجھا دے، سلام“  
 مجھے شیخ عارف، بقیہ سلف کرام، مبارک بن محمود اثباتی نے بتایا جو  
 بڑے ثقہ ہیں اور جن کو شاڈن صاحب خاوسی (۹) کی اولاد میں ہونے کا شرف  
 حاصل ہے، اور چوں کہ وہ دران کے اسلاف اس ملک کے چھوٹے بڑے  
 سلاطین کے مقرب رہے ہیں، ان کے بیانات صحیح معلومات پر مبنی ہیں، وہ کہتے  
 ہیں کہ اس ملک میں آباد شہروں و مزارعوں کا ایک جاں بچھا ہوا ہے جن  
 کی صحیح تعداد تو مجھے نہیں معلوم، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ صوبہ قنوج ایک سو بیس  
 لاکھ دیہاتوں پر مشتمل ہے (۹)؛ ایک لاکھ سو ہزار کے برابر ہوتا ہے۔ اس حساب  
 سے کل دیہاتوں کی تعداد ایک کروڑ میں لاکھ زر چھ سو ہوئی (۹)؛ مالوہ کا صوبہ  
 قنوج سے بڑا ہے لیکن اس کے گاؤں کی تعداد بھی مجھے نہیں معلوم۔ مگر کا صوبہ کئی  
 جزیروں پر مشتمل ہے جو تھے بڑے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک بذات خود ایک شاندار  
 ملہ خط کشیدہ عبارت غلی نسخہ میں نہیں ہے، اس کو عقد غریب سے لیا گیا ہے۔ عقد الفرید میں نسخہ ۲۷ تحقیق احمد بن

سلطنت ہے ، جیسے کوئٹہ ، دکن ، سندھ اور مارہار (لیبار)۔ دریائے کنوئی (۹) پر لاکھ چھوٹی کشتیاں دھڑکتی پھرتی ہیں ، ان کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ اگر تیرنڈز ان کے آخر میں ہر مارے تو وہ کشتی کے وسط میں آکر گئے (۹) بڑی کشتیوں کی تعداد کم ہے ، ان میں ایسے جہاز بھی ہیں جن میں بن چکیاں لگی ہیں ورتنور اور بازار میں یہ اتنے جیسے چوڑے ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ان کے ایک حصہ کے مسافر دوسرے حصوں میں کے مسافروں سے عرصہ تک نادیدہ رہتے ہیں ۔ . . . (۹)

۴/۵ دو مندوسن کا پائہ تخت ہے ، دوسرا پائہ تخت قبتہ الاسلام (دیوگر) ہے دہلی تعلیم رابع میں وضع ہے ، مؤلف کہتا ہے کہ سلطان محمد (ہوالفدار) نے اپنی کتاب تقویم البلدان میں بھی یہی رائے ظاہر کی ہے ، شیخ مبارک نے کہا : قبتہ الاسلام تیسری تعلیم میں ہے ، میں نے جب اس کو جھوٹا نو ذہیری طرح تعمیر نہیں ہوا تھا ، مجھے دہاں سے آئے چودہ ساں ہوتے ہیں ، مہ حیاں ہے کہ وہ اب تک ادھورا ہے ، کبوں کہ تعمیر بہت بڑے رقبہ میں شروع ہوئی تھی ، اور بڑی بڑی عمارتیں بنانے کا پروگرام تھا ، مغل شاہ نے شہر کے نقش میں ہر صبقہ کے لئے مجھے بنانے کی رعایت رکھی تھی ، ایک محلہ فوج کے لئے تھا ، دوسرا وزیروں اور سکریٹریوں کے لئے ، مائیسر قاضیوں اور عالوں کے لئے ، چوتھا صوفیوں اور فقہروں کے لئے ، پانچواں تاجروں اور مشہ دروں کے لئے ، ہر محلہ میں عام ضروریات کا انتظام کیا گیا تھا ، جیسے مسجد ، ذن کا مندرہ ، بازار ، حمام ، چکیاں ، تنور ، اور ہر صنف کے کاریگر بسائے گئے تھے جیسے سنار ، رنگریز ، چرم ساز ، تاک ایک محلہ کے لوگ خرید و فروخت اور لین دین میں دوسرے محلہ کے محتاج نہ رہیں اور ہر محلہ پوری طرح خود کفیل ہو جائے اس سلطنت میں غیر آباد علاقہ یا تو بیس دن کی مسافت کے بقدر غزنہ سے متصل ہے اور اس کی وجہ شاہ ہند کی شاہ ترکستان و مراء النہر سے باہمی جنگ و پیکار



ہے، یا غیر آباد پہاڑ یا تہ پہاڑ کی گھاٹیاں، لیکن یہاں جو خوشبودار اور طبی یوٹیل  
 فراہم ہوتی ہیں ان سے زراعت کے مقابلہ میں بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ مصنف  
 کہتا ہے کہ فاضل نظام الدین یحییٰ بن حکیم نے مجھے ایک پرانی کتاب سے روشناس  
 کیا جو ہندوستان کے بارے میں ہے اور جس میں لکھا ہے کہ ملتان کی عمل داری میں  
 ایسے ایک لاکھ چھیالیس ہزار گائیں ہیں جن کا سرکاری رجسٹروں میں اندراج ہے۔ ملتان  
 اور دہلی چوتھی اقلیم میں واقع ہیں اور ہندوستان کے باقی حصے دوسری اور تیسری میں۔  
 مملکت ہند کا رقبہ بہت بڑا ہے اور یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے، سوائے اس مضر  
 صحت اراغی کے جہاں چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں یہ تصریح بھی ہے  
 کہ محمد بن یوسف ثقفی نے ہند میں چالیس سہارا سونا یا یا، ایک سہارا تین سو تینتیس سیر  
 کے برابر ہوتا ہے۔ ۵/۸ سطنت ہند کی حد غزنہ اور قندھار کی عمل داری  
 تک پہنچتی ہے۔

میں نے شیخ مبارک سے اندرون ہند اور اس کے ساحلی مضافات کے حالات پوچھے  
 تو انہوں نے کہا: ہند میں قریب دو ہزار چھوٹے بڑے دریا ہیں، ان میں سے کچھ اتنے بڑے ہیں  
 جتنا نیل۔ دریاؤں کے کنارے گاؤں اور شہر آباد ہیں ہند میں بڑے بڑے مرغزار اور گھنے درخت  
 پائے جاتے ہیں۔ ملک کی آب و ہوا معتدل ہے، موسموں میں فرق نہیں ہوتا، سال بھر بہار  
 کا موسم رہتا ہے، ہوائیں جیتی رہتی ہیں۔ بارش چار مہینے برابر ہوتی ہے، بالعموم بہار کے آخر  
 سے لے کر گرمی تک۔ یہاں مختلف قسم کے غٹے پیدا ہوتے ہیں: گیہوں، چاول، جو، چنا، مسور،  
 اُرد، لوبیا، تل، فول مٹر تقریباً نہیں ہوتا، میرا خیال ہے (مؤلف کا) کہ فول نہ ہونے کا سبب  
 یہ ہے کہ ہند مفکروں اور فلسفیوں کا ملک ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ فول سے جو ہر عقل کو نقصان  
 پہنچتا ہے، اس لئے صابہ فرقے نے اس کا کھانا ممنوع قرار دیا ہے۔ شیخ مبارک نے کہا: پھلوں  
 میں انجیر اور انگوٹھ کم ہوتے ہیں، انار کھٹا، میٹھا اور کڑو میٹوں قسم کا، کیدا، خوبانی، کھٹا، لیمو،

لیم (۹) نارنگی، گولہ، کالا شہتوت، خربوزہ، تربوز، گنڈی، کھیرا، گولہ کدو خوب ہوتا ہے۔  
 امرود ہوتا ہے اور باہر سے بھی منگایا جاتا ہے۔ ناشپاتی اور سیب بہت کم ہے وہودامن  
 السفرجل (۹) اس کے علاوہ ہند میں ایسے پھل بھی ہوتے ہیں جو مصر، شام اور عراق میں نہیں  
 ہوتے جیسے آم، میر، کج (۹) کر دیا (۹) انکلی (۹) بکی (۹) نخرک آم، ان کے علاوہ اور بھی  
 لذیذ اور بڑھیا پھل ہیں۔ فاما الساجس، فو شجر بری، حلو، الجبل، والناسرجیل (۹) کیلا، خوخ  
 پیدا ہوتا ہے لیکن دہلی میں کم ہے۔ گنے کی بھی افراط ہے۔ ایک قسم کا گنا سیاہ اور سخت پھلکے  
 کا ہوتا ہے جو سننے کے لئے اس سے بہتر کوئی قسم نہیں، یہ گنا کسی اور ملک میں نہیں ہوتا۔ گنے  
 کی باقی قسموں سے بڑی مقدار میں سکڑائی جاتی ہے جو مصری سے سستی ہوتی ہے یہ ڈلی کی  
 شکل میں نہیں ہوتی بلکہ سفید میدہ کی طرح باریک ہوتی ہے۔ ہندوستان میں جیسا کہ شیخ  
 مبارک نے مجھے بتایا اکیس قسم کے چادل ہوتے ہیں، شلجم، گاجر، کدو، بنگین، مارچوبہ  
 (کھلیون) اور ک بھی ہوتی ہے، ہری اور ک کو گاجر کی طرح پکایا جاتا ہے، اس کی ہانڈی  
 اتنی لذیذ ہوتی ہے کہ کوئی دوسری چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ جعفر، ہسن، پیاز،  
 پودینہ اور شمار (۹) بھی پایا جاتا ہے۔ گون گون اقسام کے پھول ہوتے ہیں جیسے گلاب،  
 نیلوفر، بنفشہ، مشک بید، زکس، اگلی ہدی، تلی کاتیں ہوتا ہے درجہ نے کے کام آتا ہے،  
 لیکن زیتون کا تیل نہیں ہوتا، اور باہر سے منگایا جاتا ہے، شہد کی فراوانی ہے۔ موم ہی  
 صرف شاہی محل میں پائی جاتی ہے، عوام اس کو نہیں رکھ سکتے۔

ہندوستان میں چرنے والے مویشی اور بکریاں تیرند بے شمار ہیں۔ بھینس، گائے، بکری  
 بکیر، مرغی، کبوتر، بطخ، گھٹیا قسم کے پرند اتنے ہیں کہ ان کی نہ مانگ ہے نہ قیمت۔ (۹) یہاں  
 بازاروں میں قسم قسم کے کھانے بکتے ہیں، بھنا گوشت، مطبخ، تدا گوشت، منوع (۹)  
 اور ایک دو نہیں پیسٹھ قسم کا حلو، پھلوں کا رس اور ایسے سہرت جو شکل سے کہیں اور  
 ملیں گے۔

۱۰/۵ ہندوستان میں تلور، تیر، نیرے، زرہ بکتر اور دوسرے قسم کے ہتیار بنانے والے، نیز سنار، زرکار، زین ساز، اور دوسرے صنعت گر، خواہ ان کی عورتوں کے لئے مخصوص ہو یا مردوں کے لئے، یا اہل قلم کے لئے، یا اہل تلوار کے لئے، یا عوام کے لئے، بے شمار پائے جاتے ہیں۔

ملک میں اونٹ کم ہیں، بس بادشاہ، یا بڑے عہدے دار، خان، امیر اور وزیر اونٹ رکھتے ہیں، گھوڑوں کی کوئی کمی نہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک عربی نسل، دوسرے دیہی۔ اکثر گھوڑے اچھا کام نہیں دیتے، اس لئے اس پاس کے سارے ترکی سوار، سے مسکائے جاتے ہیں، عربی گھوڑے بحرین، یمن اور عراق سے برآمد ہوتے ہیں، چھٹی نسل کے عراقی گھوڑے جن کی بھاری قیمت وصول کی جاتی ہے ہند میں بھی بہت کم عدد میں زیادہ دن یہاں رہتے ہیں ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں خیر اور گدھے دونوں کی سواری محبوب خیال کی جاتی ہے، کوئی نفعیہ اور عالم خچر پر سواری پسند نہیں کرنا اور گدھے پر سوار ہونا تو ہندیوں کی نظر میں سخت عار کی بات ہے۔ اس لئے سب کی سواری کا جانور گھوڑا ہے۔ کھاتے پیتے اور عمدہ ۱۰ ار لوگ بار برداری کے لئے گھوڑا سنبھال کرتے ہیں اور عام لوگ گائے پر یا من ڈل کر، گائے کی رفتار تیز اور قدم لمبے ہوتے ہیں۔

شیخ مبارک نے کہا: یہ مملکت بے حد لمبی چوڑی ہے، درمیان چان سے تین برس چاہئیں اس کی لمبائی طے کرنے کے لئے، اس کا عرض سو مائٹ دند کا کے بیچ سے غزنہ تک اور طول حدن کے سامنے والے بندرگاہ (۶) سے سد سکندر تک، جہاں بحر ہند، (۶) بحر محیط سے نکلتا ہے۔ اس لمبے چوڑے رقبہ میں بڑے شہروں کا ایک سلسلہ ہے جہاں شاہی ٹائندے



اور تخت لشین حاکم رہتے ہیں، جن کی عمل داری میں شہر، قصبے، گاؤں، جائیدادیں اور بازار ہیں، جہاں ہر طرف آبادی اور زراعت ہے۔ شیخ مبارک کی رائے کہ یہ مملکت لمبائی میں تین سال کی مسافت کے برابر ہے غور طلب ہے، کیوں کہ تین سال کی مسافت تو کل آباد دنیا کی بھی نہ ہوگی۔ ہاں اگر شیخ مبارک کا مطلب یہ ہے کہ اس مملکت کے سارے شہروں کا گشت کرنے کے لئے تین سال درکار ہیں تب کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔ شیخ مبارک نے بتایا کہ اہل قراصل (۱) سلطان دہلی کے تابع ہیں انھوں نے ایک مقررہ خراج کے مقابلہ میں سلطان سے عارضی صلح کر لی ہے۔ قزقل پہاڑ میں سونے کی سست کافیں ہیں، جن سے سارے ملک کو حاصل ہوتی ہے۔ خشکی اور سمندر کی بڑی مسطنت چند غیر مفتوح جزیروں کو چھوڑ کر موجودہ سلطان دہلی (محمد بن تغلق) کے قبضہ میں ہے۔ ساحل کی ایک باشت زمین بھی ایسی نہیں جس پر اس کا حمل دخل نہ ہو۔ اس ساری حکومت کے طول و عرض میں اس کا سکہ چلتا ہے اور اس کے نام پر سکہ بڑھ جاتا ہے اور کہیں اس کا کوئی حرف نہیں۔ (باقی)

## خلافتِ راشدہ

حصہ دوم تاریخِ ملت :- عہدِ خلافتِ راشدین میں ستر عظیم احباب کے واقعات قدیم و جدید عربی تاریخوں کی بنا پر جمع و جمعہ سے لکھے گئے ہیں، یہ کتاب کاجوں اور سکونوں کے پورس میں دخل مینے کے رہتی ہے۔

جدید ایڈیشن صفحات ۳۷۶

قبولت غیر مجلد تین ریے لکھنے۔ مجھ میں رہے پڑھنے۔

## رفاہ عام از

(جناب مولوی محمد انظر شاہ صاحب استاد دارالعلوم دیوبند)

(۵)

بیت المقدس میں مسلمانوں کی طرف سے جو ہسپتال کھولا گیا تھا اس کے متعلق لکھا ہے  
 ”یہ ایک اعلیٰ درجہ کا دارشفہ ہے جس کے لئے زکیر وقف کیا گیا ہے ہزار ہا بیماروں کو یہاں دوا اور غذا  
 دی جاتی ہے بہت سے تنخواہ یاب طبیب مقرر ہیں جو ہر وقت شف خانہ میں موجود رہتے ہیں، انصار خسرہ<sup>۲۶</sup>  
 دمشق کے متعلق یہ لکھتے ہوئے کہ یہاں تقریباً ۲۰ کالج ہیں انگریز منسفن جی۔ بی اسٹریمنج  
 لکھتا ہے

”یہاں دو بیمارستان ہیں ایک پرانا اور ایک نیا، نیا شف خانہ زیادہ وسیع اور بہتر بنا ہوا ہے، اس کے وقف کی  
 آمدنی ۷۰ پونڈ روزانہ ہے بیماروں کو دیکھنے کے لئے طبیب مقرر ہیں اور نذر و دوا کے سرکاری طور پر پہچانے کا  
 انتظام ہے۔“ بلاد فلسطین و شام ص ۳۸

اور مورخ صیسی معرکوں کے مشہور شہسوار سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق یہ لکھتے ہوئے  
 کہ قاہرہ میں جو شف خانہ سلطان نے تیار کرایا تھا وہ ایک نہایت خوبصورت اور شاندار ایوان  
 بنے ہر کمرہ نہایت صاف اور پاکیزہ اور تمام کمروں میں چادر لگے ہوئے سلیقہ سے پٹنگ بچھائے  
 گئے ہیں اس کے لئے دوا ساز و رشتی مقرر ہیں۔ دواخانہ کا انتظام ایک سکرٹری کے متعلق ہے  
 جس کے ماتحت بہت سے نوکر ہیں جو صبح و شام مہینوں کو دیکھتے ہیں۔ دوائیں غذائیں بہم پہنچائی  
 جاتی ہیں اور مریضوں کی ٹری داسوائی کے ساتھ نذر و مست کی باقی ہے اس کے بعد یہ بھی اطلاع دی  
 گئی ہے کہ

”عورتوں کے علاج کے لئے ایک جداگنا عہدہ ہے اس عہدہ کی نگرانی و رعایت کے لئے عورتیں ہی مامور ہیں۔“

اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

» ہاتھوں کے علاج کے لئے لگ مکانات ہیں جن کا احاطہ جہالت و سیلح اور دیرپوں میں لوہے کی جالیاں ہیں «

اور آخر میں سب سے زیادہ حیرت انگیز جو بات سنائی گئی ہے وہ یہ ہے

» جو بگ شفا خانوں میں علاج کسریشان سمجھتے ہیں ان کے لئے طبیب و جراح مقرر ہیں جو گھر پر جا کر ان کا علاج کرتے

ہیں « حیات الہی ص ۲۱۱

کوئی ٹھکانہ ہے سلطان کی اس بلند جو صنگی کا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کا یہ درد مند ترجمان اپنے  
الوالعزمانہ کارناموں کی وجہ سے تاریخ میں یک شاندار کردار کا مالک ہے۔ سلطان کے ساتھ شجاعت  
اور ایسے فیاض و کشادہ دل انسان کے ساتھ رہنے پہننے کی وجہ سے خود سلطان کی سلیم عظمیہ  
خاتون جس درجہ کی سخی و جواد تھی اس کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

» اس نے فقراء کے موجب مقرر کئے تھے۔ فقیہوں اور زابدوں کے لئے سراییں بنوائی تھیں۔ مسکین کی سہولتیں  
مقرر کیں۔ طلباء کو کھانا اور پوشاک اس کے ہاں سے ملتا تھا۔ اس کے وقف کئے ہوئے مکانات و انعامات سے  
مدت در مدت لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور ایضاً

دیانت پسند مورخ کا قلم اس فیاض اور پاک نہاد خاتون کے تذکروں سے تاریخ کی کتابوں  
کو یقیناً زینت بخشنے لگا اور انسانیت نواز حلقوں میں عظمیہ خاتون کی فیاضی ہمیشہ یاد رہے گی۔  
شرفانے اور محتاج گھر اجا بجا لنگر خانوں کا انتظام بھی مسلمانوں کی طرف سے کیا گیا تھا جن سے عام طور  
پر کھانا دونوں وقت ملتا اور محتاج خانوں میں ان کے رہنے سہنے کا آرام دہ اور راحت بخش انتظام  
کیا جاتا۔ چنانچہ عمربن عبدالعزیز نے

» ایک لنگر خانہ قائم کیا جس سے فقیروں، مسکینوں اور مسافروں کو کھانا ملتا تھا « جبری ص ۳۶۳

ولید نے

» غریبوں، مسکین کے لئے محتاج خانے قائم کئے۔ اندھوں کے واسطے راہبر اور ایاموں کے لئے خدمت گزار مقرر  
کئے اور ان کو ورثہ دیا « (تاریخ امت جلد ۳ ص ۳۷۳)



وظائف ان لنگر خانوں اور محتاج گھروں کے علاوہ جن کا انتظام جابجا، غرباء و فقراء کے لئے کیا گیا تھا، وظائف کی شکل میں ایک بڑی بھاری وہ رقم بھی تھی جو مسلمانوں کی طرف سے مفلس اور قدش لوگوں کو پہنچتی رہتی تھی۔ گویا کہ اس طرح غریب و حاجت مند لوگوں کی ضروریات و حوائج کو پورا کرنے کی سینکڑوں صورتیں پیدا کی گئی تھیں۔ یہ واقعہ ہے کہ غریب کو اپنے سرمایہ میں شریک کرنے کے جو سینکڑوں راستے اسلام نے پیدا کر دیئے ہیں۔ اگر ان راہوں سے قدش لوگوں تک ضرورت کے مطابق ایک پہنچتی رہے تو بلاشبہ سرمایہ دار اور غریب کے درمیان جھگڑے ختم ہو کر اشتراکیت و سرمایہ داری کے درمیان مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔ جہاں جہاں کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے حکم دیا تھا

”ہر جذائی کو بیتِ جان سے نظیر نہ دیا جیسے مگر ریکی کی مائیں میں بجاں کو گھومناہ پڑے وریہ تھی

مرض پھیلنے نہ پائے۔ یہ قیدیوں کے عیال کو بھی جن کے گزر گئی کوئی صورت نہیں۔ روزیہ دیا جائے۔

تاریخ المستقیم (۱۸۱۱)

متعدی امراض کے سلسلے میں مہدی کی یہ عجیب و غریب تجویز بڑی مناسب اور موزوں اور اگر آج بھی حکومتیں اس قسم کی تجاویز پر عمل کریں تو کافی حد تک موزوں بیماریوں کا سدباب ہو سکتا ہے۔ وٹالنف کی شکل میں غریبوں تک اچھی فائنی مقدار میں روپیہ پہنچانے کا لفظ جس کو کے دوستوں کافی طویل تھا اور یہاں تک کہ عورتیں بھی اس سے دلچسپی لیتی تھیں۔ سسٹن ایونی کی بیگم خنسمیہ خاتون کے متعلق آپ مجھ سے تو سن چکے ہیں کہ اس نے اپنے وٹالنف سے ایک بڑی جماعت کو کسب معیشت کے جھنڈوں سے آزاد کر رکھا تھا۔

اوپر ایمہ شکیب اسرار نے ان تمام اوراق کی تفصیل سنائی ہے جو مسلمانوں کی طرف سے  
 قہر مہر کے اس تفصیل کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اوراق کے کاموں سے مسلمانوں کی قدر و بچہ  
 سے ایمہ نے اوراق کے سلسلہ میں لکھا ہے

”مشتاقانِ یک وقف کا مصرف صرف یہ ہے کہ کسی خدمت سے جتنی کے برتن، گارلوٹ یا ٹیں تو فوراً خدمت کی طرف

سے س برتن کا معاوضہ برتن ہی کی شکل میں مالکوں کے پاس پیش کر دیا جائے ہر سال اس وقف میں چھ طرف کا ایک بڑا ذخیرہ اسی لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

کیا ٹھکانہ ہے مسلمانوں کی اس بلند وصلگی کا کہ رفاہِ خلق کے لئے ان کے نیک جذبے خد مت کی کیا شکمیں ہوں لیتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ صدیوں تک مسلمانوں نے، م انسانوں کی خد مت جس انداز میں کی ہے۔ بلا مبالغہ، اقوام کی تاریخ اس نوعیت کی خدمات سے قطعاً خالی ہے امیر نے ایک دوسرے وقف کے متعلق اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے

”اس وقف سے مختلف علاقوں میں غریبوں کی شادی کے انتظام ہوتے تھے۔“

بعض اوقاف اس لئے بھی تھے کہ

”جن عورتوں کے پاس نہ پورے مورن کو عاریتہ زیر دیئے جائیں۔“

ٹیونس میں ایک خاص موسم میں لذیذ مچھلی نیاں جوتی ہے لیکن اتنی گراں قیمت کہ ہر شخص خرید کر کھ نہیں سکتا، ایک صاحب خیر مسلمان نے

”ہم د وقف کر دی کہ اس کی آمدن سے یہ مچھلی غریبوں کو ہیا کی جائیں۔“

مکشیں ایک بڑا وقف جنوں و رہا پانچوں کی خبر گیری کے لئے تھا۔ اور اسی وقف سے غریب کے لئے ہر سال موسم سرما میں گرم کپڑوں کا انتظام ہوتا تھا۔ مرکش ہی میں ایک فرانسیسی سیاح نے ایک اسدائی وقف کے متعلق بتایا ہے کہ

”اس کے معارف سے تہ بڑا مکان بنایا گیا ہے جس میں چھ ہزار اندھوں کو رہنے کی جگہ تھی۔ اس کے کھانے

پیسے، لباس، اور دوا ضرورتوں کا کفیل ہی وقف تھا۔“ حاشیہ ص ۱۹۷۔ سری ۱۹۷

بعض مجسم خیز عرس کے تو یہاں تک وقف کی خدمات کے حدود بڑھ دیئے کہ گرمیاں اور بیوی میں جھگڑا ہو اور نہ رض ہو کر بیوی شوہر سے عنیدہ ہو جائے تو اس پورے زمانے میں اوقاف کی طرف سے عورت کو خرابات ملتے تھے۔ بعض ایسے ہی اوقاف تھے جو غریب گھرانوں میں شادی کے وقت فرش و فرش کا انتظام کرتے۔ بہر حال یہ اوقاف اور ان کی تفصیل بہت

زیادہ ہے۔

رسل و رسائل | مسلمانوں نے رسل و رسائل اور ڈاک کا سلسلہ بھی قائم کر کے اس کے حدود و قیود میں ممالک اسلامیہ میں پھیلا دیئے تھے جیسا کہ انگریز مورخ لکھتا ہے کہ

”ملک شام میں سلطنت اسلامی کے دوسرے ملکوں کی طرح ڈاک کی سڑکوں کا جال سا بچھا ہوا ہے اور جب

برید خانے ہیں جن میں سرکاری خرچ سے سوار متعین رہتے ہیں“ (بلاد فلسطین و شام ص ۵۹)

اس سے معلوم ہوا کہ دوسرے اسلامی علاقوں میں بھی اسی اہتمام کے ساتھ رسل و رسائل کا باقاعدہ نظام قائم کیا گیا تھا اور رفاہ خلق کے اس شعبہ سے مسلمان غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ مورخین کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کے زمانہ میں اس شعبہ نے منظم طور پر کاروبار شروع کیا۔ چنانچہ لکھا ہے

”برید کے نام سے مستقل شعبہ انھوں نے قائم کیا تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر چابک دم گھوڑے تیار رہتے جو

ادھر کی خبریں ادھر پہنچاتے“ (الفخری ص ۹)

مہدی نے بھی مکہ، یمن، عراق کے شہروں میں ڈاک کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ بہر حال رفاہ خلق کے اس شعبہ میں بھی مسلمانوں کی خدمات دوسری قوموں سے کم نہیں۔ بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ ڈاک کا موجودہ مرتب سلسلہ، مسلمانوں کی اس سلسلہ میں ایجادات کی ایک صاف ستھری شکل ہے۔ یوسف بن عمر کے زمانہ میں ڈاک کا خرچ چالیس لاکھ روپیہ سالانہ تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمان اس شعبہ سے کس قدر دلچسپی لیتے تھے۔

نصیب کے بچھو | ازہر یلے جانوروں کے مارنے کی مہم موجودہ وقت کا ایک دلچسپ اور مفید مشغلہ

ہے۔ چھوڑ مکھیاں مارنے کی ترغیب حکومتوں کی طرف سے عوام کو دی جاتی ہے۔ اور ہزاروں

بیماریوں کے پھیلنے کے خطرہ کا اس طرح مقابلہ کیا جاتا ہے۔ پچھلے سال چین میں، وُسی تنگ

صدر جمہوریہ کی طرف سے مکھیوں کو مارنے کی ایک کامیاب مہم پیدائی گئی تھی۔ شاید موجودہ وقت

میں جبکہ مچھر اور مکھی مار مہم سے عوام کی دلچسپیاں بڑھ رہی ہیں یہ انکشاف دلچسپ ہوگا کہ



رفہ خلق کے اس شعبہ کی بھی بنیاد مسلمان اپنے دور میں ڈال چکے تھے۔ چنانچہ امیر معاویہ کے متعلق لکھا ہے

”ان کو نصیحت کے عامل تھے لکھ کر میرے ساتھیوں کی ایک جماعت کو پھپھوڑوں سے اذیت پہنچتی ہے معاویہ نے اس کے جواب میں لکھ کر شہر کے تمام محرموں پر پھپھوڑوں کی تعداد مقرر کر دو کہ وہ روز تھے پھپھوڑا کریں اس نے یہی کیا وہ لوگ پھپھوڑے کر آئے اور وہ لوگوں کو مار ڈالنے کا حکم دیتا، فتوح البلدان ۲۹۶

بلکہ صرف یہی نہیں بعض شہروں میں پھپھوڑوں کے کسم کا بھی انتظام کیا گیا تھا تاکہ ڈنک مارنے کی صورت میں علاج کیا جاسکے اب یہ اس کی تفصیلات کہاں تک سناؤں۔

بندرگاہیں مسلمانوں نے اپنے دور میں بندرگاہیں بنائیں وہی بندرگاہیں جو اس رتقی دور میں کسی ملک کا سب سے بڑا قیمتی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے۔ اور بحری راستوں سے نقل و حمل کا جو سب سے بڑا ذریعہ ہے چنانچہ بندرگاہ غسان کی

”اسلامی عہد میں زمر نو تعمیر ہوئی“ دشتی ص ۲۰۸

اس کے علاوہ دوسری بھی بندرگاہیں تعمیر ہوئیں۔ طوالت کے خوف سے ان کا ذکر چھوڑ رہا ہوں! بہر حال اسلامی عہد میں رفہ کے سلسلہ میں جو کچھ ہوتا رہا یہ اس کا ایک ناقص ورنہ مکمل مرقع ہے۔ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ابھی تو سینکڑوں رفہ خلق کے ایسے شعبہ ہیں جن کا ذکر میں نے قصداً چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً تعلیم سے متعلق مسلمانوں کی دلچسپی۔ اور اس میں کروڑوں کی رقم کا صرفہ جاری مدرس، مکتب، کالج اور یونیورسٹیاں طلباء و اساتذہ کے لئے، ہر قسم کے آرام و انتظام اور ان کی متعلقہ تفصیل۔ اسی طرح زراعت و باغبانی، و تقسیم کے تہارت انگیز کارنامے، چرگاہوں سے متعلق سد می قوانین، دکانیں، بازار، تفریح گاہیں، آب و ہوائی گھر، ہر قسم کے سینکڑوں امور ہیں جن کا ذکر بھی نہ آسکا۔ میرے سامنے بھی تھے عنوانات باقی ہیں جن کے پیش نظر میں سمجھتا ہوں کہ اس مقدار میں مسلمانوں کے رفہ کے سامنے سے متعلق جس قدر تفصیلات ہونی چاہئے تھیں۔ نہیں ہو سکی۔ اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے رفہ خلق سے متعلق مور کا ذکر بھی نہ آسکا۔ کہ ہندوستان میں

بیٹھ کر کھینے والے کو اپنی رفاہیت عامہ کا تذکرہ کرنا چاہئے تھا۔ جو اس ملک کے گوشہ گوشہ میں مسلمانوں نے انجام دیئے اور جن کے مٹے ہوئے کچھ نشانات اب بھی باقی ہیں۔ انشاء اللہ کسی فرصت میں ہندوستان کے متعلق تفصیلات پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اب تو صرف یہ چاہتا تھا کہ رفاہیت عامہ سے متعلق ایک ایسی تفصیل سامنے آجائے تاکہ خدمتِ خلق کے جو امور مسلمانوں نے انجام دیئے ان کی نوعیت مکمل نہیں تو اور صورت کی ہی سامنے ہو۔ اور اس ٹپتی ہوئی انسانیت کو معصوم ہو کہ عروج و ارتقار کے بعد اس مسلم قوم پر جو تیز و انحطاط کا دور شروع ہوا ہے اس کے نتیجے میں انسانیت نے اپنے ایک بہترین اور کارآمد ذمہ کو کس طرح ضائع کر دیا۔ اور رفاہیت عامہ کے جو عظیم الشان کام مسلمان انجام دے رہے تھے اور جن سے بلا تخصیص ہندو ملت سب ہی فائدہ اٹھاتے تھے ان کا سلسلہ منقطع ہونے سے کیا نقصان پہنچا۔ بروہ قوم جس میں فکرِ آخرت، اور آخرت کا یقین، موجود نہ ہو۔ اور جو اس زندگی کے بعد شروع ہونے والی دوسری زندگی سے انکار کرتی ہو۔ رفاہیت کے اتنے شاندار کام سامنے اس قوم سے بعید ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں خدمتِ خلق کے جو زائے کار دیئے۔ اور جو اس کی پیروی ہے۔ اس دنیا کو آخرت کی کھیتی ان کو سمجھایا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رفاہیت عامہ اور خدمتِ خلق کے لئے اس قوم کو بیدار کرنا ہو گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی پر یقین رکھتی ہے۔ اور جس کو سمجھایا گیا ہے کہ حیاتِ نوری و فوز و فلاح اس کائناتِ انسانی کی اخلاص کے ساتھ خدمت کرنے پر ہے۔ مضمون نگار کا قلم جس درد و دل سوزی کے ساتھ سوچنے کے لئے یہ نقد پیش کر رہا ہے کاش کہ انسانوں کا عام مجرم اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا کرے۔ اور اس طرح، انسانیت کے جسمِ زار پر مہم و مدد کے صحیح ذخیروں کا تلاش کرنے والوں کو یہ احساس

# آر پست

## غزل

(از)

(جناب ام مظفر نگری)

لے ساغر میں ہر گل یادہ گل فام آتا ہے  
کسی کی خلوتوں میں جام بعد جام آتا ہے  
جسے فرست نہیں دیتے ہیں عیشِ غم کے ہنگامے  
حقیقت تم نہ پوچھو اس متاعِ بے حقیقت کی  
فضائیں گونجتی ہیں اور ہوائیں مقرر تھرتی ہیں  
خدا شاہد کہ یہ سب حیرتِ کرم کے کرشمے ہیں  
مرے نقصِ خودی و بے خودی سے مکلے ڈالو  
میں اس کی تابشوں میں اپنے جلو دیکھ لیتا ہوں  
ہمیں محو و مریستے ہیں تری محفل میں اے ساقی  
سرخ رز لافیں دیکھ کر دل کیوں نہ کھنچ آئیں  
کے تعظیمِ نعماتِ ازل بیدار ہوتے ہیں  
سہ محفل کوئی جب صاحبِ لہام آتا ہے

ام کو تب تیر نہ ہے مے خانہ دل سے

وہیں سے اس کی خاطر یادہ خیام آتا ہے



## تبصرے

**فتوح الغیب اردو** | تقطیع متوسط - ضخامت ۲۲۸ صفحات - کتابت و طباعت بہتر قیمت پر، پتہ :- مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظمہ جاسی مارکٹ حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش)

فتوح الغیب کے نام سے حضرت شیخ عبدالقدور جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال و ملفوظات کا ایک مجموعہ عام طور پر مشہور ہے۔ سب سے پہلے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس کا ایک نسخہ حجاز سے لائے اور فارسی میں اس کا ترجمہ کیا اس کے بعد سے اب تک اس کتاب کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہیں مگر چوں کہ مروجہ تراجم کی زبان سہل نہیں تھی اس لئے اب اس کا ایک اور نیا ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب جس کو مقالات کہا جاتا ہے درحقیقت مقالات معنی اقوال و ملفوظات ہے چنانچہ اس میں بلا کسی ربط و تسلسل کے حکمت و موعظت کی مختلف باتیں یک جا کر دی گئی ہیں چوں کہ اس میں اتباع شریعت اور اتباع سنت پر جگہ جگہ بہت زور دیا گیا ہے اس لئے جو لوگ تصوف میں غلو کے باعث شریعت کے معاملات میں تساہل برتتے ہیں یا اس کو چنداں اہمیت نہیں دیتے ان کو اس سے بہت فائدہ پہنچے گا علاوہ ازیں کتاب میں جگہ جگہ سیاح کی بے ثباتی، یوم آخرت کی اہمیت، ذات باری تعالیٰ کے ساتھ محبت کا دلولہ اور تقائے رب کا شوق اعلیٰ و بلند اخلاق وغیرہ یہ تمام مضامین پائے جاتے ہیں۔ پھر زبان و بیان نہایت موثر اور دلولہ انگیز ہے شروع میں مولانا عبد الماجد دریاباد کے قلم سے حضرت شیخؒ کے سوانح و حالات ہیں۔ جو مولانا کی ایک تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ امید ہے کہ مسلمان اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

# بُرْہَان

جلد ۴۴

شمارہ ۲

اگست ۱۹۵۸ء مطابق محرم الحرام ۱۳۷۸ھ

## فہرست مضامین

- |     |                                       |   |
|-----|---------------------------------------|---|
| ۶۶  | سید احمد اکبر آبادی                   | نظرات                                     |
|     | حضرت مولانا سید منیر حسین صاحب        | مزارِ رحیم بیگ محمد درویش عظیم آبادی شہید |
| ۶۹  | گیلانی رحمۃ اللہ علیہ                 |   |
|     | جناب بیفٹنٹ رنل خواجہ بہتید ارشد حسنا | امیر البحر                                |
| ۹۱  |                                       | خیر الدین باربروسہ                        |
|     | جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب قاری      | عربی کی ایک قلمی کتاب سے                  |
| ۹۹  | استاذِ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی     | تاریخ ہند پر نئی روشنی                    |
|     | جناب پروفیسر نظام الدین ایس گوریکھ    | دنیا کے اسلام                             |
| ۱۰۹ | سحب یہ ہے                             |   |
|     | جناب نثار احمد صاحب فاروقی            | قدوسی و اردو کی چند کیا اب کتابیں         |
| ۱۰۷ |                                       | کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں               |
| ۱۲۳ | جناب تم مضاف نگری                     | ادبیات - غزل                              |
| ۱۲۴ | ع. سر، م. سر، ع. سر                   | تبصرے                                     |





اور خود بخود ہی حاصل کرے گا۔ اور پوری عبادت تو ممتد و متفق ہو کر دین کی ایک عظیم اور آزاد طاقت کی جبنیت سے زندگی بہہ کرے گی۔

یہ نہ بھولنا چاہئے کہ گرجاؤں کی اس تحریک آزادی و استقلال کا سرعنوان قومیت ہے اور وہ  
نیز بھی ہی کہتے ہیں۔ لیکن اس قومیت میں در مغرب کی منسلک قومیت میں بہت بڑا فرق ہے۔ مغرب  
کی مسلمانوں کی قومیت کہتے ہیں اس کا رد مذکور دہشت وطن پر ہے اور وہ ایک ایسا بت ہے جس کی تلک  
یو جھا کرتے ہیں سب سے پہلے عربوں کی قومیت کی بنیاد وحدت مذہب اور وحدت زبان پر ہے۔ اس بنا پر جب کبھی  
مغرب اپنے میں کہ ہماری قوم میں تو اس کا مطلب یہ ملتا ہے کہ ہمارا ایک مخصوص نظام حیات اور دستور  
اور بیعتیں برسرِ قدم ہیں۔ اور قومیت کے لئے نئی جدوجہد کا ایک باواسطہ مطالبہ یہ بھی ملتا ہے  
کہ وہ امت مسلمہ کو صحت اُتران سے زور کر کے پھر اس کی شوکت و عظمت کا پرچم بلند کرنا چاہتے ہیں اس لئے  
عربوں کی اس جدوجہد کا نتیجہ نہ صرف یہ نہیں ہوگا کہ عرب بحقیقت ایک قوم کے آزاد و سرمد ہو جائیں گے بلکہ  
پوری دنیا میں اسلام کی نسبتاً زیادہ تر ترقی ہوگا۔ چنانچہ صدر جماعت اسلامی ناصر علی مرتضیٰ روس نے کہا تھا  
لفظوں سے مراد یہ ہے کہ جو ہر قسم کے خلاف نکال کر دیا، اور کہا کہ یہ سلام میں حرام ہے اس کے علاوہ جو  
لوگوں کو کمزور رکھتا ہو یا کسی اور سے زیادہ ہے اس لئے جو اب میں دوبارہ عدلان کر چکے ہیں کہ یک مسلمان  
اس طرح ٹیسٹ مونیٹس کے سامنے نہ آئے اور وہ عراقی انقلابی حکومت کے وزیر عظیم عبدالکریم  
قاسمی کے مطابق معلوم ہو چکا ہے کہ بڑے مذہبی آدمی اور فاضل روزہ کے پابند ہیں اور ۲۶ اور ۲۷  
بولانی کی زمین فی ملک میں غلوں نے ان کے ساتھ دوسرے دور کرنے جو وعدہ کیا ہے  
اس پر احمدیوں کا تعلق ہے کہ یہ سلام میں

میں موٹیر بٹھ کر آ کر شہر یا شہر کے پاس پہنچا۔ ایک روز میں اسٹریٹ پر ایک بڑا ہندو  
چنگنی نے سب کو دیکھ کر محمد قیاس کی خدمت میں عرض کیا کہ درمیان ان کی کوٹھی پر سناٹا ہے۔  
دونوں ریسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ کہہ رہا تھا کہ ایک پہنچ گیا، دوسرا ہی پریم پر آ رہے تھے، عرب نامک  
کا ذکر کیا تو کہہ صاحب نے نہ لکھی، یہی وہ خاتون صاحبہ پر بڑے دھڑکے کا تھا، وہاں  
لیکن یہ ذکر کرتے کرتے اچانک حقہ نکال کر شہر پر بیٹھ جاتی تھیں کہیں گئے، میں بہ حال یہ اس

نہیں ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ ایشیا کی تمام قومیں آزاد ہوں گی اور اس وقت  
 عرب بھی اپنی عظمت رفتہ واپس لینے کے لئے متحد و متفق ہو کر حیثیت ایک قوم کے بھریں گے اور  
 اُن کی قیادت امر کرے گا۔ میں نے پوچھا کہ مصر تو مغربیت میں سب سے زیادہ ڈوبا ہوا ہے "فرمایا"  
 مصر کا ذہن بیدار ہے۔ اُن کو اسلام سے سچی محبت ہے۔ علوم جدیدہ میں وہ سب عربوں سے زیادہ ترقی  
 یافتہ ہیں۔ اور پھر جسمانی لحاظ سے بھی وہ سب سے زیادہ مضبوط اور تندرست ہیں۔ اس بنا پر قیادت  
 کی صلاحیت سب سے زیادہ ان میں ہے۔ اُن کی مغربیت تو میں اس سے نہیں گھبراتا۔ اگر ذہن  
 مسلمان ہو تو یہی مغربیت اپنی انتہا کو پہنچ کر اور زیادہ بھنگی ایمان کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ خود میرا  
 حال یہ ہے کہ یورپ میں رہ کر اسلام پر میرا عقیدہ جتنا پختہ ہوا ہے ایسا نہیں تھا، آج یہ واقعہ  
 یاد آتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ترجمان حقیقت کی چشم بصیرت نے اب کے تیس سال قبل کس طرح  
 ان واقعات کو دیکھ لیا تھا جو آج پیش آرہے ہیں۔

اسلام کے اعلیٰ ترین تطہیر زنگی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ سیکڑی بد نصیبی یہ ہے  
 کہ کوئی حکومت ایسی قائم نہیں ہے جس نے تمام حیات کا عملی نمونہ پیش کرتی ہو۔ اس بنا پر اسلام  
 صرف ایک "سلفہ" قرار دیا گیا ہے۔ اس میں وہ جذبہ کشش باقی نہیں رہی جو اپنوں اور غیروں کو  
 پوری قوت کے ساتھ متاثر کر سکے۔ کبریا آبادی کے بقول

نہ ہو مذہب میں گرزور حکومت تو وہ مذہب نہیں اک فلسفہ ہے

صرف یہی ایک جذبہ تھا جس کے وجہ سے بہت سے قوم پرور مسلمان زعماء اور علما بھی جوانی و وطن  
 سے محبت بھی رکھتے تھے اور جن کو پروردگار نے دین کے سب سے بڑے قسم کا کوئی عناد بھی نہیں تھا قیام پان  
 کے حامی ہو گئے تھے، لیکن آج اس ملک کے ارباب اقتدار کے ہاتھوں اس جذبہ کو جس مایوسی و دچار  
 ہونا پڑا ہے وہ ظاہر ہے۔ ان حالات میں مشرق وسطیٰ کی طرف سے امید کی ایک کرن پھوٹی ہے۔ کیا  
 عجیبے کہ کل جو قوم قرآن کی دین موعظ و اسلام کی ادین حامل مبلغ تھی۔ تاریخ کے اس دور انقلاب  
 میں پھر وہ بچے اس دیرینہ فریضہ منصب کو ادا کرنے کے باقی ہیں

کہ سمجھنے انقلاب پر خیز گرداں دیں بھی دیکھے ہیں

گدستہ کی زبردست جدوجہد میں ایک بڑی فرزند گدستہ یہ رہ گئی کہ حیدرآباد کے اخبارات  
 کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ حیدرآباد کی خبر اور مجھ سے متعلق دوسری خبریں بھی روزانہ شائع  
 کرتے رہے اس سلسلہ میں صاحب موبوئی منیر احمد صاحب صدیقی خاص طور پر شریعہ کے مستحق ہیں جنہوں  
 نے امر کی نیک نیت سے ایک تقرری نوٹ بھی لکھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حیدرآباد کے اسٹیشن پر کافی  
 حضرات تشریف لائے تھے لیکن جب میں لاہور کی وجہ سے سکندر آباد اسٹیشن پر ہی اتر کر وہاں سے سیدھا

یہ تو یہی ہے کہ ان حضرات کو مایوسی ہوئی میں ان حضرات سے ملنے کے لئے تیار ہوں اور ابابڑ کا تذکرہ کرتے ہیں۔

# مرزا رحیم بیگ محمد درویش عظیم آبادی شہید

۱۲ تہذیب کات

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ)

ہم اس مقام کے بنائے اپنے دوست ٹھہریل صاحب عظیم آبادی کے ممنون ہیں جنہوں نے اُس قدیم و عمیق تعلق کی بنا پر جو حضرت مولانا مرحوم کو ”برہان“ اور اُس کے کارکنوں سے تھا، یہ ممنون و محنت فرمایا ایک وقت تھا کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مضامین سے ”برہان“ کا کوئی تہ مسئلہ ہی سے فاصلہ جاتا تھا، ایک یہ وقت ہے کہ اُن کے مقالات کی دید کے لئے آنکھیں ترستی ہیں، اتنے بے حد اس عالم بے بدنی یا دہرا ہو رہی ہے اور ہم اس تیرک کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

”برہان“

”ہندوستان، خراسان، ماوراء النہر یعنی ترکستان، حلاوت کے سورتا، تاری مہاک کے وہ جتنے تہاں سلام پیا جاتا ہے، اسی طرح حرق جزیرہ عرب، شام، قسطنطنیہ اور ان کے آس پاس مسلمانوں کی آہ دیوں میں اس شخص کا ”بقیہ نبی زبانون پر اس طریقہ کی مدح و ستائش اور دلوں کو اس کی عظمت و عزت کے تر سے بربریہ پڑ گئے ہوگ اس طریقہ کی طرف منسوب ہونے کو سرمایہ افتخار بنائے ہوئے ہیں اور اپنے لئے اس انتساب کو موجب برکت و سعادت خیال کرتے ہیں۔“

سچ تو یہ ہے کہ ذہنی کے دور دست علاقے میں مذہب نصی، اس مہاش تک اس ”بقیہ نبی“ تہہ ہی نہیں چھپی ہوئی ہے، بلکہ ”بقیہ نبی“ کی ”سندھی“ زبانوں میں بھی یہ طریقہ رائج ہو چکا ہے۔ البیانہ الجہنی ص ۹۲

یہ عربی زبان کی مشہور و متداول کتاب اسیانہ جہنی عبارت کا نسخہ ترمیم ہے

سہ تصحیح و تلخیص بندہ نو مسلم و مقنی عربی میں یہ کتاب بہاری کے عہد مولانا محسن سہروردی نے مدینہ منورہ (بقیہ نبی) پر تصحیح کیا ہے



سرزمین ہند میں ہاں بدمعہ کے بعد جہاں تک میر خیال ہے، یہ دوسری شخصیت ہے جس کے دینی و روحانی کارناموں کا چرچہ ہندوستان کے حدود کو چھو نہ کرے۔ ہندو کے ان ساداتوں تک نہیں گیا، جن کا ذکر مذکورہ بالا تاریخ و شیعہ میں کیا گیا ہے۔

یہ آبِ بری دجہا تھی کہی عہد کے مشہور روحانی پیشہ 'سیدنا شیخ محمد مہندی' مجدد الف  
ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی، سے باہرہ تھی حضرت مجدد دہلی (مہدیند) میں پیدا ہوئے  
ایک دن کے لئے بھی ہندوستان سے باہر جانے کا موقع آپ کو نہیں ملا۔

ایک ہزار سال کے بعد جس اسلامی کے مختلف پیروؤں کے متعلق آپ کے تجزیہ اور نقدی کا زمانہ جن سے دنیا کے سلام متاثر ہوئی، سب بندہ تان بی میں انجام دئے گئے، یہ ایک طویل داستان ہے اور سلاقی متاثری تاریخ کا ایک اچھا اور غیر معمولی حصہ ہے۔

جس تحقیق و توحہ کا قدرتی استحقاق مادی تاریخ کے اس صد کو حاصل ہے گو  
اس کا یہ حق اب تک ادا نہیں ہو رہا ہے۔ پچھلے پندرہویں صدی کے کم کرنے والوں کے سامنے  
بچہ چہرے کی بھی تو وہی حد سے زیادہ تشنگانہ ناقص و ناقصہ صورتیں تھیں،  
جیسے جسے دن گذرتے ہی اس کے ہمدردوں میں سے ایک ایک پر یہاں وہیں طریقہ  
سے سنبھال پایا ہے، لوگوں کے سامنے خود اور سرور و سحر و شمع ہوئی چلی جائے گی  
کچھ نہیں تو مضمون کی پیشانی پر جس تاریخ نگار کو میں نے ذکر کیا ہے اس کو پڑھ کر پڑھنے  
والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی قیادت پر اندسی قلمبازوں میں سے کون کون  
(بقیہ ساری صفحہ تشریح) اس کی وہ سند و نشان سے ساری تاریخوں میں سے کون کون  
نیا ہے وہ اس کے ساتھ ساتھ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ  
رضیع ہوئے، مصلحتوں کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ  
ذخیرہ سبکی موجود ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

علاقوں کے مسلمانوں کی ترقی زندگی میں بہت اثر ہوگا۔

اس وقت تک سدا کا زیادہ تر پانچویں سینہ دار اقلیتی میں ہے۔ اسے کیا ہوگا  
یہ تو خدا جانے لیکن واقعہ ہے کہ سدا کے مسلمانوں کے مخصوص وطن ایشیا براہر فریقہ میں  
آپ نے ذکر کیا ہے کہ وہاں درخت مٹا دیئے گئے ہیں اور یہاں سدا کے اس  
منہدی قریب جیسی ہے یہ مجبوراً وہاں نہیں رہ سکتا۔ ہمارے ہاں سدا کے مسلمانوں نے  
پیدا کیا ہے۔ اور جانے کے لئے جاتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی وہاں کے مسلمانوں کے  
کے کام نہیں کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ یہاں پہنچ  
چکی ہے لیکن یہ یقیناً یہ سدا کے علاقوں میں حبس ہو گیا ہے۔ تو اسے تو ابھا جا  
سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ  
اسے تڑپہ ترقی دینی ہے۔ لیکن وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے  
کے لئے اس لئے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ  
جس میں وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے  
معلوم ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ  
فصل ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ  
موسم کے لئے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ  
دن و شب ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ

اس لئے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ  
یہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے  
مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے  
کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ  
اس لئے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں نے کہا ہے کہ

ہندوستان کی تاریخ کا عموماً در اسلامى ہند کی تاریخ کا خصوصاً یہ ایک بڑا اہم سوال ہے جس کے تفصیلی جواب کے لئے تو غالباً دفتروں کی ضرورت ہوگی، سردست اس سوال کے جواب کی صرف ایک کڑی کامیں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ جس کا تعلق ہمارے وطن کی خاک پاک بہار سے ہے۔

واقعہ یہ ہے۔ حضرت شیخ احمد سہبندی مجددِ ملت ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں ہندوستان کے اطراف و اکناف، بلکہ تقریباً ہر صوبہ میں آپ کے خدفا اور پیروں کی کافی تعداد پھیل چکی تھی، اسی زمانہ میں مجددِ صاحبِ حبیب کے تعلقات بہرِ دین ہند کے بعض عداوتوں مثلاً کابل بدخشاں، بخارا، کاشغر وغیرہ کے لوگوں سے قائم ہو چکے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد بھی کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے رہے کہ آہستہ آہستہ ہندوستان کے باہر کے مسلمانوں کی توجہ بھی آپ کی طرف اور آپ کے تجدیدی کارناموں کی طرف کسی نہ کسی شکل میں منسلک ہوتی رہی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خداداد حسن قبول کی نعمت سے آپ نہ فرار تھے۔ اسی سے اندازہ کیجئے کہ تحریری و کتابی شکل میں پھر چند مختصر رسالوں کے ذریعہ ہند کی یادگار صرف آپ کے مکتوبات اور خطوط کا وہ مجموعہ ہے، جو تین صدوں میں درج ہو رہا ہے اور لوگوں میں متداول ہوا، آپ کے یہ خطوط عموماً فارسی زبان میں ہیں لیکن ان ہی کے ساتھ ساتھ ترجمہ مشرقی و روس کے ایک قزاقی مسلمان ملا آدنی نے ان زبان میں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی معتد کتابوں میں حضرت مجدد کے قوں نقل ہونے لگے، جنہیں مشہور بغدادی عالم علامہ شہاب محمود آلوسی کی مشہور تفسیر جو سلطان عبدالغنی تری صیغہ کے عہد میں روح المعالی کے نام سے نو صدوں میں شائع ہوئی ہے، اس تفسیر میں تو مجدد صاحب کے مکتوبات کے حوالہ

لے کابل پر مجدد صاحب کے اثر کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ مرحوم امیر حبیب اللہ خاں والی کابل ہندوستان جب تشریف لائے تھے تو نگرانی حکومت محض ان کی خاطر سے سرہند جہاں حضرت مجدد کا روضہ پاک ہے ایک خاص قسم کی ٹرین کے پہنچنے پر مجبور ہوئی جو صرف ایک ہی مائن پر چل رہی تھی، پہنچتی تھی بعد کو کبھی یہ سلسلہ جاری رہا اب غالباً معمولی دو پیڑی والی مائن کچھا دی گئی ہے ۱۳



سے بکثرت اقتباسات پیش کئے گئے ہیں۔

بہر حال میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجدد دوسرے اسباب کے ایک بڑا سبب جس کی وجہ سے سمجھا جاتا ہے، کہ بیرزن ہند کے اسلامی علاقوں میں طریقہ مجددیہ کا غیر معمولی چرچا پھیلا، وہ یہ ہے کہ شہر زور (علاقہ کردستان) کے ایک بزرگ شیخ خالد کردی اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں شہر زور سے دہلی پہنچے۔ اس زمانہ میں مجددیہ طریقہ کے ایک بزرگ حضرت مولانا غلام علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت مرزا مظہر جاننماں شہید قدس اللہ ترہ کے خلیفہ دہلی میں اس طریقہ کے سب سے بڑے شیخ کی حیثیت سے لوگوں کی تعلیم و تربیت میں مصروف تھے، کل چار واسطوں سے مولانا غلام علی شاہ کا سلسلہ راوت و خلافت حضرت مجدد سے مل جاتا ہے، یعنی وہ مرید حضرت مرزا صاحب شہید کے مرزا صاحب مرید تھے سید نور محمد بدایونی کے دوران کو بیعت تھی شیخ سیف الدین سے، شیخ سیف الدین خلیفہ اور جانشین تھے شیخ محمد معصوم کے یہی شیخ محمد معصوم حضرت مجدد کے فرزند جسمانی اور روحانی تھے۔ شیخ خالد کردی حضرت غلام علی شاہ صاحب کے مرید ہوئے اور دہلی میں (۱) چھپنے قیام کر کے شاہ صاحب کی زیر نگرانی رہ کر طریقہ مجددیہ کے سلوک کی تکمیل کرنے کے بعد باضابطہ سند خلافت کے ساتھ کردستان اپنے وطن واپس ہو گئے، ہندوستان سے واپسی کے بعد لوگوں میں شیخ خالد کردی کی ہر دن غزیری پڑھتے ہوئے اس نوبت کو پہنچی کہ دیکھنے والوں نے لکھا ہے۔

”گویا سلطنت آں دیر با ایشان تسبیح یافت“ ”مگر ضمیر مقامات مظہری

کردستان اس وقت ترکی حکومت کے محروسہ میں داخل تھا۔ چند ہی دنوں میں سارے ترکی مقبوضات عرب، شام، یثرب کو چک قسطنطنیہ وغیرہ میں شیخ خالد کردی کی شہرت پھیل گئی۔ میان کیا گیا ہے کہ

”خلف را ایشان و خلفاء صف را ایشان ہزار ہا کس باشند“ ”ضمیمہ صف

خلفاء کی تعداد ”ہزار ہا“ تک جس کے پہنچے ہوئے ہو، ظاہر ہے کہ اس کے عام مریدوں اور عقیدت مندوں کا حال کیا ہوگا مولانا شبلی مرحوم نے روم و شام کی سیاحت اپنی جوانی میں کی تھی۔ جب جہاز پر قسطنطنیہ جا رہے تھے۔ تو اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ جہاز ہی میں ان کی ملاقات ایک شامی عالم سے ہو گئی، جو رشتہ میں شیخ خالد کردی سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن قسطنطنیہ پہنچ کر دیکھا کہ بڑے چھوٹے، امراء و وزراء عام لوگوں میں ان ہی شامی عالم کو احترام کا ایسا مقام حاصل تھا کہ ان کی وجہ سے خود مولانا شبلی کو اس اجنبی شہر (قسطنطنیہ) میں بڑی آسانیاں میسر آئیں، یہ سارا احترام محض شیخ خالد کردی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کی وجہ سے تھا، اور مولانا شبلی کو ہندی ہونے کی وجہ سے یہ فائدہ پہنچا کہ شامی عالم کے پیروں پر لپکتے کے دس سے ان کا وطنی تعلق تھا، کچھ بھی ہو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ طریقہ مجددیہ کو ہندوستان سے باہر روشناس کرانے میں شیخ خالد کردی ہی کے وجود باوجود کو بہت زیادہ دخل ہے۔ یہاں یہ تاریخی سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیخ خالد کردی تک، اس طریقہ کا ذکر اور مولانا غلام علی شاہ جو دہلی میں اس طریقہ کے سب سے بڑے مرکزی معلم اور شیخ تھے۔ ان کا علم شیخ خالد کردی کو کس ذریعہ سے ہوا اسی سوال کا میں جواب دینا چاہتا ہوں، مولانا شاہ عبدالغنی مجددی جو علماء دیوبند کے بزرگوں کے حدیث میں استاذ ہیں وہی شیخ خالد کردی کے متعلق اطلاع دیتے ہیں کہ اپنے ملک (کردستان) کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔

۱۔ شامی عالم کا نام عبدالفتاح بتاتے ہوئے مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ ان کی اتفاقاً معیت میری تمام کامیابیوں کی دیا چھ تھی۔ یہ بھی مولانا شبلی ہی کا بیان ہے کہ شیخ خالد سے یہاں کے یعنی قسطنطنیہ کے لوگوں کو اس قدر اداوت ہے کہ ان کا نام نہیں لیتے بلکہ ”حضرت“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، شیخ عبدالفتاح شیخ خالد کے بھتیجے تھے، افسوس ہے کہ اس موقع پر مولانا شبلی کے قلم سے بعض خلاف واقعی باتیں نکل گئی ہیں۔ مثلاً شیخ خالد کو مولانا نے نکمہ دیا ہے کہ دمشق کے رہنے والے تھے۔ حالانکہ وہ شہر زور کردستان کے باشندہ تھے اسی طرح شیخ خالد کو مرزا مظہر جانجاناں کا لکھنا ہے کہ مرید تھے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے مرزا صاحب کے خلیفہ حضرت مولانا غلام علی شاہ کے مرید و خلیفہ شیخ خالد محمد کردی تھے ۱۲

”وہ ہر فن استعداد عجیب داشتند“

حتیٰ کہ فارسی اور عربی زبان کی شعر و شاعری میں جو ملکہ شیخ خالد کو حاصل تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

”سبقت از فردوسی و فرزدق بردہ بود“ ص ۲۷

شہر زور میں ان کا مدرسہ تھا، وہیں درس و تدریس کا کام کرتے تھے مگر اسی کے ساتھ

”واعیہ خدا طلبی در سر داشتند“

اب یہیں سے حضرت مولانا عبدالغنی مجددی کی بات سننے کی ہے، فرماتے ہیں کہ جس زمانہ میں شیخ خالد پڑھنے پڑھانے کے مشغلوں میں منہمک تھے کہ

”اتفاقاً مرد مرزا رحیم اللہ بیگ کہ جہاں گشت بود برایشاں شد“

یعنی شیخ خالد کردی کے وطن شہر زور میں مرزا رحیم اللہ بیگ کا گذر ہوا، جو جہاں گشت آدمی تھے شیخ خالد اور مرزا رحیم اللہ بیگ میں ملاقات ہوئی، باتوں باتوں میں لکھا ہے کہ شیخ خالد کردی نے ایک دفعہ

”شکایت از عدم وجدان مرشد نمود“

یعنی اللہ کی راہ بتانے والا آدمی اس زمانہ میں میسر نہیں آتا، اس کی شکایت مرزا رحیم اللہ بیگ سے شیخ خالد کردی نے کی جس کے جواب میں مرزا رحیم اللہ بیگ نے اپنے دہلوی پیر و مرشد حضرت مولانا غلام علی شاہ مجددی کا تذکرہ کیا، مولانا عبدالغنی مجددی نے ارقام فرمایا کہ

بحسن دلالت مرزا صاحب (یعنی مرزا رحیم اللہ بیگ) سب حضرت دہلی (شیخ خالد)

رسیدند“ ص ۲۷ ضمیمہ مقامات منظری، مطلب جس کا یہی ہوا کہ طریقہ مجددیہ کو ہندوستان

سے باہر روشناس تو حضرت شیخ خالد کردی نے کرایا، لیکن شیخ خالد کردی تک اس

طریقہ کا ذکر مرزا رحیم اللہ بیگ کے ذریعہ پہنچا، دوسرے لفظوں میں منطقی نتیجہ اس کا اگر نکالا

جائے کہ طریقہ مجددیہ کا ہندوستان سے باہر جو کچھ بھی چرچا پھیلے۔ لوگوں میں حسن قبول



اس طریقہ کو حاصل ہوا۔ اس کا ایک بڑا ذریعہ مرزا رحیم اللہ بیگ ہی کا وجود تھا، تو اس کے انکار کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

اب یہی مولانا عبد الفتی مجددی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اسی کتاب میں مرزا رحیم اللہ بیگ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

مرزا رحیم اللہ بیگ مسمی بہ محمد درویش  
عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ ترک عداقہ  
روزگار نمودہ بحضرت ایشاں شت فتد  
کسب نسبت نمودند، دیا جائزت  
و خلافت مشرف شدند مشہر ضمیر  
مرزا رحیم اللہ بیگ جو لوگوں میں محمد درویش عظیم آبادی  
کے نام سے مشہور تھے۔ ہر قسم کے روزگار سے بے  
تعلق ہو کر آپ کی (یعنی شاہ غلام علی کی خدمت  
میں) حاضر ہوئے اور (مجدد یہ طریقہ) کی نسبت  
حاصل کی، جائزت اور خلافت کی نعمت سے بھی  
مقامات مظہری

مرفراز ہوئے۔

یہی میں کہنا چاہتا تھا کہ مضمون کی پیشانی پر جس تاریخی حقیقت کو میں نے نقل کیا ہے، جس کو پڑھنے کے بعد بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا تادمہ کے بعد شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی دوسرے بزرگ ہیں، جن کو اور جن کے تجدیدی کارناموں کو ہاتھوں ہاتھ ہندوستان سے باہر دور دست علاقوں میں لیا گیا۔ بجائے خود اس واقعہ کی تفصیل جو کچھ بھی ہو۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ کے اس حصہ پر کام کرنے والے سب کام کریں گے تو ان کو نظر آئے گا، کہ جیسے بدھ اور بدھ کی تعلیمات سے ہمارے سرزمین کا خصوصی تعلق ہے اسی طرح طریقہ مجددیہ کو عالمگیر بنانے میں بھی ہمارے ہی کے خاک کو مانا جائے گا۔ کہ بہت بڑا دخل ہے۔

افسوس ہے کہ مرزا رحیم اللہ بیگ کے متعلق بجز اس بات کے کہ وہ ”عظیم آبادی“ تھے۔ باوجود تلاش و تحقیق کے اب تک پتہ نہ چل سکا کہ براہ راست ان کا گھر عظیم آباد (پٹنہ) ہی تھا۔ یا عظیم آباد کے علاقے کی کسی مسمی آبادی میں وطن تھا، اور دستور کے مطابق لوگ ان کو عظیم آبادی کہتے لگے۔ ان ضمن مرزا صاحب کا بہار سے کیا تعلق تھا۔ اس کی تفصیل اب

تک تشہ تحقیق ہے گزرتی بات یقینی ہے کہ تھے وہ بہر حال عظیم آبادی ہی، اس کے سوا مزار صاحب کے کچھ ذاتی حالات اب تک جو کچھ معلوم ہو سکے ہیں وہ بھی کم عجب بات انگیز نہیں ہیں۔ اب اس کی مختصر داستان عرض کرتا ہوں۔

ہر قسم کے رذکار اور معاشی ذرائع سے قطع تعین کر کے ولی حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خدمت میں مزار رحیم اللہ بیگ حاضر ہو گئے تھے اس کا ذکر تو آپ مولانا عبدالغنی مجددی کے حوالہ سے سن چکے ہیں اپنی اس کتاب میں بھی طالع دیتے ہیں کہ

”ذوالدین حقوق معاف نہ ہند“

یعنی مزار رحیم اللہ بیگ جو اب محمد درویش عظیم آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ نہ غلام علی صاحب سے اجازت و خدمت حاصل کرنے کے بعد بہراپنہ وطن واپس ہوئے والدین اس وقت تک مزار صاحب کے زندہ تھے۔ ان کی خدمت کے جو حقوق تھے ماں باپ سے عرض کیا کہ ان کو معاف کر دیں۔ اور سہ کی رہیں کام کرنے کی اجازت عطا نہ جائے کیوں کہ معافی حقوق کے معنی۔ عبدغنی صاحب نے لکھا ہے کہ

”درآمد معاف و نفی من شکر بخونہ نہ دانستہ“ ص ۳۵

سیدھے سادے الفاظوں میں جس کا مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی مستحبات کی تعمیل پر آمادہ کرنے میں خوف اور خطرے کے خیال کو مزار رحیم اللہ بیگ نے سامنے سے ہٹا دیا تھا، اور اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس نہم کے لئے وہ تھے بھئیے والدین سے حقوق جس خدمت کے ذوق میں مزار صاحب سے معاف کر لئے تھے، یہ خدمت چھپ س نو حیت کی تھی جس میں خوف اور خطرہ کے پیش سے کا مذہب نہ بجا سکتا تھا۔ مولانا عبدغنی مجددی رحمۃ اللہ علیہ کی اس بہن جنہوں نے اس سلسلہ کی روشنی میں جو کتابیں لکھی ہیں وہ سب سوچنے والی اور حق مدار حکمت و عین حق ممدردہ ہوں گے۔ یہ سب سلسلہ میں آتے کے بعد نہ سہرا و رہیں وہ تہمید کردہ گئے۔

(۲) یہ وہ زمانہ ہے جب مشرق پر یورپ والوں کی یورش اپنے عروج کے آخری نقطہ تک گویا پہنچ چکی تھی، ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط عملاً ہو چکا تھا، اسی تسلط کے مقابلہ میں مرزا صاحب کی شہادت کے کل دس سال بعد ہندوستان میں شہ کے شورش ہوئی اور وسط ایشیاء کی اسلامی ریاستوں کو پامال کرتے ہوئے روس دوسری طرف اپنے پنجے کو ان ممالک میں مضبوط کر چکا تھا، بخارا، خیوہ وغیرہ کے امیروں کو روس اپنے زیر اقتدار لا چکا تھا۔ کابل کی طرف للچائی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے ہرات کے علاقہ میں سازش کا جال روسی حکومت بچھا چکی تھی، جس سے انگریز ہندوستان میں خطرہ محسوس کرتے تھے۔

(۳) مرزا رحیم اللہ بیگ محمد درویش عظیم آبادی کے پیر و مرشد اور شیخ طریقہ حضرت مولانا غلام علی شاہ مجددی رحمۃ اللہ علیہ کے اندرونی رجحانات کا پتہ ان کے اس تاریخی مکتوب سے چلتا ہے جو فتویٰ غزیریہ کے مجموعہ میں اس وقت تک شریک ہے اور مطبوعہ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس خط کا قصہ یہ ہے کہ کلکتہ کو اپنا پایہ تخت بنانے کے بعد ہندوستان پر اپنے اقتدار کو مستحکم و مضبوط کرنے کے لئے انگریز جہاں بسییوں الٹی سیدھی تدبیریں کر رہے تھے۔ ان میں ایک تدبیر یہ بھی سوچی گئی کہ مسلمانوں کو مانوس بنانے کے لئے کلکتہ میں "مفتی اعظم" کا ایک امتیازی عہدہ قائم کیا جائے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے اور دلی میں ان کے جانشین برحق تھے۔ اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کے مابین و ملجا وہی بنے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی عمومیت پر شاہ عبدالعزیز کا جتنا اثر تھا۔ اس میں کوئی دوسرا مولوی اقطار ہند میں ان کا ہم مقابل نہ تھا دہلی میں شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ بھی تھا، اور اس کے سوا بھی سارے دینی کاروبار کا مرکز ان کا آستانہ بنا ہوا تھا۔ کلکتہ میں انگریزوں کے کوئی بڑے مسلمان عہدہ دار مولوی رعایت علی نامی تھے جو اس زمانہ میں "مختار کار فرنگی" سمجھے جاتے تھے۔ انگریزی حکومت کے اشارے سے مولوی رعایت علی صاحب یا ضابطہ سرکاری مراسلے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں اس



... مضمون کے مسلسل روانہ کر رہے تھے کہ کسی اچھے مستعد دین دار عالم کو جو رشوت نہ لے، کلکتہ روانہ فرمائے۔ تاکہ ان کو ”مفتی اعظم“ کے عہدہ پر بحال کر کے تمام مقدمات میں ان ہی سے مشورہ لے کر فیصلہ کر دوں، شاہ صاحب نے پہلے تو جواب میں جیلوں والوں سے کام لیا، خود ہی لکھا ہے کہ میں نے مولوی رعایت علی کو لکھا کہ بھائی! تم فرنگیوں کے ملازم ہو۔ ہم جس مولوی کو بھیجیں گے۔ ممکن ہے کہ اس سے تم انگریزوں کی مرضی کے مطابق فتوے لے لو، اس بے چارے کا دین غارت ہو جائے گا۔ اور تم اس سلسلہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتے کہ لو کر ہو، نو کر تو اپنے آقا کے آگے بے دست دیا ہوتا ہے، اس کے جواب میں مولوی رعایت علی نے لکھا کہ مفتی صاحب جو یہاں مقرر ہوں گے۔ ان کو تو انگریزوں کی صورت دیکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ اور مذہب کے خلاف ان سے قطعاً فتویٰ نہ لیا جائے گا۔ ان کو قطعی آزادی حاصل ہوگی کہ اپنے علم کے مطابق مجھے مشورہ دیں۔ اس کا اطمینان بھی مولوی رعایت علی نے شاہ عبدالعزیز صاحب کو دلایا کہ کلکتہ میں ان کو انگریزوں کے عدتہ سے کسی دور جگہ پر مستقل مکان رہنے کے لئے دیا جائے گا۔ اور اپنے اسی مکان میں ٹھہر کر

”پہ موافق شریع محمدی باشد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بے دخلہ و پے دوسراں حکم ناید“

(نقادنی عزیز ص ۱۷۱)

بار بار کلکتہ سے دہلی شاہ صاحب کی خدمت میں مولوی رعایت علی کے مراسلے اسی مضمون کے جب پہنچے تو اپنے مدرسہ کے ایک مستعد لکھ کو جن کا نام مولوی عبدالحی تھا کلکتہ جانے کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی کہ

”مولوی عبدالحی صاحب ازیں جاؤں گا مفسد مضمون نہ دہو ہوم نہ مستند فہم، واپس برہا ستہ

بیابند“ ص ۱۷۲

یعنی کلکتہ پہنچ کر سب کچھ کر کے دہلی کی وجہ سے جن باتوں کا خطرہ ہے اگر یہ خطرہ پیش نہ آئے تو خیر ورنہ فوراً واپس ہو جائیں۔

یہاں یہ خبر کہ شاہ عبدالعزیز نے فرنگیوں کی نوکری کی اجازت مولوی عبدالحی کو دی ہے، آگ کی طرح زلی میں پھیل گئی، شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ مرزا رحیم اللہ بیگ کے پیر و مرشد کو شاہ عبدالعزیز کی اس اجازت کی جب خبر ملی تو آپ سے باہر دھوکے، حالانکہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا غیر معمولی احترام کرتے تھے ان کے علم پر بھی اور دین پر بھی بھروسہ فرماتے تھے۔ جب ضرورت پیش آتی، شاہ صاحب سے ہی فتویٰ پوچھتے، لیکن اس خبر نے ان کو بے تاب کر دیا، اسی وقت قلم اٹھا کر ایک خط شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں رقا م فرمایا ان کے سی کتب گری کہ ذکر کرنا یہ مقصود ہے جس سے ان کے باطنی احساسات از رند و فی رجب نام کا یہ جیسے بہ خط ناری زبان میں ہے ترجمہ کے ساتھ اسے درج کرتا ہوں اصل کتب ناری مولانا علی شاہ مجددی

حضرت سلامت علیکم اللہ تعالیٰ علی رؤس عفا،  
 بالحق یہ الفقیر علی اللہ بعد تسلیم کثیرہ  
 معروض می، ارد گردیں وقت شمس  
 ظاہر نمود کہ در مدرسہ ما فقیہان مذکور  
 ”نوکری کفار فرنگ“ و قبول خدمت  
 اقامی شود خدا اکاہ صحت کہ فقیرا  
 شرف علم و علم رتہ فتنی ہمہ گرد  
 ازین خبر میں فقیر، اسبیتہ صفت نمود  
 مذکور نشینی فقیر، یہ زصد سیلی غنیا  
 بہرگز مولوی عبدالحی صاحب قصد  
 این امر نامبارک تکلفند، بنان پارہ  
 قناعت سب خیر شد فی اللہ بر سر

حضرت سلامت اللہ آپ کو ان فقیروں کے سر  
 پر صحیح و سلامتی کے ساتھ رکھے جو فقیہ کو امیری  
 نے مقابہ میں اختیار کر چکے ہیں بعد تسلیمات کثیرہ  
 یہ عرض ہے کہ بھی ایک شخص نے آکر یہ بیان  
 کیا کہ ”کفار فرنگ“ کی نوکری کا ذکر ہم فقیروں  
 کے مدرسہ میں پتھر و رتہ یعنی مفتی ہونے کی نوکری  
 فیوں کری گئی ہے، خدا جس نے علم کو بڑی اور  
 بنی آدم کی بزرگی و شرافت کا ذریعہ اس کو بنا یا ہے  
 وہی واقف ہے کہ اس خبر سے اس فقیر کو کتنا  
 غم و رافسوس ہو رہا ہے، فقیروں کی خاک  
 نشینی امیروں کی صدر نشینی سے کہیں بہتر ہے  
 بہرگز مولوی عبدالحی صاحب اس (مخوس)

نامیاریک کام کا ارادہ نہ کریں، اپنے آپ کو  
 روتی کے ٹکڑے پر چاہیے کہ قانع بنالیں، اللہ  
 کے واسطے اللہ ہی کی راہ میں طالبِ علموں کو  
 پڑھاتے رہیں اور اپنی زندگی کے اوقات کو اللہ  
 کے ذکر و مراقبہ میں مشغول رکھیں اور اس جگہ میں  
 ہرگز ہرگز تعلق پیدا نہ کریں چاہیے کہ ہم لوگ (دنیا)  
 کو چھوڑ کر اس سے علیحدگی پر دل کو راہنی کریں  
 اور اپنی ہر سانس کو تصور کریں کہ دنیا کی آخری  
 سانس ہے، بس اللہ ہی کے لئے ہم لوگ بن  
 جائیں اپنے بزرگوں، اور سلف صالح کے طریقہ  
 پر آگے در کیا لکھا جائے بجز اس کے پی  
 اس گستاخی کی معافی کا میدد رہوں! اس  
 جگہ یعنی ساہ عید مغربہ کے مدرسہ سے جب  
 ابھی خبر آئی ہے تو دل خوش ہو جاتا ہے، اور  
 ایسی بات جو درویشی کے مناسب نہیں ہے  
 جب ساری خیر می ہے تو دل پریشان ہو جاتا  
 ہے مجھے معذور خیال فرمایا جائے گا اس سے  
 زیادہ اور کیا عرض کیا جائے۔

طالبانِ علم فرمایند اوقاتِ بندہ  
 و مراقبہ معہور دارند دریں جاہرگز  
 ہرگز متعلق بعلاتہ نشوند بہ ترک و  
 تجرید در سازیم و ہر نفس را نفس  
 آخری الگاریم برائے خدا یا شیم بطور  
 بزرگانِ خود سلف صالح خود  
 زیادہ امیدوار عفو گشت خجست  
 و بشنیدن خبر نیک آنجا دل خوش  
 می شود و یا سچہ لائق شانِ درویشی  
 نیست مشوش معذور خواہند  
 داشت نہ زیادہ چہ۔

(فتاویٰ عزیزیہ ص ۹۱)

بجائے خود شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ نام مبارک اس عہد کی تاریخ کا ایک زریں  
 صحیفہ ہے حبیبِ اپنی حکومت کھو چکنے کے بعد مسلمان فیصد کر رہے تھے کہ انہیں بکریا  
 کرنا چاہیے یہ کون جانتا تھا کہ ”نوکری کفار فرنگ“ کا یہی قصہ آئندہ چل کر تنی ہر شب شکل



اختیار کر لے گا، کہ ملک کے باشندے دو مستقل صفوں میں بٹنے کے بعد جو ایک ملک تھا انجام کار اس کو دو مستقل ملکوں کے قالب میں ڈھال کر رہیں گے اور کیسے دو ملک کہ شاید دنیا کے دو ملکوں کے درمیان آنے جانے والوں پر اتنی پابندیاں زمین کے اس خلی کرے پر کہیں نہیں پائی جاتیں، جتنی پابندیاں آج اس ایک ملک کے دو تقسیم شدہ حصوں میں پائی جاتی ہیں، خیر اس قصے کو تو چھوڑے۔ اسی ”نو کری کفار فرنگ“ کے عشق کی آگ میں جو مکت کا امن و امان جل کر بھسم ہوا مالی اور جانی نقصانوں کا طوفان ہی اُبل پڑا ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ شاہ غلام علی نے جس چیز کو ”امیرن مبارک“ قرار دیا تھا اس کی خواست کہاں تک پھلتی ہے اللہ ہی اپنے بندوں پر رحم فرمائے دلا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ بیسویں صدی میں سوچا گیا تھا، اور ترک موالات یا نان کو آپریشن کے جس حربہ کو لے کر ہندوستان بالآخر کھڑا ہو گیا۔ اسی ہندوستان میں ٹھیک اسی ہتھیار کو لے کر کھڑے ہونے والے انیسویں صدی ہی میں کھڑے ہو چکے تھے۔ ان بے چاروں کا منصوبہ اُڑا یا گیا، یہ ہمارے شاہ غلام علی صاحب جو ”نان کو آپریشن“ کے اس زمانہ میں سب سے بڑے علم بردار تھے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ اپنے یہاں آنے جانے والوں کو ابھارتے ہوئے کبھی کبھی فرمایا کرتے

لنگے زبرد لنگے بالہ نے غم دزدنے غم کال

گزک بوریہ و پوستکے دلفے پر ز درد دوستکے

یہی زندگی اس زمانہ میں اختیار کر لینا چاہیے۔ گویا ”نو کری کفار فرنگ“ سے بے نیازی، اور نان کو آپریشن کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاہ صاحب کا مشورہ تھا کہ سی لنگے زبرد لنگے بالہ والے لباس کو اختیار کر لیا جائے (دیکھو خزانہ لاصفیاء ص ۶۹) شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات دہلی میں ۱۲۵۷ھ کی کشمکش سے ۳۳ سال پہلے یعنی ۱۸۲۳ء مطابق ۱۲۴۲ھ میں ہوئی، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر بیسویں صدی میں جو تاشا پیش ہوا، اور آج اسی تدریجی تہاشے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہی کچھ ایسا مضموم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی ہی میں اس

کا خواب دیکھنے والوں کو دکھایا جا چکا تھا، گویا خواب انیسویں میں دیکھا گیا اور تعبیر بیسویں  
 صدی میں پوری ہوئی، بہر حال اس وقت حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی رجحانات  
 کے جس پہلو کو میں پیش کرنا چاہتا تھا اس کے لئے مذکورہ بالا مکتوب گرامی کافی ہو سکتا ہے  
 وہ اپنے وقت کے بڑے آدمی تھے۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ ہندوستان ہی نہیں ہندوستان  
 سے باہر کے رہنے والے بھی دورِ در سے ان کی خدمت میں آکر مستفید ہونے تھے شیخ خالد  
 کریم بیرون ہند سے آنے والوں میں تنہا نہیں تھے۔ ان کے سوا بھی آخوند شیر محمد ساگل محمد  
 عزیز نوی، مولوی ہراتی سید عبداللہ مغربی مولوی عبدالکریم ترکستانی وغیرہم آپ کے مشہور خلفاء  
 تھے جو دق سے کسب کمال کے بعد واپس ہوئے۔ آپ کے ایک مشہور خلیفہ مولانا محمد جان  
 نامی مکہ معظمہ میں مقیم تھے اور شیخ حرم کے نام سے مشہور تھے۔ اسی کے ساتھ آپ کا دربارِ مسلم  
 غیر مسلم معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا تھا، ضمیر مقامات منظر ہی میں ایک دوسرے  
 لطیف برہمن زادہ کا نقل کیا ہے، جو کافی جمیل و شکیل تھا خدمتِ دہلی میں حاضر ہوا اس  
 کی شکل و صورت دیکھ کر حضرت زنا کور حمہ آگیا نکھا ہے کہ ایک خاص نظر سے اس کی طرف  
 دیکھا، اسی وقت از زیور کلمہ شہادت بیا راست و حسن را از نور اسلام جلا داد“ ص ۱۱  
 کچھ بھی ہو، مرزا رحیم تنہا بیک محمد درویش عظیم آبادی پر رنگ اپنے پیر کا اتنی شدت سے  
 چڑھا ہوا تھا کہ دنیا بھر میں پھرنے پھرنے کے بعد بھی کہتے تھے کہ مثل شاہ غلام علی شیخ نیا فتم  
 ص ۲۵ ضمیر مرزا صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے والدین سے حقوق معاف کرانے کے بعد دلی  
 واپس ہوئے کلیم سیاہ پوشید، یعنی ”بیک کالا کبیل“ یہی ایک سامان سفہ تھا،  
 لیکن اس کبیل کے نیچے جو کچھ تھا۔ خزانہ لا صفیا رکے اس فقرے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے  
 ”در علوم ظاہری و باطنی طاق و یگانہ آفاق بود“ ص ۱۲

اندر علوم ظاہری و باطنی کے سبب یہ کونٹے ہوئے زپر سے کائے کبیل کو ڈالے ہوئے لکھا ہے  
 کہ دلی سے روانہ ہوئے اور

”اکثر بلاد اسلام مثل روم و شام و حجاز و عراق و مغرب و ماوراء النہر و خراسان و ہندوستان سیر نمودند ۳۵ھ ضمیمہ

خزنیۃ الاصفیاء میں ہے کہ ”تمام ہندوستان رانیر زیر قدم آورد، صلت حاصل جس کا یہی ہوا کہ ہندوستان کے ایک ایک صوبہ اور علاقہ میں بھی گھومتے رہے اور ہندوستان کے بعد ایشیاء و اقلیقہ کے اسلامی ممالک کی سیر میں بھی محمد درویش عظیم آبادی مشغول رہے۔ ٹھیک اس زمانہ میں جب برصغیر اور روس کے درپاٹوں کے درمیان اسلامی ممالک پسے جا رہے تھے شاہ غلام علی کے خلیفہ محمد درویش عظیم آبادی کا ان ہی ملکوں میں گھومنا اور صرف گھومتے پھرنے نہیں بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک کے ان حکمرانوں سے جو حد سے زیادہ بے بسی کی زندگی گزار رہے تھے ان سے سی عظیم آبادی درویش کا عموماً تعلق قائم ہو جاتا تھا۔ مولانا شاہ عبدالغنی مجددی نے لکھا ہے کہ ہرات کا اس زمانہ میں جو ولی تھا، اور نام اس کا کامراں تھا آپ کے مخلصوں میں شریک ہو گیا تھا، سی طرح تو قندخو واجب پہنچے تو وہاں کا حکمران بھی آپ کا عقیدت مند بن گیا، یہی نہیں شاہ عبدالغنی نے آگے لکھا ہے کہ

”ہم چنیں دیگرواۃ ترکستان قاشیر بردوس ایشاں شدند“ ۳۵ھ

اسی سلسلہ میں بالآخر وہ شہر ستر پہنچے، شہر ستر ہرات کے علاقہ کا مشہور زرخیز حصہ کامر کرے شہر تھا، لکھا ہے کہ وہاں کے حکمران سے بھی ”سی عظیم آبادی کل پوش فقیر کا ایسا قوی ربط قائم ہو گیا کہ اس نے اپنے علاقہ میں تیم پر آپ کو مجبور کیا اور یہ کہ

”دیہہ کالاں نذر نمود“

کوئی بڑا گاؤں اسی سیر حاصل خطہ میں جو کشتزاروں اور باغوں، نہروں سے بھرا ہوا تھا

لے ہرات مشہور شہر ہے بجانب جنوب زرخیز جانے والی سڑک پر یہ شہر واقع ہے پہلے اس کو ”سفزار“ کہا کرتے تھے، بعد کو اسی کا نام سبزہ دار ہو گیا، سی نام کا ایک شہر کشاپور کے پاس بھی تھا، اس لئے اس کو سبزہ دار ہرات کہتے تھے۔ لیکن آج کل اب صرف شہر ستر کے نام سے موسوم ہے سزمانہ میں یہ علاقہ سیر حاصل زمینوں اور باغوں کے لئے مشہور تھا باغوں میں انگور، نارنگی، کھربوز، بیک دریا ہر وہ سببست ان اس علاقہ میں پاتا ہے جس کے سرچشمے شہر ستر ہی کے قریب ہیں (دیکھو جغرافیہ خذنت مغربی، مصنف جی بی، ستر پانچ کا ترجمہ ص ۲۴)



ان کو بطور جاگیر ہی کے نہیں دیا گیا بلکہ گے مولانا شاہ عبدالغنی کے جو یہ الفاظ ہیں کہ  
 ”تین حکومت خود ازاں دیہ برداشت“

اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ مرزا رحیم اللہ بیگ کو اس ”دیہ کلاں“ کی حکمرانی سپرد کر دی  
 گئی تھی، مرزا صاحب نے اسی میں جیب کہ خزانۃ الاصفیاء میں ہے

شیخ ذرا آغا خانقاہ ہے بنا کر دیا، و مدت  
 مسافریں و مساکین بزمہ خود گرفت  
 و لنگر کلاں انداخت و طعام بکثرت  
 می پخت و بصارد و وار و تقسیم  
 نمود ص ۱۶۰  
 شیخ یعنی مرزا رحیم اللہ بیگ نے ایک خانقاہ تعمیر کی اور  
 مسافروں مسکینوں کی خدمت کرنے لگے، بہت  
 بڑا لنگر خانہ جاری کیا، بڑی مقدار میں کھانے  
 پکواتے اور آنے جانے والوں میں اس کھانے کو  
 تقسیم کیا کرتے تھے۔

مولانا عبدالغنی مجددی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ شہر سبز کے اسی علاقہ میں قیام کرنے  
 کے بعد، نکاح بھی اس ملک کی کسی خاتون سے اسی عظیم آبادی درویش نے کر لیا تھا (ص ۱۶۱)

خزانۃ الاصفیاء کے مصنف نے اسی سلسلہ میں یہ خبر بھی دی ہے، کہ

”کہتر ہا در ترکستان سے کرد، و فرس و دیار ہر ایک مقام، خدمت میں می آمدند“ ص ۱۶۱

لیکن اسی کے ساتھ ان ہی لوگوں کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ شہر سبز کے حکمران کے صوا  
 و زامہ حب و محوم کی کسی میاں و زانیہ سے بنی نہیں، کیوں نہیں بنتی تھی؟ اس کی وجہ وہی تھی  
 کہ ان مسلمان امیروں کو اسلامی مطابقت کی تمسک کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ مولانا عبدالغنی  
 مجددی نے اسی وجہ کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ

”از مہر و نجیدہ شہر دہری آمدند“

تو تھانہ یعنی خیوہ کے فرس و زانیہ سے بھی نجیدہ ہو کر خیوہ کو انھوں نے چھوڑ دیا تھا۔ ص ۱۶۱ یہی شہر سبز  
 کا وہی ایسا آدمی تھا، جو اول سے خزانۃ الاصفیاء کا ہم نوں رہا۔ خزانۃ الاصفیاء میں ہے کہ مرزا صاحب  
 نے شہر سبز کے اس دیہ کلاں میں جب قیام اختیار کر لیا تو شہر سبز کے اس کے جو دشمن تھے وہ

”بہ سبب دعار واداد حضرت مرزا صاحب برو دست نی یافتند“ عتق

جس سے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ترکستان جن سیاسی حالات سے اس زمانہ میں گزر رہا تھا۔ اُسی سلسلہ میں کچھ ایسی صورتیں پیش آگئی تھیں کہ شہر سبز کے والی کے لوگ مخالفت ہو گئے تھے۔ اور مرزا صاحب دعار ہی سے نہیں بلکہ دعار کے سوا دوسرے طریقوں سے بھی اس کی مدد کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ کچھ دنوں نے حد سے زیادہ اجمالی اشاروں سے کام لیا ہے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ شہر سبز کے والی اور ترکستان کے دوسرے حکمرانوں میں اختلافات کی نوعیت کیا تھی؟

انیسویں صدی کے وسط میں روسی حکومت ترکستان میں جو کچھ کر رہی تھی اس کی تفصیلاً سے جو واقعات ہیں، وہ جانتے ہیں کہ آخری مقام جہاں سے میر کابل کے مقبوضات میں زمین تیار کرنے کی کوشش روسی حکومت کر رہی تھی۔ بظاہر ہندوستان ہی کی طرف اس کا رخ تھا، یہ مقام سرت ہی کے آس پاس کے خطے تھے۔ یقینی طور پر تو کچھ کہنا مشکل ہے، لیکن ذہن سوچنے والوں کا گروہ منتقل ہو کہ شہر سبز کے والی اور محمد زوش عظیم آبادی یعنی مزار حیم شریگ میں رفاقت اور باہمی انداد کی بصورت جو پیش آگئی تھی، ممکن ہے کہ اس کا تعلق کچھ اسی روسی برطانوی سازشوں سے ہو، برطانیہ بھی اور روس بھی فغانستان، ترکستان کے ساتھ میر وں کو ننگال کا جعفر اور دکن کا صادق بنا چکے تھے، اور کچھ تعجب نہیں کہ مرزا صاحب کے سوا خٹکوں نے جو یہ لکھا ہے کہ ”بعض حکام ترکستان کہ از والی شہر سبز غبار داشتند ایشاں را (یعنی مزار حیم شریگ را) باخفا قتل کنند“

(۲۵) غیر مقامات منظری

یہ بعض حکام ترکستان، ترکستان کے کوئی جعفر یا صادق ہوں، اور یورین حکومتوں کے اشارے سے پٹنہ کے اس کسل پوش فقیہ کو بحالت غریب و مسافرت وطن سے دور

”شہادت رسائند عتق“ (خزینۃ المصنفیاء)

میر دست محمد خاں جو روس کے زیر اثر ہو گئے تھے، انگریزوں نے ان کو معزول کر کے شاہ شجاع کو کابل کا امیر بنادیا تھا

کچھ نہیں معلوم کہ شہر سبز کے اس علاقے میں اب بھی اس عظیم آبادی درویش کی کوئی یا دگار کم از کم مزار وغیرہ ہی کی صورتوں میں پائی باقی ہے یا نہیں، بزرگی اور عظمت و احترام کے لحاظ سے دستور کے مطابق چاہیے تو یہی کہ ان کی خانقاہ وغیرہ نہ سہی لیکن مزار مشہور ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہم مزار رحیم الشریک کی سوانح عمریوں میں ایک اور چیز بھی جو پاتے ہیں، یعنی شہر سبز کے علاقے میں مقیم ہو جانے کے بعد لکھا ہے کہ

”مذہب شافعی اختیار نمود“

اور یہ کوئی چھپی ڈھنکی بات نہ تھی مولانا عبد الغنی مجددی کا بیان ہے کہ

”لہذا دربخارا وغیرہ ملقب ایشان بہ شافعی مستند“ ص ۳۵

خرنہ ال اصفیاء میں ہے کہ ان ہی ترکستانی علاقوں میں

”باسمہ ذلت لعی شہار یافت“

جیسا کہ معلوم ہے کہ ماوراء النہر و ترکستان کے برسرے مانگ جہاں اہل سنت یا سنی مسلمان آباد تھے۔ حقیقت میں ان لوگوں کا غلو حد سے گذرا ہوا تھا۔ یہی صورت میں اس کٹر حنفی قلمرو میں عظیم آباد کے ”بزمِ شافعی“ اگر بھڑکے گئے ہوں، تو یہی غلاظت توقع واقعہ شایہ نہیں ہو سکتا۔

باقی یہ مسئلہ کہ مرزا صاحب دھرم جن کے سلسلے برسرے منشاخ حنفی المذہب تھے بلکہ طریقہ مجددیہ کے بانی حضرت مجدد الدلت ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی حنفیت پر جو غیر معمولی صراحت تھا۔ اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے آخر ان کے شافعی بن جانے کی ضرورت یا مصححت کیا تھی؟

کوئی تفصیلی جواب اس سوال کا بھی سب کتابوں میں نہیں ملتا ہے۔ بظاہر یہ خیال گذرتا ہے کہ دنیا کے عام مذہب میں یہ حادثہ جو پیش آیا جی مذہب کی بنیادی کتابوں سے دور ہوتے ہوئے آخر میں ایسی کتابوں پر ناکارہ ہو کر رہ گیا۔ جس کی حقیقت بنیادی کتابوں کے



مقابل چنداں قابلِ لحاظ نہ تھی مثلاً ہندوستان ہی میں دیکھئے ویدک دھرم کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے وید ہے، وید سے کچھ علی تناسخ و کلیات نکالے گئے کہ جو اپنشد کے نام سے مشہور ہوئے وید سے زیادہ اہمیت اپنشدوں کو حاصل ہو گئی۔ پھر شاستروں کا دور آیا اور اپنشدوں سے بھی توجہ ہٹ گئی، شاستروں کے بعد پرانوں کا دور شروع ہوا اور ان ہی پرانوں میں ویدک دھرم کے ماننے والے مختلف فرقے ڈوب گئے، آخر زمانہ میں تو صورت حال یہ ہو گئی کہ سنسکرت زبان کی دورِ زمیہ نظمیں رامائن، ورہا بھارت، یہی لوگوں کا اوڑھنا بکھونا بن گئیں۔ وہ تو خیر یورپ میں سنسکرت زبان، اور ہندوستانی علوم و فنون کے مطالعہ کا ذوق جب سے بیدار ہوا ہے تو ایک ”نئی نشارت“ کا ویدک دھرم میں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دنوں سے آغاز ہوا ہے اور وید اپنشد شاستر س کا ذکر اور مقوڑا بہت مطالعہ کا رواج ہندوستان میں شروع ہوا ہے۔ تفصیل کا تو موقع نہیں ہے مختصر یہ ہے کہ اسلام میں بھی زیادہ دنوں کے بعد نہیں بلکہ دوسری صدی ہجری کا درمیانی عہد تھا، اس زمانہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جوانی کے زمانہ میں بغداد پہنچ کر دیکھا کہ جامع بغداد میں جیسے درس کے حلقے قائم ہیں جس حلقہ میں بھی پہنچے ان ہی کا بیان ہے کہ اساتذوں اور شاگردوں کی زبانوں پر نہ قال اللہ تھا اور نہ قال الرسول یعنی کوئی نہ قرآن ہی کا حوالہ دیتا تھا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث پیش کرتا تھا۔ بلکہ جو بھی تصادف اپنے استادوں کے اجتہادی تناسخ سے کا ذکر کر رہا تھا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ انجام اس طریقہ کار کا آخر میں کیا ہونے والا ہے اس پر امام شافعی کی توجہ مبذول ہوئی اس کے بعد پورے غم و رنجتہ ارادہ کے ساتھ وہ کھڑے ہو گئے فیصد کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے میں مسلمانوں کو اپنے دین کے بنیادی سرچشموں (دہان و حدیث) سے بچنے اور دور ہونے نہ دوں گا، اسی مہم کے سر کرنے میں اپنی ساری عمالہ شائع نے حدوتہ مادی ن کے زمانہ تک قرآن و حدیث سے جو کچھ اجتہادی تناسخ نکالے گئے تھے۔ سب ہی نے بے دردی کے ساتھ انہیں تنقید کی اس باب میں اپنے استاذ اعظم

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی بھی پروا نہ کی جس کی داستان طویل ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ  
 قایم کی ہوئی سنت وقف وقف سے مسلمانوں میں زندہ ہوتی رہی اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں  
 میں جیسے مذہبی کاروبار کرنے والی اور دینی راہوں سے آمدنی پیدا کرنے والی کوئی خاص نسل اس  
 لئے پیدا نہ ہو سکی کہ شروع ہی میں اس کا انسداد کر دیا گیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہی  
 کے متعلق اس کا خطرہ ہو سکتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر خیرات دان پن، بخش،  
 وغیرہ آمدنیوں کو اپنی اولاد اور اپنے قریب رین رشتہ داروں کے خاندانوں میں پیدا ہونے والوں  
 پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام کر دیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کا مذہبی تاریخ میں مذہبی طبقہ کو  
 ”کلیب“ جیسی کوئی چیز پیدا کرنے کا موقعہ اگر نہ ملتا تو سر حال ہے کہ اس میں حضرت امام شافعی  
 رحمۃ اللہ علیہ ہی کے طریقہ عمل کو دخل ہے، دوسری صدی ہجری نبوی ہی سے امام شافعی نے بعد حجاز  
 ذہنیت رکھنے والے لوگ وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں اُٹھتے رہتے اور مذہبی طبقہ سے مطابقت  
 رہے کہ مسلمانوں میں جس دین کو تم لگ پھیلا رہے ہو، اسلام کی بنیاد پر اس میں خدائے  
 کے تعمیری معیار پر اس کو حایج کر دکھاؤ ایک روایت ہے جس کا مفہوم امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ  
 نے اپنے زمانہ میں ڈال دی، حسب ضرورت راج زندہ ہو رہا ہے یہاں یہاں رہتا ہے  
 مجدد الدین عظیم آبادی ترکستانی علاقوں میں شافعی کے نام سے جو مشہور ہوئے اس میں  
 ان کے اسی حجاجی اور تنقیدی مطالبات ہی کو دخل معلوم ہوتا ہے، کہیں کہیں بھی ہو  
 اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ باوجود ان اہتیاظوں کے مسلمان بھی محسوس کرتے رہتے  
 ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں کہ ہر وہ کتاب جو فقہ کے نام سے لکھی گئی۔ اس نے بھی اہل  
 وثوق کا یہ مقام مسلمانوں میں حاصل کر لیا ہے کہ ان کے لئے یہاں سے روایت کے  
 متواترات کے سوا کسی چیز کو حاصل نہیں کیا جاسکتا کہ ترک مذہب کی بدولت  
 یہ حدود بل در ترکستان وغیرہ میں ایک مہمونی فقہی جڑیں زبیر سے جو غنہ جدید ہیں برپا  
 لہ سی نام میں بیٹھ کر نجات پڑھتے ہوئے شہر کے موافق برپا لہ سی نام میں بیٹھ کر نجات  
 لہ سی نام میں بیٹھ کر نجات پڑھتے ہوئے شہر کے موافق برپا لہ سی نام میں بیٹھ کر نجات

اہل علم اس سے واقف ہیں گویا کوئی ایسی صورت پیش آ جاتی تھی کہ ہر وہ شخص جو ہم سے پہلے  
 مذہب یا دین کے نام سے کچھ سمجھ کر مر گیا، وہی ہمارا دین بن جاتا تھا آج کل کلچر کے لفظ کا  
 جادو جس کام کو انجام دے رہا ہے، بہ بُری پہلی بات، حد سے زیادہ احمقانہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن  
 صرف اس لئے کہ والد مرحوم یاد ادا جان ہی کرتے تھے، کچھ کا نام دے کر اس زمانہ میں بھی اصرار کرنے  
 والے صرار کر رہے ہیں درکیسا اصرار؟ حالانکہ ہم میں ہر شخص چند ہی سالوں کے بعد خود ہی  
 داند مرحوم اور دادا جان بن جائے گا فحہ حاصل کر لیتا ہے۔ والد یاد ادا جان ہو جانا سمجھ میں  
 نہیں آتا کہ کسی خبر کی صحت اور سچائی کا معیار کیسے بن سکتا ہے، بشری مبینوں میں بھی والد مرحوم  
 اور دادا جان جتنے چلے جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے بہرحال ”پر وہمت“ اور ”کلیسا“ وغیرہ  
 قسے مسلمانوں میں نہیں پھرتے ہیں آئے لیکن سی کے ساتھ اخطا و تنزیل کے زمانہ میں یہ تو سنا جاتا  
 ہے کہ امیہ ججزہ کی داستان تک بعض حد تک میں مذہب کی مقدس کتاب کی حیثیت سے پڑھی  
 جاتی تھی، اور یہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ معجزہ بنی، قصہ شہ روم، نور نامہ  
 کا پاٹ لوگ شفا حاصل کرنے کے لئے رہے ہیں گویا ان نظموں کے ایک ایک شعر کی حقیقت  
 ناصح حجت کی تھی۔ پچھلے دنوں ہندوستان میں اس حدیث یا غیر مقدسیت کی تحریک سچ پوچھئے تو  
 مرزا حیات شاہ سیگ محمد درویش عظیم آبادی کے شافعی مذہب بن جانے ہی کی ایک شکل تھی، جس میں رازیا  
 غلو اور تشدد پیدا ہو گیا تھا، بجائے خود یہ تحریک جو کچھ بھی ہو، لیکن اس کو تسیم کرنا چاہئے کہ اپنے دین کے  
 اساسی سرچشموں (قرآن و حدیث) کی صورت تو ہندوستان کے حنفی مسلمانوں کی جوڑی اس میں ہیں  
 حدیث اور غیر مقدسیت کی اس تحریک کو بھی افسوس ہے۔ عمومیت غیر مفید تو نہیں ہوئی، لیکن تعلیم یافتہ  
 اور کورانہ عقائد کا تسلیم ضرور ہوگا۔ جب تک کہ اصلاح و تجدید کی اس ضرورت کی طرف بل حدیث  
 والی تحریک سے پہلے اس بہاری درویش کا ذہن متعزز ہو۔ اور اسی میں جہاں تک میرا خیال ہے ان  
 کی شکیبیت کا راز غالباً مستور تھا، فتحِ حرمات علیہ

۳۔ گذرے ان لوگوں سے لہذا اس کے مرزا حیات شاہ سیگ کے متعلق کچھ جانتے ہوں تو مجھے یاد فرمادیں کہ کوئی اصل حجب کی شہادت نہ کر سکا ایک سو چار سال کی عمر گزرتی ہے کہ جس خاندان سے  
 ان کا تعلق تھا ابھی اس کے افراد باقی ہوں اور خاندان کے ایک بزرگ کی حیثیت سے ذکر آواز ان کا کیا جاتا ہو چکی حکومت (انڈین یونین) کا کابلی سفارت خانہ بھی چاہے تو بہار کے اس عزیز سید شہید

(بقیہ صفحہ گذشتہ) کے کتب خانے سے معلوم ہوتا تھا کہ کئی ٹھکانا نہیں چاہیے، اسی فقرے پر اصرار کرتے والے...  
 ... اصرار کرتے تھے وہ... تھا، پتا بھی واقف ہے کہ جب وہ کتاب کی انکھیں پوڑ دی گئیں یا ترش لی گئیں، علامہ  
 رشید مصری نے... دست جن مدینوں سے پوچھا انھوں نے اس کا انکار کیا، ہر سالہ مضمون جن لوگوں کی نظر



## امیر الحجہ

### خیر الدین یاز برو

(جناب یٹنڈٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب)

مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ حکومت اسپین اپنے آخری دموں پر تھی۔ سو اہویں صدی عیسوی کا آغاز تھا اور مسلمانوں کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں، بلکہ مسلمان کا اخراج اس جزیرہ نامے شروع ہو چکا تھا۔ باوجود ان حالات کے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہسپانیہ پر قبضہ حاصل کرنے کی جو جدوجہد کی وہ تاریخ میں جستہ جتہ کہیں کہیں ہمیں رنگین الفاظ میں ملتی ہے۔ مگر یہ واقعات اس قدر منتشر اور پھیلے ہوئے ہیں کہ ہمیں ان کا یکجا کہیں بھی نشان نہیں ملتا۔ اس جدوجہد کا ایک پہلو صرف اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اور وہ مسلمانوں کے بھری کارنامے ہیں جن کا بین کرنا یہاں مقصود ہے۔

سو اٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جہاں ایک طرف ہم ہسپانیہ سے مسلمانوں کو نکالتے دیکھتے ہیں دوسری طرف ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ترکوں کی حکومت شمالی افریقہ میں ہر طرف پھیل گئی تھی اور ترکوں نے بک عجیب تازگی کے ساتھ نہ صرف ہسپانیہ کو واپس لینے کی کوشش کی بلکہ اردیا کے غصب شدہ ممالک بھی حاصل کرنے کا اہتمام کیا۔ تاریخ کم از کم ایک واقعہ ایسا ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جب کہ ترکوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ حیل الطارق کو فتح کر لیا۔ مگر انھیں اسے چھوڑنا پڑا کیوں کہ بڑی فوجوں کی طرف سے انھیں کوئی امداد بردقت نہ پہنچ سکی۔ اس مہم کے بعد خیر الدین یاز برو سے تھے جنہیں تاریخ میں یاز برو سدودم کے نام نامی سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے سلطان سنیم اول و دوم، دونوں کا زمانہ پایا سے مگر

ان کے کارنامے زیادہ تر سلیم دوم کے قیام سلطنت سے متعلق ہیں۔

ترکوں کی فتوحات مجدد، یگر مقارنات کے شمالی افریقہ میں تونس، مراکش، فیصل طرابلس اور البیڑیا کو بھی حاوی کئے ہوئے تھیں۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سے طارق اور طارق نے اپنے حملہ آور دستے ازلین مرتبہ کھڑے کئے تھے جنہوں نے اسپین کو فتح کیا۔ یہ یاد رکھنے کے قابل امر ہے کہ طارق سے پہلے طارق اسپین پر حملہ آور ہو چکا تھا اور مقام طارق پر اپنا بیڑا اتار چکا تھا۔ اس کے بعد طارق نے جہاں طارق کے مقام پر قبضہ کیا اور اسپین میں گھس گیا۔ چنانچہ ستہ تین جن لوگوں کو سہاسنیہ (Saraceno) کہتے ہیں وہ اسی علاقے کے لوگ تھے۔ تو پھر منہ متعجب کیوں ہو جو ہم اس وقت تاریخ کو دہرا جانے دیکھ رہے ہیں۔ فی یہ وہی لوگ ہیں جو ازسرنو جنگ آزادی میں ہمہ تن مشغول ہیں اور اندلس اور شبیلہ کی سین و دیوں میں ازسرنو قبضہ جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ درکہ عجب جو یہ پھر اپنی کھڑی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر لیں۔ ع ذرا فتنہ ستہ تینساں دوبارہ بند۔۔۔۔۔ کی تعبیر معنی کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچ جائے۔ تازہ بخشد خدائے بخشنده !

قدنوں پر اس سے خاندان کے متعلق بہت سی روایات ہیں۔ ہم پہلے ان تمام روایات کو مختلف خدوں سے مستعارے کر یکجا کرتے ہیں اور پھر اپنی رائے کا اظہار کریں گے جو ان روایات سے مختلف ہے۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ خیرالدین باریروس کا بڑا بھائی بے پہل مسدود ہوا۔ یہ ایک یونانی لاسل شخص تھا جو جزیرہ مسٹی میں کاروبار کرنے والا تھا۔ اس کا بیٹا باریروس تھا۔ اور مسٹی کے برتنوں کی تجارت کیا کرتا تھا خیرالدین کے بڑے بھائی کو نامہ ہورش تھا۔ دراسے ہونا بابا ہورش کہا جاتا تھا۔ سب سے پہلے اس کی بیوی تھی۔ اس کی سہیلی خدیجہ تھی۔ ہورش کی عمر اس وقت ستائیس سال تھی جب وہ سفیون اسداسہ ہوا۔ ہورش ہی باریروس اول

کہا جاتا ہے اور یہی وہ اڈل باربردسہ تھا جس نے بحیرہ متوسط میں مسلمانوں کا دبدبہ قائم کیا۔ ایک نظر یہ یہ ہے کہ اسی نام بابا ہورش کی وجہ سے یہ باربردسہ کہلایا۔ یہ نام اس کو عیسائیوں نے ہی دیا تھا جن کے لئے یہ ایک ہتوا بنا ہوا تھا۔ اور وہ اس سے بہت ڈرتے تھے۔ اس نظریے کی تصدیق ایک اور مقام سے بھی ہوتی ہے۔ کیپٹن والسین نے اپنی تاریخ میں کچھ ایسا ہی لکھا ہے مگر وہ ہورش کے بجائے عروج کا نام تجویز کرتے ہیں۔ اسی طرح رینگ، ڈیوس نے جو مقالات ۱۸۳۶ء میں شائع کئے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ عیسائیوں نے یہ نام محض خیر الدین کو ہی دیا تھا نہ کہ ہورش کو۔ مگر انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کا یہ بیان ہے کہ اس خاندان کا مورثا اسی ایک شخص یعقوب نامی تھا۔ جس کے چار بیٹے تھے۔ الیاس، عروج، اسحق، درخضر۔ اور ان چاروں میں سے عروج اور خضر ہی تھے جنہیں ہورش اور خیر الدین کہا جاتا ہے۔ برٹینیکا کے اس بیان سے کم از کم یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ چاروں بھائی ایک مسلمان باپ کے بیٹے تھے اور ان میں سے کوئی بھی حلقہ بگوش اسلام نہ ہوا تھا بلکہ پیدائشی مسلمان تھے۔ ہماری تحقیق کے مطابق باربردسہ کے نام کی وجہ تسمیہ یہ نہ تھی کہ یعقوب کا کوئی بیٹا اس نام سے منسوب ہوا کیوں کہ اس کی سرخ ڈاڑھی تھی، بلکہ یعقوب خود ایک باربردسہ خاندان کا ذرہ تھا جس نے خود یا اس کے آباء و اجداد نے دین اسلام کو قبول کیا۔ ہمیں تاریخ میں اور اسی مقام پر، جہاں کا یعقوب باشندہ تھا، ایک باربردسہ خاندان کا تہ ملتا ہے۔ کم از کم ہم اس کے ایک نزد سے بخوبی آشن ہیں کیوں کہ اس نے تیسری صیہبی جنگ میں صلاح الدین ایوبی کے خلاف اڑائی کی۔ اس کا نام فریڈرک باربردسہ ہے۔ یہ تیسری صیہبی جنگ ۱۱۸۷ء میں

History of the Turkish Rule in Armenia by Captain  
Lalain Osterhazy 1840

Anat. Chronick by J. Hany & Davis 1837

Encyclopaedia Britannica

Intellectual development of Europe by William Anderson



ہوئی۔ اور فریڈرک دوران جنگ ہی میں یروشلم کے قریب ایک قبیل کو عبور کرتے ہوئے  
 ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس جنگ میں صلاح الدین ایوبی نے یروشلم پر مکمل قبضہ کر لیا۔ ہمارا  
 خیال ہے کہ مورخین کو باربروسہ خاندان کے تعین میں سہو ہو گیا ہے۔

باربروسہ ذل عیسائی مورخین نے ہورش کو بحری قزاق کہا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ کیوں  
 کہ شروع شروع میں جب ہورش نے اپنا سکہ جاری کیا تو یہ نصرانی بیڑوں کو لوٹا کرتا تھا۔ اس  
 کا بدنام بحیرہ متوسط میں پھیرا ہوا تھا اور عیسائیوں کے جنگی بیڑے اس کے قریب سے  
 گذرتے بہت گھبرایا کرتے تھے۔ ہورش کا قاعدہ تھا کہ یہ ساحل کے ساتھ ساتھ اپنے  
 جہازوں کو لئے گھومتا پھرتا رہتا تھا درجہاں کہیں یہ عیسائی جہاز تجارت کا مال لے  
 جاتے اسے نظر آتے۔ یہ نفس لوٹ لیتا۔ ممکن ہے کہ اس کا ذریعہ موش شروع شروع میں  
 ہی رہا ہو، کیوں کہ بالآخر اس کو بھی تو اپنے ساتھیوں کا پیٹ پالنا تھا۔ در اپنے جہازوں  
 کی مرمت اور تعمیر پر دیر نہ صرف کرنا ہوتا تھا۔ اس کا یہی دبدبہ تھا جس کی وجہ سے عب  
 اور ترک سپاہی جوق در جوق اس کے ساتھ شامل ہوتے چلے جاتے تھے اور اس نے  
 ایک بڑا مضبوط بیڑہ بنا کر لیا تھا۔ اس کے ن کارناموں کو دیکھ کر صنعت ترکیہ نے  
 سے بحری قیادت کے لئے ممتاز کر لیا در سلطان سلیم اول نے اس کو میر البحر کا عہدہ سونپ  
 دیا۔ چنانچہ اس زمانے سے یہ ترکوں کے بحری بیڑے کا مکمل اندر مقرر ہوا۔ اس ہورش کو  
 اولین مرتبہ میر البحر کا عہدہ دیا گیا۔ وہی وہ لفظ ہے جس سے بعد میں انگریزی کا لفظ ایڈمیرل  
 (Admiral) تخیل کیا گیا۔ اس کے بعد اکتسی نوجوان بھی تاس تھے۔ امیر البحر بن جانے  
 کے بعد ہورش نے تیونس کی بندرگاہ عونیتہ کو اپنا بیڑہ کوارٹر بنایا، وہاں کہ یہ جگہ چاروں  
 طرف حملوں کے لئے ایک بڑی بہتر تھی، اس نے پے در پے مشرق و مغرب  
 کی طرف حملے کرنے شروع کر دیے۔ جس سے ایک تہلکہ مچ گیا۔ عموماً یہ یہاں سے اکتسی  
 ساحل پر حملے کرتا۔ کیوں کہ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ کسی طرح اسپین پر حملہ آور ہو کر اس

## پر قبضہ کر کے۔

ان تمام حملوں میں اس کا چھوٹا بھائی خیر الدین ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا اور ہورش کے نائب کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں خیر الدین کی ٹریننگ کا بھی سلسلہ جاری رہا، خیر الدین نے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اور اپنے بھائی کی وفات کے بعد یہ اس کا جانشین منتخب کیا گیا کہ اس سے بہتر و تجربہ کار اور کوئی امیر بھرنے کے قابل نہ تھا۔

اس زمانے میں مول محمدؒ، تونسہ گورنر ہوا کرتا تھا۔ اور یہ ہورش کو اسپین کے خلاف ہر قسم کی امداد دیا کرتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عیب نیوں نے مسلمانوں کو اسپین سے نکالنا شروع کر دیا تھا اور وہ ایک کثیر تعداد میں ہجرت کرنے لگ گئے تھے۔ انہی دنوں میں ہورش نے الجزائر سے نام میں نیوں کو نکال بھیجا تھا۔ دوران کے ساتھ متعدد جنگیں کی تھیں ایک ٹرائی کے دوران میں ہورش کا ایک بازو کاٹ گیا۔ یہ واقعہ شہ کا ہے جب وہ بوجل کے مقام پر ان سے ٹرہا تھا۔ تشہ میں اس نے مسلمانوں سے تھوڑی و مقام سے یہ۔ مگر اس کی ن کامیابیوں کو دیکھ کر مول محمدؒ کچھ حسد کرنے لگ گیا اور جو امداد وہ دیا کرتا تھا اس سے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ مگر ہورش زار و راندیش نہ بن سکا۔ وہ جانتا تھا کہ عیب نیوں پر اگر کسی کا رعب و دبدبہ ہے تو وہ اسی کا ہے اور وہ اس سے خوف زدہ تھے، اس لئے اس نے مول محمدؒ کو تونس سے مار بھیجا اور وہاں خود قلعہ بھیج دیا۔ تشہ میں اس نے اپنے آپ کو وہاں کا حکمران مول محمدؒ کا اعلان کر دیا۔ در ایک خود مختار سلطان کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ اپنی دار الحکومت کے حدود میں نے قبضہ تک کر لیا۔ اب مسلمانوں کو در خطر لاحق ہو گیا جب انہوں نے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھی۔ چنانچہ تشہ میں انہوں نے ایک بہت بڑی بھڑی فوج اس پر جمع کرنے کے لئے بھیجی۔ ہورش اس ٹرائی میں دلیری سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ یہ مقام رقی و سردو (Raqi & Sardu) تھا۔ مگر ہورش کی شہادت کے بعد اس کا چھوٹا بھائی خیر الدین اس کا جانشین مقرر ہوا اور اس نے بڑی خوش اسلوبی

سے اس حمد کو روک دیا۔

باربردوسہ دوم خیرالدین باربردوسہ جب اپنے بھائی کی جگہ پر مقرر ہوا تو ایک آزمودہ اور تجربہ کار قائد تھا۔ حکومت عثمانیہ نے فوراً اس کی قیادت تسلیم کر لی اور اسے امیر البحر کا عہدہ عطا کیا۔

چنانچہ یہ اپنے بھائی کی جہوں کو از سر نو تازہ کرنے میں مشغول ہوا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بحری بیڑے کو ترتیب دیا۔ خیرالدین باربردوسہ اپنے بھائی پرورش سے بھی زیادہ عیسائی حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہوا۔ بحری جنگوں میں اس کی مہارت ایک جانی بچپانی بات تھی

اور عیسائی حکومتیں اس سے بخوبی واقف تھیں۔ ۱۵۱۹ء میں جب سلطنت عثمانیہ نے سے بطور قائد قبول کیا تو اول اول اس کو البحر یا کاکورنر جنرل مقرر کیا۔ اس زمانے میں البحر یا کا حدود اربعہ کچھ آج کل کے البحر یا سے زیادہ مختلف تھا۔ ۱۵۳۲ء میں اس نے تونس کو زمرہ نو

فتح کر لیا جو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ تونس کی فتح کے وقت سلطان سلیم نے اسے کپتان پاشا کا منصب عطا کیا۔ نین پول بھی اس میں تصدیق کرتا ہے۔ گزہری

دانست میں جو خطاب اس کو اس وقت ملا وہ کپتان دریا کا اعزازی عہدہ تھا۔ اس کا اصل نام ترک زبان میں قیوتان دریا تھا اور اسی سے انگریزی لفظ پتان تخلیق کیا گیا ہے۔ قیوتان دریا کا ترجمہ کیپٹن آف دی سیز ہوتا ہے (Captain of the Seas)۔ اور اسی کے ہی معنی ہیں

امیر البحر جہوں سے لفظ ایڈمیرل (Admiral) مرتب کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں۔

اس زمانے سے ترک بحری طاقت بحیرہ متوسط پر کنٹرول کر رہی تھی۔ اور کوئی بھی یورپین طاقت اس قابل نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کر سکتی۔ یہ ایک عجیب حقیقت ہے جو عام مورخین کی نگاہ سے پوشیدہ رہی ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی بحری طاقت گھٹنا شروع ہو گئی

اور چار سو برس کے لئے یک خداید ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مختلف ممالک مسلمانوں

1 Ency. Brit

2 Muhammedan Dynasties By Lane Poole.

3 Russo Turkish War Vol. II London.



کے ہاتھوں سے نکلے چلے گئے۔ الحمد للہ کہ نانا باب پھر ملپٹا کھاربا ہے اور تاریخ نے اپنے آپ کو ڈھیرانا شروع کر دیا ہے۔ ترکستان، مصر، پاکستان، اور ایران کے بحری بیڑے تیار ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اس وقت ان میں اتنی توانائی تو نظر نہیں آتی تاہم ان کی از سر نو ترتیب شروع ہو چکی ہے اور کیا عجب جو چند ہی سال میں یہ مجموعی بیڑہ اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرے۔ تانہ بخشہ خدائے بخشنده! اور ان کا گذشتہ ذقار پھر عود کر آئے۔

بحری کارندے | خیرالدین باربروسہ نے عنانِ قیادت سنبھالتے ہی پے در پے یورپین سواحل پر حملے شروع کر دیے۔ اور اس سرعت سے جزیرہ نما اسپین کو دوسرے عیسائی ممالک سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا کہ عیسائی حکومتیں نگشت بدنداں رہ گئیں۔ چنانچہ روما اور اٹلی سے انھیں اپنے بیڑوں کو ہسپانیہ کی حفاظت کے لئے فوری طور پر طلب کرنا پڑا۔ خیرالدین باربروسہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ جبل طارق کو واپس لے کر ہی دم لے گا۔ اور اس کے بعد اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اسپین میں گھس کر اس پر قبضہ کرے گا مگر اس نے یہ حمد مستوی کر دیا جس کی چند ایک وجوہات تھیں۔ مگر اس نے اپنے اس منصوبے کو خفیہ راز میں نہیں رکھا۔ خود اس کے اپنے سپاہی اس کے اس عزم سے واقف تھے اور عیب کی بھی جانتے تھے کہ یہ آج یا کل حملہ آور ہو جائے گا چنانچہ انھوں نے پورے زور شور سے تیاری کرنا شروع کر دی تھی۔ خیرالدین باربروسہ کے پاس تمام وہ سپاہی اکو جمع ہو گئے تھے جو اسپین سے ہجرت کر کے آ رہے تھے اور اسے ہر قسم کی خبریں فراہم کر رہے تھے، اس لئے اس کو اسپین کے تازہ حالات سے مکمل شناسائی تھی۔ مگر چند در چند وجوہات کی بنا پر اس نے فوری طور پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اپنا بحری بیڑہ ترتیب دیتا رہا۔ سے بری فوجوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی جو ساحل پر اترنے کے بعد اس کی مدد کرتیں شاید یہی وجہ تھی جو ہر حمد مستوی کرتا چلا گیا کہ مناسب تعداد میں بری فوجیں تیار نہ ہو سکتی تھیں۔

بالآخر ۱۴۹۲ء میں اس نے اپنی فوجوں کو انجریا سے سمیٹ کر بحری بیڑہ تیار کر کے

جیل الطارق پر حملہ کر دیا۔ عیسائیوں نے یہاں دفاع کا بخوبی بندوبست کر رکھا تھا اور دو تین زائد بحری بیڑے بھی اٹلی وغیرہ سے منگوائے ہوئے تھے۔ ڈان برنارڈو دی مینڈوزا (Don Bernardino De Mendoza) جو ان کا سسلی (صقلیہ) میں امیر البحر تھا اس کو بھی انہوں نے منگوا بھیجا ہوا تھا۔ چنانچہ مئی اگست ۱۵۶۰ء کے روز خیر الدین باربروسہ نے اللہ کا نام لے کر حملہ کر دیا۔ اور آٹا فائنا تمام عیسائی بحری بیڑوں کی آنکھوں میں دھول ڈالتا ہوا دس دن کے قلیل عرصہ میں جیل الطارق کے دروازے جا کھٹکھٹے۔ اس کے پاس اس وقت صرف سولہ جہاز تھے۔ یک ہزار سپاہی تہا ز چلانے پر مامور تھے اور دو ہزار لڑنے کے لئے سپاہی تھے! خیر الدین باربروسہ بغیر کسی دقت کے ساحل پر اتر گیا۔ شہر کے لوگ اس قدر سہم گئے کہ انہوں نے اپنے آپ کو شہر کی چار دیواری کے اندر بند کر لیا اور ہتھیار ڈال دئے مگر افسوس کہ بری فوج کی مدد نہ ہونے کی وجہ سے اس کو محمڈ بڑھا دینی پڑی۔ ورنہ کون کہہ سکتا ہے کہ مسند تاج بھی جزیرہ ناسپین پر حکومت کر رہے ہوتے۔

خیر الدین باربروسہ دوئم نے شکست میں وقت پائی اور ان کے بعد ان کا لڑکا حسن ان کا جانشین مقرر ہوا۔ یہ بھی باپ کے نقش قدم پر چلا مگر وہ دوست عثمانیہ کا تارہ غروب ہو گیا تھا۔ بحیرہ متوسط میں اس کی نقل و حرکت کو بڑی تک پہنچی، اور یہ بیڑہ رفتہ رفتہ نابود ہوتا چلا گیا۔ ع۔ چہ گوشت کر با تیموریان چہ افتاد دست!

History of Gibraltar By Sayan London 18۵2

## خلافت راشدہ

حصہ دوم تاریخ ملت :- عہد خفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات قدیم و جدید عربی تاریخوں کی بنیاد پر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب کالجوں و اسکولوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ جدید ایڈیشن صفحہ ۳۷۶ قیمت غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد تین روپے بارہ آنے۔

# عربی کی ایک قلمی کتاب سے

## تلدِ تَخ ہند پر نئی روشنی

۱۲

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فاضل استاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی (دہلی)

(۲)

شیخ مبارک نے کہا: میں بڑی بڑی فتوحات میں سلطان (محمد بن تغلق) کے ہم رکاب رہا، مختصر اُکچھ چشم دید حالات بیان کرتا ہوں۔ سلطان نے سب سے پہلے تلنگانہ فتح کیا، یہ وسیع مملکت ہے، اس میں نو لاکھ نو سو گاؤں ہیں۔ اس کے بعد جاج نگر (انڈیسیہ)، جہاں ستر شاندار شہ ہیں سب کے سب سابعی سمندر پر۔ جاج نگر کی آمدنی کا ذریعہ جواہرات، ہاتھی، مختلف قسم کا سوتی پٹا، عطر اور خوشبودار جڑی بوٹیاں ہیں۔ اس کے بعد لکھنوتی (بنگال) کو مسخر کیا، یہاں نو راجاؤں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد دیوگیر (دواکیر) کو جہاں چوراسی زبردست قلعے ہیں: "شیخ برہان الدین ابوبکر بن خلیل بڑی کی رائے ہے کہ دیوگیر میں بارہ لاکھ گاؤں ہیں، اس جگہ مقصد کے بعد اب ہم شیخ مبارک کا بیان جاری رکھتے ہیں: دیوگیر کے بعد سلطان نے دور سمند کی ریاست فتح کی، یہاں سلطان بلال دیوادر پانچ غیر مسلم راجاؤں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد مغیرہ علاقہ فتح کیا، اس شاندار ریاست میں نوے ہندو گاہ ہیں، اس کی آمدنی کا غصہ سطریات، خوشبودار اشیا، سے کپڑوں، سوتی پارہ اور غنیمت کی عمدہ اور نادر مصنوعات پر ہے۔



فقہ علامہ سراج الدین ابوصفار عمر بن اسحاق بن احمد شبلی عوصنی نے جو  
ہند کے صوبہ عوص (اودھ) کے باشندے اور ممتاز فقہار کے اُس زمرہ سے ہیں  
جو سلطان دہلی کی خدمت میں رہتے ہیں، بیان کیا کہ بادشاہ کی عمل داری میں  
تیس <sup>۲۳</sup> بڑے صوبے ہیں :- (۱) دہلی (۲) دیوگیر (دداگیر) ۳۔ ملتان ۴۔  
کھرام (کھران) ۵۔ سامنا ۶۔ سیوستان (سومناٹ) ۷۔ مچ (وجا) ۸۔ ہاسی  
(ہاسی) ۹۔ سرستی ۱۰۔ مئیر ۱۱۔ بننگا (تلنگ) ۱۲۔ گجرات ۱۳۔ بدائوں  
۱۴۔ عوص (اودھ) ۱۵۔ قنوج ۱۶۔ مکھنولی ۱۷۔ بہار ۱۸۔ کرہ ۱۹۔  
مالوہ (ملاق) ۲۰۔ لاہور (لہاور) ۲۱۔ کلانور (کافور) ۲۲۔ جاجنگر ۲۳۔  
تلنج ۲۴۔ دورا سمندر (دور سمندر) ۲۵۔ صوبوں میں بارہ سو بڑے شہر ہیں  
جہاں سلطان کے نائب رہتے ہیں۔

میں نے شیخ مبارک سے دہلی، اس کی بناوٹ اور نظام حکومت، کے  
بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ کئی شہروں کا مجموعہ ہے جس کے  
سر شہر ایک مستقل اور جاذب وجہ نام ہے لیکن عملاً دہلی کا اطلاق سارے مجموعہ  
پر ہونے لگا ہے، دہلی حوں و عرض میں دور تک پھیلا ہوا ہے، اس کی  
آبادی کا دور چالیس میل ہے۔ عمارتیں پتھر اور اینٹ کی ہیں، چھتیں لکڑی  
کی درختوں سے جیسے ایک سفید پتھر کے۔ دہلی کے مکان زیادہ سے  
زیادہ دو نہایت ہوتے ہیں، درمیان میں صرف شاہی عمارتوں میں لگایا جاتا ہے۔  
شیخ ابو جبر بن خلیل نے کہا کہ یہ پُرانی دہلی کے مکانات کا خاکہ ہے، دہلی میں  
جو نئی بستیاں وجود میں آئیں، ان کے مکانوں کا انداز مختلف ہے۔ اس وقت  
دہلی کا حلقہ کسٹ شہروں پر ہوتا ہے (یہاں باغ ایک سیدھے خط پر  
برابر برابر لگائے گئے ہیں، ہر خط کی لمبائی مشرق، شمال اور جنوب میں بارہ

میل ہے، مغربی سمت میں باغ نہیں ہیں۔ (اصناف زفوٹو نسخہ ۲/۱۹۲) وجہ یہ ہے کہ مغرب میں کہا بہ پہاڑ دہلی سے قریب ہیں۔ دہلی میں ایک ہزار اسکول ہیں، ان میں ایک کو چھوڑ کر جہاں شافعی فقہ کی تعلیم دی جاتی ہے باقی سب حنفی مذہب ہیں۔ بیمارستان یا ہسپتال نہیں، یہاں بیمارستان کو داراشفا کہتے ہیں۔ دہلی اور اس کے ماتحت علاقوں میں دو ہزار خانقاہیں و مراعات ہیں، شہر میں بڑی بڑی عمارتیں، لمبے چوڑے بازار اور بڑی تعداد میں حمام ہیں شہر کا سارا پانی تھلے کنیروں سے نکالا جاتا ہے، ان کی گہرائی زیادہ سے زیادہ چوڑد فٹ ہوتی ہے اور ہر کنویں پر چرخیاں لگی ہوتی ہیں۔ پینے کے لئے بارش کا پانی جو بڑے بڑے حوضوں میں جمع ہو جاتا ہے، استعمال کیا جاتا ہے، ہر حوض کا قطر تیر کی مسافت کے بقدر یا اس سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں وہ جامع مسجد ہے جس کا منارۃ اذان مشہور ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر بلندی میں اس کی نظیر نہیں۔ شیخ برہان الدین بن خلال بڑی صوفی کی رائے میں قطب مینار کی اونچائی تقریباً بارہ سو فٹ ہے (چھ سو ذراع) شیخ مبارک نے کہا: دہلی میں تغلق شاہ کے جو محل اور کوٹھیاں ہیں وہ ان کے در ان کی مستورات کے لئے مخصوص ہیں، ان میں ان کی باندیوں، محبوب کنیزوں، نوکرانوں اور غلاموں کے بے کمرے ہیں۔ بادشاہ کے ساتھ کوئی خان یا امیر نہیں رہتا۔ یہ فوجی افسر صرف آداب بجالانے کا حصہ ہوتے ہیں، پھر بے گھر ہوں کو بوٹ جاتے ہیں، آداب و کورنش کے بے دن میں وہ بار حضوری ہوتی ہے، صبح کو اور بعد عصر۔ فوجی افسروں کے عہدوں کی ترتیب اس طرح ہے :- سب سے اوپر خان، پھر ملک، پھر امیر، پھر اعظمدار، پھر سپاہی۔ سلطان کی نوکری میں استی یا زیادہ خان ہیں اور شکر نو لاکھ سو روپوں پر مشتمل ہے، ان کی ایک مقررہ تعداد دہلی میں رہتی ہے اور باقی ممکت کے دوسرے حصوں میں۔ ساری فوج کو سرکار

سے تنخواہ ملتی ہے اور سب پر بادشاہ کے لطف و کرم کا سایہ ہے۔  
 سلطان کے لشکر میں ترک، خطا، فارس، ہند اور دوسرے ملکوں کے  
 لوگ شامل ہیں۔ ہندی فوج میں دو جنگجو قومیں قابل ذکر ہیں: بھالیوں (بھیل؟)  
 اور شطارو (چھتری؟)۔ ساری فوج گھوڑوں، اعلیٰ قسم کے بتیاریوں اور  
 شاندار دردیوں سے بس ہے۔ کثر فوجی افسر اور سپاہی فقہ سے دلچسپی لیتے  
 ہیں اور کسی خاص فقہی مسلک سے وابستہ ہیں، لیکن عام مسلمان فقہ حنفی کے پیرو  
 ہیں۔ سلطان کے پاس تین ہزار ہاتھی ہیں جو جنگ کے وقت لوہے کی سنہری پوش  
 (پرکھڑوان) پہنتے ہیں، دوسرے اوقات میں مختلف قسم کے رشیم اور کارچوب  
 کی جھولوں میں ملبوس ہوتے ہیں، ان کی پیٹھ پر محل اور تخت بنا کر ان کو سجایا  
 جاتا ہے، تخت پر کیسیں بٹ کر لکڑی کے برج بنائے جاتے ہیں اور ہندی سونام  
 ان محلوں اور تختوں پر بیٹھ کر رٹتے ہیں، ایک ہاتھی پر اس کی طاقت اور جُست  
 کے لحاظ سے چھ سے دس تک آدمی سوار ہوتے ہیں۔ سلطان کے ہتھی ہزار  
 ترکی غلام ہیں: ہر بقول ترسی (تبی؟) دس ہزار خستی لونڈے بھی۔ اس کے علاوہ  
 ہزار خرنڈار (؟)، ہزار بشمقدار (؟)، اور دو لاکھ ایسے مسلح غلام (۵/۱۲)  
 ہر بہ وقت سلطان کے ہم رکاب رہتے ہیں اور اس کے آگے لڑتے ہیں۔ سلطان  
 کے خان، ایک، مہاراجہ، صفہدار اپنے سپاہیوں کو گزارے کے لئے جائدادیں  
 نہیں دیتے جب نہ تمام اور مہاراجہ میں دستور ہے بلکہ ہر فرد کو گزارے اور ہتھیار  
 کے لئے تنخواہ ملتی ہے۔۔۔۔۔ خان کی کمان میں دس ہزار سوار ہوتے ہیں،  
 ملک کی کمان میں ہزار، مہاراجہ کی کمان میں سو، اور صفہدار کی کمان میں اس سے  
 کم۔ ان سب فوجی فسرانوں کو سالانہ سے جائدادیں ملتی ہیں جن کی آمدنی فوج کے  
 مقررہ کوٹے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ کثر خرچ کے تخمینہ سے دو چاند جائداد





ہیں جو اس کے اور اس کے حرم کے کپڑے تیار کرتے ہیں اور خلعتیں بناتے ہیں جو سلطان کی طرف سے 'ازباب دولت' اور ان کی خواتین کو عطا کی جاتی ہیں۔ ہر سال تعلق شاہ دس ہزار عربی گھوڑے بانٹتا ہے، ان میں سے کچھ زین و لنگام کے ساتھ دئے جاتے ہیں اور کچھ بغیر زین و لنگام کے۔ زین اور لنگام والے گھوڑوں کی قسمیں ہیں: ان میں سے کچھ کو محض پوشش یا وردی دی جاتی ہے اور کچھ پوشش کے علاوہ زیور سے بھی آراستہ ہوتے ہیں، بعض وژیوں پر چاندی کا کام ہوتا ہے اور بعض پر سونے کا، اور بعض کے زیور چاندی کے ہوتے ہیں اور بعض کے سونے کے، عربی گھوڑوں کے علاوہ ترکی یا دو غلے گھوڑوں کی داد و دہش شمار سے باہر ہے۔ باوجودیکہ سلطان کی سلطنت میں گھوڑے خوب ہوتے ہیں، اور بڑی تعداد میں باہر سے بھی درآمد کئے جاتے ہیں، لیکن چوں کہ وہ گھوڑے بننے میں بڑا فیاض ہے، اس لئے ہر ملک سے گھوڑے منگاتا ہے اور اس مد میں بڑی رقمیں صرف کرتا ہے، اور چوں کہ ہند میں شاسی داد و دہش کے علاوہ، بڑے بڑے لشکروں کی ضروریات اور ملک کی بڑھی ہوئی آبادی کے زیر گھوڑوں کی مانگ زیادہ ہے اس لئے یہاں گھوڑے بہت ہنگے ہوتے ہیں اور ان کے ناجر خوب نفع کدے ہیں۔

تجزین کے اُن رئیس تاجروں میں سے جو سلطان کو عربی گھوڑے فراہم کرتے ہیں، ایک بڑے تاجر علی بن منصور عقیلی نے مجھے بتایا کہ ہند کے لوگ عمدہ گھوڑے کی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں، اس پہچان والے گھوڑے کو وہ ہر قیمت میں خرید لیتے ہیں۔

سید محمد بن تعلق کا بڑا وزیر (نائب) ایک خان ہے جس کو 'میرت' کہتے ہیں، اُس کی سرکاری جائداد حکومت عراق سے کم نہیں ہوگی، سلطان

کا ایک وزیر ہے جس کی جائداد بھی عراق کے لگ بھگ ہے۔ بادشاہ کے چار  
 وزیر نائب ہیں جن میں سے ہر ایک کو 'شیخ' کہتے ہیں، اور ہر ایک کا مشاہیر میں  
 ہزار تنکہ سے لے کر چالیس ہزار تک ہے، سلطان کے چار دبیر یا سکریٹری ہیں  
 ہر سکریٹری کو حکومت کی طرف سے بڑی آمدنی والا ایک بندرگاہ ملا ہوا ہے۔ ہر  
 سکریٹری کے تحت تین سو کارکون کا عملہ ہے، صفِ آخر کے کلرک کی تنخواہ  
 دس ہزار تنکہ (دس سو نو سو) ہے، صفِ اول کے کلرکوں کو سرکار  
 کی طرف سے گاؤں اور جائدادیں ملتی ہیں، بعض کے پاس پچاس پچاس گاؤں  
 ہیں۔ صدر جہاں یا قاضی القضاۃ کس الدین بن بربان کی جائداد دس دیہاتوں  
 پر مشتمل ہے جن سے قریب ساڑھے ہزار تنکہ آمدنی ہوتی ہے، قاضی القضاۃ کو  
 صدر الاسلام بھی کہتے ہیں، شیخ الاسلام یا شیخ الشیوخ کی جائداد بھی اسی قدر  
 ہے، تختہ نشین کا مشاہیر ایک گاؤں ہے جس سے سولہ سو تنکہ منہ رکنے، صول  
 ہوتے ہیں۔ سلطان کے بارہ سو طبیب ہیں، دس ہزار یزدان، یہ گھوڑوں  
 پر سوار ہوتے ہیں۔ بارہ سو دھاتے ہوئے پرندوں سے شکار کھینچتے ہیں۔ تین سو  
 آدمی شکار ہکاسے پر، مور میں، ندیوں کی تعداد پانچ سو ہے، انے بچنے والے  
 بارہ سو ہیں، یہ تعداد ان نہر، خدمتوں کے علاوہ سے چونکہ اس طور سے گانا سلکھنے  
 کے لئے رکھے گئے ہیں۔ تہی دیار میں ایک ہزار بیعت ذوق۔ بی، فارسی اور  
 سندھی کے شاعر ہیں۔ سناسی ذات کے، سواران کو سولہ سو سے تنخواہ بھی ملتی  
 ہے۔ سلطان کا کوئی گویا اگر کسی خیر کو کائنات سے تو اس کو موت کی سزا ہی  
 جاتی ہے۔ مؤلف کہتا ہے کہ میں نے شیخ مبارک سے کائنات بچانے والوں کی  
 تنخواہ دریافت کی تو انہوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مذہب کی تنخواہ بتا سکتا  
 ہوں: کسی کو ایک گاؤں، کسی کو دو، اس کے علاوہ علی حسب مراتب ہیں



ہزار تک سے تیس اور چالیس ہزار تک نقد روپیہ اور خلعتیں، جوڑے اور عین (۹) شیخ مبارک نے کہا: سلطان محمد بن جنق کے دسترخوان پر صبح شام بیس ہزار آدمی کھانا کھاتے ہیں، ان میں خان، ملوک، امیر، اصفہلار، اور فوج کے دیگر اکابر بھی ہوتے ہیں۔ دسترخوان خاص پر سلطان کے ساتھ دو سو فقیہ ہوتے ہیں جو مختلف مسائل پر اس کے سامنے جٹ و مباحثہ کرتے ہیں۔ شیخ ابو یوسف بن خاں بڑی نے کہا کہ میں نے تہہ ہی پورجی سے یو جھاک ہر دن کتنی راسیں ہوتی ہیں تو اس نے بتایا: ”ڈھائی سو گائیں، دو ہزار بکریاں، ان کے علاوہ گھوڑے اور قسم قسم کے پرند بھی کاٹے جاتے ہیں“ شیخ مبارک نے کہا: سلطان کی مجلس میں صرف بڑے فوجی فہرہ حاضر ہوتے ہیں یا وہ سپاہی جن کی موجودگی ناگزیر ہو۔ اسی طرح بادشاہ کی مجلس خاص میں صرف بڑے فوجی افسر حاضر ہوتے ہیں یا وہ سپاہی جن کی موجودگی ناگزیر ہو۔ اسی طرح بادشاہ کی مجلس خاص میں مذہب اور گویئے ملک ساتھ نہیں آتے بلکہ باری باری سے، اور اسی طریقہ پر سکریٹری، طبیب، ورن کے دوسرے ہم رتبہ عمل کرتے ہیں، شاعروں کی باریابی مخصوص تقریروں اور تقریروں پر ہوتی ہے جیسے عید رمضان اور عیدِ حج یا نئی فصل کے وقت یا رمضان پر، یا فتح کی خوشی پر یا کسی ایسی تقریر پر جب بادشاہ کو مبارک باد، مدح پیش کی جائے بیوں اور فوجی معاملات کا انتظام وزیر اعلیٰ یا عدلیت کے ہاتھ میں ہے۔ ہندی اور نووارد فقہار اور عالموں کے تمام معصرت کا پنچارج سد جہن سے اور شیخ اسلام، ہندی و نووارد درویشوں کے معصرت کا، ہندی و نووارد عام افراد اور اسی طرح ہندی و نووارد شعراء کے ناظم مور سکریٹری ہوتے ہیں۔

قاضی، نقضہ ابو محمد حسن بن محمد غوری حنفی نے مجھے بتایا کہ سلطان محمد

بن تثنیٰ نے اپنے سکرٹری بیضان (بیضان ۲) کو (ایزن کے ایلچانی سلطان) ابوسعید کے پاس سفیر بنا کر بھیجا اور اس کی تحویل میں ایک لاکھ تئیسے دے دیے اور کہا کہ یہ رقم بصرہ، کوفہ اور عراق کے مزاروں کے مجاوروں میں بانٹ دینا، بیضان کی نیت خراب تھی، اس نے اپنی ساری دولت ساتھیوں اور یہ ارادہ کر کے عازم سفر ہو کہ پھر لوٹ کر سلطان کے پاس نہیں آئے گا، اتفاق کی بات ہے کہ وہ اس وقت پہنچا جب ابوسعید کا انتقال ہو چکا تھا بیضان کی بن آئی اور وہ بغداد چلا گیا، اُس کے اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ تقریباً پانچ سو گھوڑے تھے، بغداد سے وہ دمشق آیا، رزوی کہتا ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ وہ پھر عراق واپس آئے اور وہاں مستقل اقامت اختیار کر لی ہے۔ شیخ ابوبکر تری نے کہا کہ سلطان تثنیٰ کا جاہ و جلال دیکھ کر دل کا پتہ نہیں اور جب اس کا جلوس نکلتا ہے تو زمین لرزتی ہے، وہ مور مملکت سے گہری دھچپی لیتا ہے اور بہت سی نفیس نفیس صاف کرنے بیٹھتا ہے خواجہ احمد بن خواجہ عمر بن مُشاف نے کہا کہ سلطان رعایا کی درخواستوں پر غور کرنے کو عام دربار کرتا ہے، اُس وقت سکرٹری کو چھوڑ کر کسی نشان کو ہتھیار تو کیا چاقو تک لے کر اس کے حضور میں آنے کی اجازت نہیں ہوتی، لیکن وہ خود پوری طرح ترکش (۱۵' ۱۵) کس اور تیر سے مسلح ہوتا ہے، اس کا معیوب ہے کہ جہاں بیٹھتا ہے ہتھیار ساتھ ہوتے ہیں۔

سلطان کی سواری کبھی جنگ کے لئے نکلتی ہے، کبھی دہلی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک محل سے دوسرے محل کو جانے کے لئے، جب وہ میدان جنگ کو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جس رہے ہیں، ریگ رہا ہے سمندر اُمنڈ آئے ہیں، بجلیاں جنک رہی ہیں اور ایسے منظر دکھائی دیتے

میں جن کو آنکھیں باز نہ نہیں کرتیں، اور جن کے بیان سے زبان قاصر ہے۔  
 بادشاہ کی ہمتی پر ایک شہر یا مستحکم قلعہ ہوتا ہے (جس میں وہ بیٹھتا ہے) ہر  
 طرف دھول ہی دھول نظر آتی ہے اور دن کے رُخ روشن پر خاک کے سیاہ  
 بادل چھب جاتے ہیں۔ سلطان کا شعر کالا جھنڈا ہے جس کے بیچ میں ایک سنہری  
 پٹی ہوتی ہے۔ کسی دور کو کانا جھنڈا رکھنے کی اجازت نہیں۔ درج کے مہمہ میں  
 کائے جھنڈے ہوتے ہیں اور میسہ میں لاں، ان پر بھی سنہری پٹیاں ہوتی ہیں۔  
 باقی افسروں کے جھنڈے حسب حیثیت ہوتے ہیں۔ (باقی)

## ”ندوة المصنفین کی تازہ ترین کتاب

صدیق اکبر <sup>عنه</sup> رضی اللہ عنہ

نہایت بزرگ عدیق کا نہایت مفصل و مبسوط و تحقیقانہ تذکرہ جس میں  
 آپ کے حالات و سوانح، عظیم الشان کارناموں، دینی اور سیاسی خدمات، مکارمِ خُلق  
 اور عہدِ صدیقی کے تمام واقعات کے علاوہ اس دور کے مذہبی و سیاسی، فقہی اور تاریخی  
 مباحث و مسائل پر سچا و صریح کلام کیا گیا ہے ”صدیق کبر“ اپنے سلوبِ بیان اور اندازِ  
 تحقیق کے اعتبار سے یہ کتاب تاریخی حقائق کی خصوصیتوں کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی  
 ہو سکتا ہے۔

صفحات تقریباً ۵۰۰ بڑی تقطیع کتابت و طباعت نہایت نفیس و دیدہ زیب

قیمت غیر مجید سات روپے۔

مجلد آٹھ روپے،



# دنیا کے اسلام

(جناب میر لائف انٹر نیشنل نیویارک)

مترجم

(جناب پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے)

(لائف انٹر نیشنل نیویارک) ہے۔ گسٹ ۱۹۵۳ء کے شمارے میں "دنیا کے اسلام" کے عنوان سے یہ مقالہ شائع کیا گیا جس کا ترجمہ پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر صاحب ایم۔ اے۔ ہندو شعبہ فارسی و اردو، سیدز یوٹرس کالج، ممبئی نے کیا ہے۔ در اسی کے ساتھ اس خط کا ترجمہ بھی جو مولوی عبدالصمد شرف الدین صاحب نے "لائف انٹر نیشنل" کے مدیر کو روانہ کیا تھا، اب یہ دونوں ترجمے "راہ" میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

عرب میں حضرت محمدؐ نے ایک مذہب تو حید کی بنیاد ڈالی۔ جس نے گنہگاروں کو پورے عالمِ انسانی کے ساتویں حصے کو اپنا حلقہ بگوش بنایا۔

اسلام جو دنیا کے عظیم اور عالمگیر مذہب میں سب سے کم سن ہے، کئی طرح سے سادہ ترین اور واضح ترین مذہب بنی ہے اس مذہب کے ماننے والے صرف ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں جو ہر چیز پر قادر ہے۔ مذہبِ اسلام نے انسانی عظمت کو بحال کیا ہے اور نہ نجات دہندہ بلکہ ایک ایسے انسان کے ہمہ گیر خدا کے یہ بیڑہ بندوں تک پہنچانے کے لئے ایک ذریعہ کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ اس ذاتِ عظیمہ جو منصفی و شہادتوں سے متبرک ہے، اس دنیا میں انسان کے اخلاق سے نہ ہی تعلق رکھتا ہے جب تک کہ دوسری دنیا میں اس کے حسن اور برکت اور اس سے دوسرے مذاہب کے برعکس، جس کی یہ ساری روایات سمجھ و رواست میں اور جو طویل و مستحکم ارتقاء کا نتیجہ ہیں۔ اسلام تاریخ پر روشنی میں وجود میں آیا اور حواریوں کی رفتار

سے پھیلا۔

حضرت محمدؐ کی وفات (واقعہ ۶۳۲ء) کے چند ہی سال بعد اسلام نامہ مشرق وسطیٰ پر چھایا گیا اور تقریباً ایک صدی کے اندر اس کی حدودِ امتداد حیلِ لفظی سے لے کر مہالیت تک پھیل گئیں۔ آج اس کے کم و بیش ۳۴ کروڑ مقلدین ہیں جو شیوعی طور پر دنیا کی آبادی کا ساتواں (دنیا کی آبادی کے نصف سے زیادہ کی تعداد پر پاس کر ڈرے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔ برہان) حصہ ہیں۔

اسلام کی شاندار ابتدائی فتوحات کے وجود، تاریخی حالات کی بجز بروم کے اطراف و جوانب کے ممالک کی افراتفری، درءِ یوں کے جوش و خروش اور جنگی بدلت میں مضمر ہیں۔ لیکن اسلام کی دائمی طاقت اور پائنداری کی وجہ اس کی سادہ، واضح، مثبت، افست ہے جس نے اسلام کے تحت دو تیرہ سو برس سے برقرار رکھا ہے۔

اسلام صرف عبادات کے مجموعے کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر طریقہ زندگی ہے جو انسانی خیالات و اعمال کی ساری حد تک رہنمائی دیتا ہے جس میں ہر مذهب میں بھی کوئی نہیں۔ ساری عظمت کی کلید خود لفظ 'اسلام' ہے۔ جس کے معنی ہیں 'تابع ہونا، یعنی خود کو خدا کی رضا کا تابع اور در ذرا بندہ رہنا، منظورِ مسطہ'۔ اس مخرج سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'وہ جو تابعِ خدا ہوتا ہے'، ہذا ہم سچے مسلمان خود کو اس وقت خدا کے سامنے حاضر ہونا سمجھتا ہے 'اسلام' کے ماننے والوں کے لئے مذہب، زیدی، دین، سیاست ناقابلِ تفریق ہیں۔

یہ اعتقاد کہ 'خدا حاضر و ناظرِ حاکم و رحیم و خیر و منفعت ہے' دنیا کے مسلمانوں میں سب وقار اور خود اعتمادی پیدا کرتا ہے جس کے ہوتے ہوئے ان کے اسلام سے کچھ جاننے اور دیکھنے سے گھبرانے کا کوئی نسخہ نہیں۔

اپنے وسیع ترین مفہوم میں اسلام خدا کے زیر سایہ انسانوں کی اخوت کا نام ہے جو منسل و

قوم کی بندشوں سے نکل کر خدا کے حکم کی تعمیل کے لئے متحد ہو کر ایک منظم جدوجہد میں مصروف ہے۔ اسلام کا یہ یقین دلانا کہ محمدؐ کی زبان مبارک نہ بھٹے ہوئے کلمات جو قرآن کریم میں محفوظ ہیں خدا کے تعالے کا آخری اور مطلق کلام ہے، اسلام کی عظمت اور قوت کا دوسرا قلعہ ہے۔

ایک مسلمان کے نزدیک ان پچھلے تمام آسمانی صحیفوں کو منسوخ کرتا ہے اور ان کے تمام حقائق کی تصدیق کرتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں جو الٰہ واحد ہے بنیادی حیثیت سے وہی اسلام کا استہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کی نظر میں قدیم آسمانی صحائف میں خدا کے رشادات کا اظہار نامکمل طریقہ پر ہوا تھا اور صرف قرآن میں اسے مکمل کیا گیا۔ اسی طرح اسلام حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک انجیل کے تمام پیغمبروں کی تعظیم کرتا ہے اور محمدؐ کو آخری و خدیز ترین پیغمبر گردانتا ہے اور انھیں 'خاتم النبیین' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ جہاں اسلام نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت سے انکار کیا وہاں اس نے حضرت محمدؐ پر نبوت کے صدق کی جستجوشوں کو بھی بارود نہ ہونے دیا۔ حضرت محمدؐ بار بار یہی کہتے تھے کہ وہ کرم ہی کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے صحت ایکن ہوئے ہیں۔ حضرت محمدؐ کی ولادت کے وقت (رویتہ سنہ ۵۷۰) مکہ معظمہ، شام اور ہندوستان کے درمیان گرم مہ سوں کے قدیم تجارتی راستہ پر ایک خوش حال تجویلی دکان تھا۔ مکہ کو ایک مذہبی مرکز کی حیثیت بھی حاصل تھی جہاں مت پرست عرب شہ کے مختلف معبدوں میں بتوں کی پرستش کرتے کرتے گئے۔ ایک مستطیل عمارت بنام کعبہ کی سب سے زیادہ تعظیم کی جاتی تھی۔ کعبہ میں مختلف مت نصب کئے گئے تھے۔ ایک گوشہ میں ایک حجر اسود رکھا گیا تھا جس کے متعلق یہاں جانتا تھا کہ جنت سے آیا ہو تھا۔ حضرت محمدؐ مکہ کے ایک مفت ورتن قبیلہ 'قریش' کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ زمانہ شباب ہی میں آپ کو اس وقت کہ جب مذہبی رسومات کو یاد رکھنے کے کوئی موقع ملے۔ کیوں نہ 'قریش'



خانہ کعبہ کے محافظانے جانتے تھے۔ ابتدا میں حضرت محمدؐ نے بت پرستی سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کی توحید کی حرمت و تعظیم میں اضافہ ہوئے لگا۔

حضرت محمدؐ حساس ہونے کے ساتھ سوچ بچار کی طرف بھی بہت مائل تھے۔ آپؐ لگاتار کئی کئی دنوں تک مکہ کے طرف کی پہاڑیوں میں مگر دوں رہتے۔ ایک شب فرشتہ مقرب حضرت جبریلؑ ان کے سامنے نمودار ہوئے اور کہا 'اقراء' (پڑھو)۔ اس ابتدائی وحی میں حضرت محمدؐ نے قرآن پاک کی اولین آیات کو ادا کیا۔ پہلے پہل تو آپؐ پر گھبراہٹ اور دہشت طاری ہوئی لیکن جب وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو انہیں یقین ہو گیا کہ وہ شد کے رسول ہیں جو سچا و سادہ خدا ہے کم و بیش دس سال تک آپؐ پر وحی اُترتی رہی جب آپؐ کعبہ کے قریب کی گزرگاہوں میں کھڑے ہوتے تو ان کے منہ سے بے ساختہ موزوں کلمات نکلنے لگتے۔ حضرت محمدؐ کی بیوی کی مذمت کی وجہ سے مکہ کے تاجر انہیں بت پرست و زورین سے کافی آمدنی مونی تھی ان کے مخالفت ہو گئے اور انہیں قتل کی دھمکی دی۔ آخر کار مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ کی اور مکہ کے شہر میں ۲۲ میل دور ایک مقام یتیم خانہ میں جہاں کے باشندوں سے ان کے زمانہ سعادت تھے آکر مقیم ہو گئے۔ جس سال حضرت محمدؐ نے ہجرت کی وہی سال سنہ نبوی کا ہند سال ہے۔

یتیم خانہ میں ۳ سال کا نام بعد میں مدینہ منورہ میں آیا حضرت محمدؐ نے بہت جلد ایک کامیاب روحانی مہیوہ اور حاکم کی حیثیت حاصل کر لی۔ ان کے پیروؤں اور مکہ کے بسنے والوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے مقابلوں کا سلسلہ، آخر کار دونوں شہروں کے مابین ایک جنگ پر منتج ہوئی۔ بہت سی جنگیں ہوئی جب حضرت محمدؐ فاتحانہ مکہ پر حملہ ہوئے اور بعد میں غضب شدہ تمام بتوں کو مسمیٰ کر دیا۔ بعد کے دو سالوں میں حضرت محمدؐ نے ان میں پیغمبر اور حکمران کی حیثیت سے اپنے وقار کو اس قدر مستحکم کیا کہ ۶۳۲ء

میں ان کی وفات دین کی ترقی و اشاعت میں مانع نہ ہو سکی جو اب بے خبر بیرونی دنیا پر اندھی کی طرح ٹوٹ پڑنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔

یہ امر نامعلوم ہے کہ قرآن کی مکمل ترتیب حضرت محمدؐ کی زندگی میں ہی ہوئی تھی یا نہیں۔ لیکن یہ یقینی بات ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے فوراً بعد ان کے ایک کاتب نے قرآن کو ایک مستند کتاب کی صورت میں مرتب کیا جسے بن کے صحابیوں کی مجلس نے مستند دینی صحیفہ تسلیم کیا اور اس کے بعد سے اب تک وہ محفوظ ہے اس کی تعلیمات اور کلام کو ہر مسلمان کا ایمان الہی کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے اور اسی کی بنیاد پر شریعت اسلام یا اسلام کا قانون بنایا گیا ہے۔ اس کے ابتدائی عقائد و مسائل میں یعنی توحیدِ خالص و آخرت، گو عرب معبودِ اعلیٰ کے وجود کے پہلے سے قائل تھے لیکن حضرت محمدؐ نے اللہ کو واحد و یکتا خدا کی حیثیت سے پیش کیا۔ (مسلمانوں کی نظر میں نیسائیوں کے عقیدہ نسبت میں شرک کی آمیزش ہے)

آخرت کا عقیدہ خدا کی یکتائی کے اصول کے ذہن میں آتا ہے جو خالق اور منصف ہے۔ جنت کی راحتوں اور دوزخ کی تکلیفوں کے بارے میں قرآن کا بیان انجیل سے کہیں زیادہ واضح اور جان دار ہے۔ جنت میں باغات، فوارے، شراب کی نہریں و حسین و متیزائیں بھی جاری ہیں جن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں صدف میں چھپے ہوئے موتیوں کی مانند ہیں۔ دوزخ میں آگ کے گڑھے، تیز و تند ہوائیں اور کھولتا ہوا پانی ہے۔

گو حضرت محمدؐ نے نہ تو منظم نہ سببی پیشروان کا کوئی ادارہ قائم کیا اور نہ کوئی مقدس رسم جاری کی۔ تاہم انھوں نے متعدد مذہبی کام و فرائض کا حکم دیا جنھیں اسلام کے پانچ ستون بھی کہا جاتا ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) وحدتِ الہی کو تسلیم کرنا، اور اس پر ایمان لانا جیسا کہ کلمہ، قول لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمدؐ خدا کے پیغمبر ہیں (۲) روزہ نہ پانچ مرتبہ و جمعہ کو مسجد میں نماز کو کرنا۔ نماز کی دینی کے وقت منکعبہ کی طرف ہونا چاہئے۔ خواہ کوئی شخص دنیا کے کسی حصہ میں کہوں۔ ہر روز (۳) تقویٰ کی بنیاد پر راہِ خدا

نہ زکوٰۃ دینا۔ (۴) ماہ رمضان میں روزے رکھنا۔ (۵) خانہ کعبہ کی زیارت یعنی حج کرنا۔

ان پانچ اہم عبادات کے علاوہ قرآن ایک عظیم الشان اخلاقی و شرعی دستور العمل بھی پیش کرتا ہے۔ قرآن مسلمانوں کو لحم خنزیر کھانے، اجوا کھیلنے اور سود کا کاروبار کرنے سے منع کرتا ہے۔ اس میں نکاح و طلاق کے بنیادی قوانین اور مختلف جرائم کے لئے سزائیں بھی تجویز کی گئی ہیں۔ قرآن کے نزدیک جو امور معیوب ترین ہیں ان میں ایک عہدہ سازی بھی ہے یہی وجہ ہے کہ ایام سلف میں کہیں بھی حضرت محمدؐ کے مجسمے اور تصویریں نہیں پائی جاتی ہیں۔

حضرت محمدؐ کی وفات کے ایک سال بعد اسلامی فوجیں جزیرہ نما عرب سے باہر نکل آئیں اور دنیا کی ان قوموں اور ملکوں کو متیر کر دیا جو عربوں کے وجود سے متعلق بہت کم یا کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ پہلے تین خلفاء یعنی حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کی مدبرانہ قیادت میں بیس سال سے بھی کم عرصے میں مشرق قریب کی درخشندہ شان سلطنتیں مسلمانوں کے قبضہ میں آ گئیں۔ ۶۳۵ء میں شام ۶۳۶ء میں عراق، ۶۳۷ء میں فلسطین، ۶۳۸ء میں مصر اور ۶۵۰ء میں تمام ایران فتح کیا گیا تھا۔ شروع شروع میں اسلامی فاتح فوجیں اس تیزی سے پیش قدمی کر رہی تھیں کہ انھیں نہ تو صلاح مشورہ کا وقت مل سکا اور نہ ان نئے مفتوح ممالک میں نظم قائم کرنے کا۔ انھوں نے خراج لینے پر ہی کتفا کیا اور جو لوگ خراج ادا کرتے تھے ان سے رواداری برتی جاتی تھی۔ بایں ہمہ بڑھتی ہوئی تعداد میں مفتوحین کے گروہ صحرے آئے ہوئے نئے متحرک دین کی سرخوشی میں آئے لگے۔ فتوحات پر فتوحات حاصل ہوتی گئیں۔ زمرہ فتح کا سرشار کن جذبہ عربوں کو مشرق میں بددلت تک، مغرب میں بحر الکاہل تک اور آبنائے جبل الطارق کے، اس پار اسپین، پرتگال اور فرانس تک لے گیا۔ آخر کار ۷۳۲ء میں کن کو فرنگیوں نے طورس کے مقام پر روک لیا۔ لیکن اب بھی ان کا جوش اور ولولہ ختم نہیں ہوا تھا۔ نویں، دسویں اور گیارھویں صدی، اسلام کے نئے سنہری زمانہ تھا۔ رومی، یونانی تہذیب کے اثر سے سید رہو کر اور بازنطینی و ایرانی میراث سے فیض یاب ہو کر اسلام نے اپنی ایک روشن سلسلہ واقعات کے خلاف مسلمانون کا نظم چھینا۔ تاریخ کی جاتی بچاؤی حقیقت ہے۔ (برہان)



اور عظیم شان تہذیب کی تخلیق کی۔ بغداد اور عرب کے دیگر مشہور شہروں میں فن، فلسفہ اور شاعری کو کافی عروج حاصل ہوا۔ ریاضی اور طب نے ترقی کی۔ مسلمان صوفیوں اور کاریگروں نے مسجد قرطبہ جیسے شاہکار پیش کئے، اسلامی پیغام کی ترویج و اشاعت مسلم تجار اور صوفیاء کے ذریعہ ایشیا اور ہندوستانی جزائر میں ہوتی رہی۔

اسلام کی ابتدائی شاندار فتوحات کے باوجود، مسلمانوں میں باہمی اختلافات موجود تھے۔ سب سے پہلا اختلاف حضرت محمد کی جانشینی کے سوال پر پیدا ہوا۔ اور ان ابتدائی اختلافات کی وجہ سے ایسا نفاق پیدا ہوا جو آج تک موجود ہے۔ مختلف ادوار میں عقائد کے اختلافات نے مختلف گروہ اور جماعتیں پیدا کیں لیکن باہر سے ہر طرح اسلام یکجہ و سلم رہا ہے اور آج بھی اسلام کی ایک پتھر پر تراشی ہوئی عمارت تین براعظموں کے سینہ پر اسی طرح سر فیک ایستادہ ہے جیسی وہ مختلف ادوار میں رہی تھی۔ گو اسلام کی شاندار سلطنت کے حصے بخرے ہو چکے ہیں اور جدید قوم پرستی اور معاشی بد حالی نے اس کو کمزور بنا دیا ہے لیکن پھر بھی اسلام ایران کی قوت کے ذریعہ آج بھی متحد ہے۔ عراق سے بحرِ حمز تک مسلمان ایک ہی قسم کا ایمان رکھتے ہیں، ایک ہی طرح کی عبادت کرتے ہیں اور اپنا رخ عبادت کرتے وقت ایک ہی مقدس شہر کی جانب کرتے ہیں۔ یہی وہ باتیں ہیں جنہوں نے اسلام آج بھی لاکھوں انسانوں کے لئے زمین پر خدا کی حکومت بنا رکھا ہے۔

مکہ معظمہ۔ اس مقدس شہر کی زیارت ہر مسلمان کو کرنی چاہیئے۔

اسلام کے احکام میں حکم نے کہ ہر صاحبِ قدرت سچے مسلمان کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور حج کرنا چاہیئے، اسلام کے لئے ایک اتحاد انگیز قوت کا کام کیا ہے۔ دنیا کے ہر حصے سے زائرین مکہ کے مقدس شہر کی جانب یک خاندان کے افراد کی حیثیت سے سفید بے سلفے پڑے جنی حرام باندھے ہوئے پہنچتے ہیں۔ ان کے سوا خوت کے جذبے کے تحت نسل و طبقات کی تمام حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ صرف مکہ کو جان ہی کافی نہیں بلکہ خاص

ارکانِ مذہبی کو انجام دینا بھی ضروری ہے۔ ان سب میں پہلا فریضہ کعبہ کا طواف ہے جو سات مرتبہ کرنا پڑتا ہے اس سے کلمہ بم فریضہ مکہ کے قریب دو چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سات مرتبہ دوڑنا ہے۔ یہ فریضہ حضرت ہاجرہ علیاؓ اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کے لئے پانی کی بے تابانہ تلاش کی یادگار ہے۔ تیسرا اہم فریضہ میدانِ عرفات میں دو کرنا ہوتا ہے جہاں زائرین کو 'جبلِ اہم' کے قریب دوپہر سے غروبِ آفتاب تک خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑتا ہے۔ یہ سب اہم فرض ہے اور جو اسے ترک کر دیتا ہے اس کا حج نہیں ہوتا۔

”اسلام میں عورت کی سماجی حیثیت اور رسوے کی تبدیلی“

جب اسلام اطرافِ عالم میں پھیل گیا تو مفتوح یا نو مسلم اقوام کے رسم و رواج اسلام کے سماجی نظام میں راہ بنانے لگے جس کی بنیاد قرآن کے مذکورہ اعمال و افعال تھے۔ اسلامی دنیا میں عورتوں کے متعلق جو خیالات اور رجحانات پائے جاتے ہیں وہ اس امر کی ایک مثال ہے۔ کئی ممالک میں عیدیوں سے انھیں گوشہ تنہائی میں رکھا جاتا تھا اور مکانات سے باہر انھیں بھاری بھرکم برقعوں کاغس پہن دیا جاتا تھا۔ تاہم ملایا میں قدیم روایات کے مطابق عورتوں کی آزادی کا تحفظ دوسرے ممالک سے زیادہ کیا گیا۔ دوسرے مقامات پر عورتوں پر جو کڑی یا بندیوں کاغس لگی انھیں وہ قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں۔ بلکہ انھیں بعد میں نقہار کی زولوں کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔

سہریاب باتیں گلِ بخت و ترغیس طلب میں (برہان)

اُردو کے عظیم ترین شاعر و محقق تھے کئے پتے قلم سے لکھے ہوئے دلچسپ، عبرت انگیز اور حیرت آیز واقعات میر کی آپ بیتی میں ملاحظہ فرمائیے۔

اسے معزز نقاد شاعر احمد فاروقی نے اصل فارسی کتاب سے ترجمہ کیا ہے اور جابجا ضروری معلومات حواشی میں لکھ دی ہیں۔ ترجمہ تابیت حسن کاغذات و مقتدر علمی جہاں دوزخ عالموں نے کیا ہے۔ صاحبِ امتیاز علی۔ کتابت عمدہ۔ کاغذ نفیس۔ اسٹاپ شاندار۔ مکتبہ برہان دہلی سے ۸۲ میں طبع فرمایا ہے۔

# فارسی و اردو کی چند کم یاب کتابیں

## کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں

(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

(۱)

چند مہینے پہلے، اورنگ آباد دکن کے مختلف مطبعوں سے جمی ہوئی اردو کتابوں پر ایک سیر حاصل تبصرہ لکھتے ہوئے جناب مبارز الدین رفعت نے یہ احساس دہایا تھا کہ دہلی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح ہمارے ہاں اردو میں نہ کتابوں کی توضیحی فہرست چھپتی ہے، نہ ان کا کوئی کنڈلاگ مل سکتا ہے، نہ قدیم مطبوعہ کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے۔ درحقیقت یہی ہے کہ اردو داؤد نے سائنٹفک طریقے سے کوئی علمی کام نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔ تاہل زبان میں انسائیکلو پیڈیا موجود ہے، مگر اردو میں نظامی بدایونی کی قاموس المشاہیر کے سوا کوئی کتاب "قاموس" کے انداز پر نہیں مل سکتی۔ نظمی مرحوم نے بھی سبکی کی کتاب کا ترجمہ ہی کر ڈالا تھا۔ اسی طرح کوئی مستند لغت کی کتاب بازار میں نہیں ملتی۔ قدیم مطبوعات کا کنڈلاگ مرتب ہونا تو دُور کی بات ہے، مطبوعات حاضرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کا کوئی وسیلہ ہمارے پاس نہیں۔ غرض یہ کہ :

بزار بادۂ ناخبردہ در رگ تاک ہست

اسی ضرورت کا احساس کر کے میں نے ان قدیم قلمی و مطبوعہ کتابوں کے تعارف کا بیڑا اٹھایا ہے

جواب کی بک میں اور جن میں کچھ سامو دیکھ، ہولٹ جو تحقیقی کام کرنے والوں کو مدد دے سکتا ہے امید ہے کہ دوسرے چھوٹے بڑے کتب خانوں سے قریب سنے والے حضرت بھی اس ضرورت کا احساس کریں گے تاکہ اگر اردو میں کبھی



”کتابیات“ مرتب کرنے کی نوبت آئے تو اس کی یہ محنت کھانے لگ سکے۔ و اتوفیقی الاہی اللہ العلیٰ العظیم (شاہ غلام غلام علی)  
 (۱) آئینہ حیرت | محمد جان خاں حیرت الہ آباد کے محلہ منڈوی رانی کے رہنے والے تھے جو دائرہ حضرت  
 شاہ غلام علی کے قریب ہے۔ قوم کے پٹھان تھے اُن کے والد کا نام باندہ خاں عرف باز خاں تھا اور دادا جہانگیر  
 خاں تھے۔ حیرت میرا عظیم علی عظیم بک شاگرد ہیں اور عظیم خواجہ حیدر علی آتش سے اصلاح لیتے تھے۔

”آئینہ حیرت“ اُن کا دیوان ہے جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے

”وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ“ اس دیوان کے کل حقوق مطابق قانون بستم ۱۸۶۷ء کے نسبت مصنف کے محفوظ  
 رکھے گئے ہیں کوئی اہل مطبع بلا اجازت ورنہ اس کے مصنف اس کو نہ چھاپیں۔ یہ دیوان مطبع حسیق دھرم پور کا شہر میں  
 اور ٹیل مطبع نیرہندہ لہ آباد محلہ شاہ گنج میں چھپا۔ ۱۲۹۸ھ

اسی عبارت کے درمیان بیضوی شکل میں عنوان کتاب درج ہے :

”الحمد لله وامنت کہ دیوان کامل مع غزل اے تازہ از تاج طبع عالی فکر اہل کمال سرآر شہادت مانع واصل

جناب محمد جان خاں صاحب مخلص بہ حیرت“

پھر صفحہ ۲۱۳ خواجہ غلام غوث بے خبر کی نوٹ تفریط ہے وہ ہذا :

یاں شاہد معنی کے جلوے کی یہ صورت ہر دیوان کا ہر صفحہ آئینہ حیرت ہے

میں اس دیوان کو آئینہ حیرت اس نظر سے نہیں کہنا کہ خان فصاحت مرتبت محمد جان خاں حیرت کی تصنیف  
 ہے بلکہ اس وجہ سے کہتا ہوں کہ ایسے وقت میں کہ شاعری محض ایک نوع حرکت اور ہلکا نصیب اوقات سمجھی  
 جاتی ہے اور فی نفس الامر بے بھی یہی بات۔ جب کوئی سننے اور سمجھنے والا نہ ہو تو کلام موزوں ناموزوں  
 ہے اور سخن خوب نامرغوب۔ عرض جو ہرے جو ہر شے خوش ہوتے ہیں۔ نظر نہ ہو تو لعل اور پتھر برابر ہے۔  
 آئینہ کی قدر یوسف طلعتوں کو ہوتی ہے صورت بڑی ہو تو آئینہ تو سے بدتر ہے۔ ہمارے عہد میں حکام  
 وقت کو اپنی حکیمانہ روش کی وجہ سے مطلق اس کا ذوق نہیں کہ کوئی صلیب کی امید میں جان کھیلے ہر جنسوں  
 کو انسر دگ خاطر سے ذرا بھی حقوق نہیں کہ کوئی جان کا ہی کی داد پاسے۔ زمانہ کہ وہ دھنگ کہ عاشق اپنے  
 دل اور معشوق اپنی زلف سے زیادہ پریشان ہیں۔ میں دہنہار کا یہ رنگ کہ میرے بچے بچال اور غریب

اپنے صا میں مبتلا اور حیران ہیں۔ کہاں کا شعرا و کسی شاعری۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم صغیر سب نے  
 خاں کر گئے۔ ہم نواؤں نے گلشن عدم کی راہ لی۔ جو کچھ کہنے سننے واسے باقی رہ گئے ہیں، اُن پر  
 ایسی اُداسی چھا گئی ہے کہ زبان اور کان بند کئے بیچ عزت میں خاموش میں۔ زمانہ اُن کے  
 لئے وہ زمانہ کے لئے حرف ز خاطر فراموش ہیں۔ بزم جہاں سی سنسن ہے جیسے بارات  
 رخصت ہونے کے بعد شادی کا گھر۔ یہ محض ایسی خاموش اور اہل محض سے بے ہوش ہیں  
 جس طرح رات کی مجلس شرب بوقت سحر۔ مصنف کا اس کس پیرس کس مشنوفن کی طرف  
 متوجہ رہتا۔ دراپنے کلام کی تدوین میں ہمت صرف کرنی، محل حیرت ہے۔ اور پیراس خوبی کے  
 ساتھ کہ درحقیقت پرزاد اِن معنی کے لئے آئینہ خانہ ہے، جدھر نگاہ کیجئے دل فریب جلوے  
 پیش نظر ہوتے ہیں۔ فی الواقع مستان بدہ سخن کے واسطے اس سے کدے میں حرف کی کشش  
 اور دُرے سے وہ شیشہ اور پیانہ ہے، کہ ہا خبر اس کی سیر سے میری طرح بے خبر ہوتے ہیں۔  
 زیادہ کیا لکھوں جس کلام اپنی خوبی کا پ شائد ہے کسی کی تعریف کی ضرورت نہیں۔ محبوب خور  
 کا جب سادہ ہی در رہا ہے مشاطہ سنورنے کی حاجت نہیں۔ آئینہ ہمیشہ منظور صاحب  
 نظر رہے جو دیکھے صفائے سخن کا شیفہ ہو۔ یعنی کی طرح حیراں رہے

چشم بدھاسد سے یارب توپ سس کو تو سب کا نگہاں ہے سب کچھ تجھے قدرت پر  
 خود غلام غوث ہے خبر ک اس تقریظ کے بعد ص ۳۰ سے دیون غزبات کا آغاز ہوتا ہے مطلع یہ دیون ہے  
 کر سہ دقلم لکھ یہ موقوف ہے بہاں کا لکھنی ہے صفت س کی جو خاق ہے جہاں کا  
 ایک شعر میں آئینہ استاد کی طرف اشارہ کیا ہے

میں گون نہیں د دوخیز کریاں جیت منور سم غم یہ دیون د غزب خوب کو

یہ دیون ۶ x ۱ ۱/۲ سائز کے ۲۷۸ صفحات کو محیط ہے۔ ص ۳۰ سے ص ۳۱ تک غزبات۔ ص ۳۱ سے ص ۳۲

ترجمہ بند درشاں حضرت میر میر سیر۔ مکی بن ابی طالب بامید خاتمہ خیر و ایوں مذکور  
 مشہور خلاق یہ کی مشکل گئی ہے موقوف آپ پر مراد صاحب روئی ہے

صفحہ ۲۳۵ قطعہ تاریخ طبع دیوان نوشتہ مصنف

”زبیر ترائہ حیرت“ خیاب میں کیا

۲۹۶

”قطعہ تاریخ عن مرزا قلم علی صاحب منصف سابق تخلص بہ قہر شاعر نامی رئیس اعظم اکبر آباد“

صاف دیوان محمد بن خاں ہے جو بحر نظم کا صورت نما

مصرع تاریخ قہران کا کہو گردش تینہ حسرت فرا

اسی میں حاتم علی قہر کے برادر زادہ مرزا عنایت علی تہ، در محمد زکریا خاں زک خلف سید محمود خاں شاگرد مرزا

اسد اللہ خاں غالب ”برادر زادہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں صاحب منفور رئیس اعظم دہلی“ کے تین قطعات

تاریخ، نیز قطعہ تاریخ از مولوی امیر محمد صاحب سائن رامپور اور ”قطعہ تاریخ نواب عبدالعزیز خاں صاحب

تخلص بہ عزیز رئیس اعظم ضلع بانس بریلی شاعر نامی، بقیہ خاندان نواب حافظ رحمت خاں صاحب منفور

اور سید شاہ محمد علیہ صنف مولوی سید شہد عابد صاحب نالہ سابق ریاست بھوپال و شاگرد میر

اعظم علی اعظم تمیز خواجہ حیدر علی آتش سکن آداب دہلی پور دائرہ حضرت شاہ رفیع الزماں صاحب منفور

کے تصنیف کردہ قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔ پھر ۳۸۷ سے منشی محمد علی مفت آبادی کا نوشتہ ۴۲ شہر

کا قطعہ تاریخ اور تقریب شروع ہوتی ہے۔

میر مرغنی رشید، خواجہ عزیز الدین، سلف حسین حذر سکن شہر فتح پور سہوہ شاگرد میر حسین مانغر

لکھنوی تمیز منشی مظفر علی اسیر کے قطعات ہیں اور پھر ۴۳۷ سے خود مصنف کے لکھے ہوئے قطعات

ہیں۔ پہلا قطعہ ۴۳۸ تا ۴۳۹ تو مدثر نذر رحیم کوریہ بھوپال سہوہ بہادر ولد مہاراجہ یسری زائن سنگھ

بہادر بنارس دام اقبال ہیں ”ہے اور دوسرا ۴۴۰ تا ۴۴۱ جی کی مشعوں کا ہے۔

اس دیوان کے مطالعے سے دو باتیں بہت معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی اس کے شاگرد اور خود محمد خاں

حیرت کے استاد میر اعظم علی اعظم کا سبب دوستی و غم و آتش کے سبب در تید تھے اور ان کی اہمیت یہ ہے

کہ کبر و تادی کے واد است دتھے۔ گمر نے وحید آبادی سے اصلاح دی تھی وروخید، انہیں اعظم کے

سے ”وحید آبادی“ پر ملاحظہ ہو میر معصوم معصومہ آج کل ٹہری ۱۰ رچ ۹۵۷



شارد تھے۔ محمد جان حیرت نے اعظم کا ساں وفات پر قطعہ منظم کیا ہے:

کس طرح سے جائے دس سے یہ غم بڑی استاد کی شفیقی، مکرّم ہے ہے

صدت کے سبب سے آپ کے ب ذی خج بھی ہو مکرّم ہے ہے

اس قطعہ کے ہر بیت میں ہر بیت ۶ ہر مصرعہ ہر کمال نخل ماقہ ہے ہے

تاریخ وفات کی ضرورت سن کر ہر فکر میں شاعرانہ مہر ہے ہے

ہاٹف کند نے جو چھ سال رست کا حیرت نے کہا کہ "میرا اعظم ہے ہے" ۲۴-۲۵

"میرا اعظم ہے ہے" سے سزا مستفاد ہوتے ہیں، اس سے سمجھ ہو کہ اعظم کی وفات ذی الحجہ ۲۹ھ میں ہوئی تھی۔

دوسرا قطعہ تاریخ مولوی نظام، مشہور کی وفات پر نظم ہو ہے۔ شہید کا وطن اصلی یہی صبح

لکھنؤ تھا گویا مفسر سی سر کے ہم وطن تھے۔ فی شعر میں مصحفی مروی ہے، صراح لی تھی، قیس سے ہی

چندے شورہ رہا۔ قاضی محمد صادق حتر، سید محمد صفائی درمید زنا طق کرانی وغیرہ ان کے ہم وطن

درمید عہد تھے۔ ان کے متعلق شواہد ۱۲۹۹ھ (کنویر ۸۷۹ء) میں ۸۷۹ء کی غز میں ہو سوں، کر

عید اصداء، تقسیم سے لے عتق تھا میلاد شہب فوج پڑھتے تھے، ان کے کئے ہوئے سیرت

ہی مزدستان میں گھر گھر پڑھے جاتے ہیں۔ ورکی اور دو دونوں زبانوں میں خوب کہتے تھے

انداز کلام کا حفظ ہو۔

قدرت کی ادرا، جائزہ زیب کی بھین رہیں تکمیل غضب ان راہری دو تہون

وہ جہے کی بچ وٹا، حسین روشن ورود کھٹے کے کی جانی وایاں گراں

وہ جہے عربی درود نیچ وامن درود وورق روہ بے سب خستہ پن

سے تھیں کے بے مدد مو قی نے جاوید ۲۵ کا شعر کی ۴۴۔ تہا گریہ کربان ہزار

صحبہ ۵۵ تہا کرہ راز روشن۔ علی کے قور کی مضامین کی، ست میں رات مہر تہا ۲۸

والتاریخا درود، حامد حسن قاری۔ یک نادر در زنجیر، سورجی معہ حق سہ جوں کی طاری تہا

۲۵۔ مودعہ ۲ شکی۔ دیکھو، ۱۰

مردہ بھی دیکھے تو کرچاک گریبان کفن اٹھ چلے قبر سے بے تاب زباں پر یہ سخن

مرحبا سید مکی مدنی العسری

دل و جاں با وفایت چہ عجب خوش لقی

مفتی انتظام اللہ شہابی نے شہید کا سال وفات ۱۲۹۳ھ لکھا ہے لیکن محمد جان خان حیرت کے قلم سے تاریخ ۱۲۹۶ھ کی تصدیق ہوتی ہے دہریہ۔

”تاریخ وفات حضرت مولوی غلام امام شہید شرمی الہ آباد“

حضرت مولوی غلام امام کہ جو دنیا کو جانتے تھے فضول

پنجشنبہ کے روز دنیا سے کر گئے کوچ بند مقبوں

ان کے لوحِ مبارک کو ہر ایک ڈھونڈنا تھا کہ ہم چڑھیں بھول

کائے ڈانڈے کھل گئی تقدیر دس ہوا آفتاب دیں کائزوں

فکر تاریخ سال میں اس کی دل حیرت جو ہو رہا تھا ملوں

کہا ہاتھ نے از سرِ اسداد

دفن ہے یاں شہید عشق رسول

۱۲۹۵ + ۱ = ۱۲۹۶ ھ

اس سے ہماری معصومات میں تنہا نہ ہوا کہ شہید کا انتقال پنجشنبہ کے روز ہوا تھا اور

ان کا مزار الہ آباد میں ”کائے ڈانڈے“ میں ہے۔

محمد جان خان حیرت کا محکمہ معمولی درجے کا ہے اس لئے انتخاب یہاں نقل کرنے کی ضرورت

محسوس نہیں ہوئی۔

# اَرَبِیَّتْ

## غزل

(جناب اکرم مظفر نگری)

قصرِ ظلم و جور کی بنیاد مستحکم سہی  
کھنچ کے ساقی دل سے جو آتی ہے وہ کچھ اور ہے  
رکھتی ہیں دل کو جوان ناکامیوں کی لذتیں  
شامِ غم کی الجھنوں میں اس سے کیا بچے گا دل  
فیضِ ساقی سے نہیں محروم بادہ کش کوئی  
مستیوں سے میرے غم خانے کی کیا نسبت ہے  
مٹی کا گارہ میں ہے یہ کیسی خدائی  
روحِ بخشش کو تو اس سے ناز کی ہستی نہیں  
شغل کوئی چاہیے، بے پختہ کارِ جنوں  
بے دہش سرکش پر اس کا ہوا اثر ممکن نہیں  
آنسوؤں میں آئیں پیہمِ لختِ دلِ لختِ جگر  
تا سمجھ حاصل تو ہیں اس کو چین کی راحتیں  
چاڑھ دیو توں ہی کفن ہے کشتہ غم کے لئے

یوں نہ ہو کچھ بھی مگر اک نالہ برہم سہی  
تیرے شیشے میں جواب کو ٹر دزمزم سہی  
زندگی میں نامکمل میرا ذوقِ غم سہی  
یہ گھٹا کالی کسی کا گیسوئے پر خم سہی  
مے کدے میں مل ہی جاتی ہے گرچہ کم سہی  
مرکزِ بادہ پرستی پر مگاہِ جم سہی  
بے حریفِ غم نہیں ہوتا کوئی تو ہم سہی  
زینتِ صحنِ کھیتوں جلوۂ شبنم سہی  
نوعِ عشرت نہیں تو نالہ و ماتم سہی  
عبادتِ آموزِ بشرِ انسانِ آدم سہی  
زور بھی اتنا کرم اے دیدہ پر خم سہی  
بے حقیقت بر لبِ گل پر قطرۂ شبنم سہی  
ہم نے مانا پاک و عابد چادرِ ہم سہی

میرے جامِ دہن میں بھی کاشکِ سیاں ہے  
اے تم صہبائے کیفِ آدرہ جامِ جم سہی



## تبصرے

”اعیان الحجاج“ اتالیق شیخ الحدیث مولانا الحاج حبیب الرحمن  
تاریخ اسلام کے بلند پایہ حجاج صاحب اعظمی، صفحات ۲۳۲، تقطیع ۲۶×۲۰  
قیمت غیر مجلد تین روپے آٹھ آنے، قیمت مجلد چار روپے آٹھ آنے، کتابت، طباعت  
: نفیس پتہ :- مکتبہ اعظمی مولانا محمد یحییٰ (دیوبند)۔

حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی ہمارے دور کے بلند پایہ عالم، جلیل قدر محدث، عربی ادب کے باکمال استاذ سمجھے جاتے ہیں، اس نے زیر نظر کتاب کے اعتبار و استفادہ کے لئے مولانا کا نام ہی کافی ضمانت ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، موصوف نے اس کتاب میں مشہور اسلام کے حالات حج زیارت کو دل پذیر اسلوب میں یکجا کیا ہے، اسی کے ساتھ ان کا ہر ایک مختصر سوانح حیات اور سبق آموز واقعات بھی لکھے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ مسائل و درفصل حج پر تو بے شمار کتابیں لکھی گئیں مگر اس موضوع پر کوئی مرتب و مستند کتاب ابھی تک دیوبند میں نہیں آئی تھی، مولانا نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی اور تاریخ اسلام کے اکابر اور صنعت صالح کے بیرون افزہ حالات حج کو یکجہ، پھیلے پیر میں جمع کر دیے، ان واقعات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے اسلام کے لئے کتنی عظمت دی، جن میں وہ شوق سے ادا کیا اور اس سے ایسی روحانی برکتیں حاصل کیں

سیرت اور واقعات حج کے علاوہ بہت سی تاریخی اور علمی معنویت کے اضافے سے کتاب کی افادیت و قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، اور اس سے نہ صرف زیارت حرمین سے مشرف ہونے والے ہی نفع اٹھائیں گے بلکہ وہ ب علم و نظر کے لئے بھی اس میں بہت کچھ ملے گا۔  
بعض ماموں اکابر نے حدیث میں ضرورت سے زیادہ اختلاف سے کام لیا گیا ہے مثلاً

امام احمد بن حنبل اور شہور امام حدیث علی بن المدینی کہ ان دونوں حضرات کا تذکرہ صرف نصف صفحے میں ہے، مگر اس کی وجہ غائب وہی ہے جس کا ذکر فاضل مؤلف نے مقدمے میں کیا ہے کہ ”کہیں تو خود مواد کی کمی ہے اور کہیں نشہ طح کی“ امید ہے دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی باقی نہیں رہے گی، شروع میں چار صفحات کی فہرست کے علاوہ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خلیفہ ہارون رشید دوران کی بیوی زبیدہ خاتون اور ہنزہ بیدہ مک کے عنوان ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مختصر تعارف اور مؤلف گرامی کا مقدمہ بھی ہے جس سے مشتملات کتاب پر خاص روشنی پڑتی ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جبکہ دوسری عبادتوں کی طرح حج جیسی اہم عبادت بھی بڑی حد تک رسمی سی ہو کر رہ گئی ہے اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر عبرت آموز ثابت ہو گا اور اس کو پڑھ کر ہم عبادت حج کی نوک پیم درست کر سکیں گے، اس موقع پر حج کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ ارشاد رہ کر یاد آ رہا ہے

”آخری زمانے میں حاجیوں کی بڑی کثرت ہو جائے گی، سفر کی سہولتیں بڑھ جائیں گی، دولت کی ذرائع ہوں گی، لیکن حالت یہ ہوگی کہ یہ محتاج اس طرح واپس ہونگے جیسے ایک محروم واپس ہوتا ہے، ایک شخص کی سواری اس کو ریگت نڈا اور چیل میدانوں میں بے جائے گی حالانکہ اُس کے گھر کا پڑوسی اُس کے پہلو میں مقیم ہو گا اگر وہ اُس کی غم خواری ناک نہیں کرے گا“ (ع ۳۰)

علیؑ اور اُن کی خلافت تقطیع خورد۔ غنیمت۔ ۱۴ صفحہ ۱، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجددہ روپیہ ۱۰۔ ملک دین محمد انڈسٹریز اشاعت منڈی ماہی پور۔

سامی تاریخ میں مشہورات صی بہ کا دور تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے بڑا صبر آزمایا ثابت ہوتا ہے۔ اور حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ عہد خلافت کی تاریخ خاص طور پر پیچیدگیوں سے پُر ہے۔ جناب پیام شاہجہاں پوری نے اس موضوع پر قلم اٹھانے ہوئے زمین کی سنگدستی کا اندازہ کر لیا ہے اور کافی طور پر روایات کی چھان بین میں، حتیٰ ط سے

کام لیا ہے۔ اور اس عہد کی تاریخ خالص تاریخی نقطہ نظر سے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم کہیں کہیں عقیدت مندی تاریخ نویسی کے ذرائع پر غالب آگئی ہے۔ یقیناً حضرت علیؓ جیسے بلند پایہ صحابی و خلیفہ راشد کی ذات سے عقیدت مندی نہایت خوش آئند ہے لیکن حضرت معاویہؓ کی روش پر غامہ فرسائی کرتے ہوئے انھوں نے تاریخ نویسی کے مقررہ اصول سے ہٹنا کیوں کر گوارا کر لیا اس پر تعجب ہے غالباً اس ایک طرف عقیدت مندی کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ۔ ”اگر کسی شخصیت کے متعلق کوئی عقیدہ مندانہ جملہ قلم برداشتہ نہ ہو دیا تو اس کی وجہ بھی یہ ہوگی کہ تاریخی واقعات نے اس شخصیت کے متعلق میرے دل میں عقیدت کا جذبہ پیدا کر دیا ہو گا تو یا پھر بھی بنیاد عقیدت نہ ہوئی بلکہ تاریخ ہوئی۔ (ص ۱۷) کیا اچھا ہوتا کہ مؤلف اپنے عقیدت کے جذبہ پر قابو پا لیتے اور قلم برداشتہ جملوں پر صحیح تاریخ نویسی کی خاطر خط نسخ پھیر دیتے پھر ان کا یہ دعویٰ بڑی حد تک صحیح ہوتا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے خالص تاریخی نقطہ نظر سے لکھا ہے۔

کتاب میں بعض فروگزشتیں بھی نظر آتی ہیں حضرت علیؓ صلوات اللہ علیہ کے کاتب تھے، سر تیسرے الفس کے امیر بھی آپ ہی تھے۔ قریش کے نام حاطب بن بلتہ کا خط آپ کے عورت لے جا رہی تھی اس کے تعاقب کرنے والوں میں بھی آپ کا نام آتا ہے۔ ان باتوں کا ذکر مؤلف نے نہیں کیا ہے۔ ان باتوں کے باوجود کتاب نہایت نکتہ سے لکھی ہے اور میں اس پر کثرتاً و مطامعاً مال بصیرت تقطیع خرد۔ ضخامت ۱۶ صفحات، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد کم پتہ :- سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی۔

یہ مجموعہ ہے چند مضامین کا جن میں سے کثر قرآن پاک کی کسی آیت یا کسی خاص لفظ کی تفسیر ذیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے والے جناب عطاء اللہ پالوی اس خاص طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا ردِ حدیث دُستِ جس کا شیوہ بن چکا ہے بہر حال۔ فدویہ، حکمت، امی، آدم و اسی طرز کے عنوانات پر کل دس مضامین ہیں



جن کی خصوصیت بقول مؤلف یہ ہے کہ ”اس کے مطالعہ کے وقت غالباً ہر بات آپ کے سامنے نئی شکل میں آئے گی اور آپ دیکھیں گے کہ وہ اس سے قطعاً مختلف ہے اور ہوگی جو ہم اور آپ اس کے بارہ میں اب تک سنتے اور ہر کتاب میں پڑھتے آئے ہیں۔“  
مجموعہ میں جا بجا مفسرین، محدثین اور صوفیہ کا تمسخر اڑایا گیا ہے جس کی توقع سنجیدہ قلم سے نہیں کی جاسکتی۔ (معصومی)

”ہمدرد و مطلب“ افادات جناب حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۸ قیمت ایک روپیہ شایع کردہ ہمدرد و داخانہ (وقف) دہلی ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جہاں دوسرے عجائبات کا ظہور ہوا ان میں ایک عجوبہ ”ہمدرد و داخانہ“ کے کاروبار کی وسعت و افادیت بھی ہے، یوں تو یہ دو خانہ کم و بیش پچاس سال سے قائم ہے سین تقسیم کے بعد سے ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ اس نامی، گرامی دو خانے کی خدمات کی وسعتیں دیکھنے سے تعجب رکھتی ہیں، ہندوستان میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب اور پاکستان میں ان کے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید صاحب دو خانے کی جس قابلیت، محنت، سہولت اور حسن تدبیر سے بد رہے اور ترقی دے رہے ہیں اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے ملک کے ان دونوں لائق فرزندوں نے اپنے پیش را اور صلاحیت کار سے طب یونانی کا نہ صرف نام روشن کیا ہے بلکہ اس کی جڑوں کو بھی بوڑھٹوں میں دوبارے کھڑی کی جا رہی تھیں منصوبہ ط کر دیا ہے۔ دو خانے کا پورا کاروبار وقف ہے اور اس کی آمدنی سے طب سے متعلق مختلف شعبوں کو ترقی دی جا رہی ہے اور جامعہ صبیہ جیسے دارس بھی چلنے لگے ہیں۔

دو خانے کی وسعتوں و ترقی پذیر یوں کی طرف ”ہمدرد و مطلب“ کی وسعت و شہرت بھی غیر معمولی ہو گئی ہے، اس میں روز بروز ایسا اضافہ ہوتا ہے جس کا مدائنہ ہمدردی اور ضیاء کے ساتھ کیا جاتا ہے، مزید چار سو روپے کا دستور مدائنہ جس کو اس وقت مدینہ سے مرتب کیا گیا ہے ورنہ محکمہ انس و کثرت سے واقع ہو۔ ان چیزوں کے معیاریت

مع غذا پر مبنی اور ہدایات درج کئے گئے ہیں، ”ہمدرد طب“ کی ترتیب نہایت دل پذیر ہے اس میں امراض کے نام عربی یا فارسی، سنسکرت، و گندیازی تینوں چاروں زبانوں میں صحیح تلفظ کے ساتھ دیئے گئے ہیں پھر مرض کی تشریح و تفصیل و اسباب و مرض کی تشخیص کے بعد مختلف دوائیں تجویز کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ غذا اور پرہیز سے متعلق بصیرت، فروز ہدایات بھی، ”ہمدرد مطب“ عام مریضوں کے علاوہ نجی طور پر مطب کرنے والے طبیبوں کے لئے بھی ایک اچھے رہنما کا کام دے سکتا ہے اور اس طرح اس کی فادیت سے بے شمار دشمن مستفیض ہو سکیں گے۔  
(دع ر)

ابوالکلام آزاد زہن ناتھ آزاد نامہ اور فروغِ اردو و کھنوقیمت خیر نے بیٹے

جلن ناتھ آزاد سے دو اسکے نہایت ممتاز و پختہ کلام شائع ہیں، انھوں نے علامہ، قہار جیسے بگائے روزگار سے نہ صرف فیض صحبت ٹھایا ہے بلکہ ان کی خصوصیت بھی اپنے اندر سمولی ہیں، بقول ڈاکٹر تاثیر مہم ”جلن ناتھ کی وہی ادبی روایات ہیں جو غالب، اقبال، نسرت، مودنی، جوش و چہلست میں وہ ششک میں تازگی، ورسوز و گداز کے ساتھ ان کے کلام میں یک عجیب طرح کا، دلی تو زن پیدا ہوتا ہے جس سے ان کے شاعرانہ دست کا اندازہ ہوتا ہے میں ان کا یہ شعر کش تیرھا کرتا ہوں۔

عشق کے حضور میں سوخ رہ دو تو ہو گئے دامن حیات اگر تاتار ہے تو کی

”ابو کلام آزاد“ ان کی تازہ ترین نظم ہے جو موسیٰ آزاد موسیٰ، دست یرکشی کی ہے نظم ۳۲ مک ایک

بند، شریگی اور خوش حقیقت میں ڈو، تو ہے دو بندہ جتہ بند۔

(۱) گر حیا سے دہلی: ترے دین میں جینے ہیں بہت تیرے ہر گوشے میں پوئیہ: خیرین ہیں بہت

تیری مٹی میں نہاں ہے تیرے سینے میں بہت تو وہ دریا ہے گرم جس میں سینے میں بہت

آج لیکن تجھ میں اک خرز من خوابیدہ ہے بکر صدق و عفا و علم و فن خوابیدہ ہے

۲۰ جس کی ساری دست تھی، ستان علم و فن جس کی موجِ نعل سے آباد تھا اپنا چین

آج سوتا ہے تری مٹی میں وہ ناز و من جس کو کہتے آبروئے شیخ و خیر برہمن

نور سے محروم اک ہیرا ترے دامن میں ہے جس نے غلٹ کا جگر حیرا ترے دامن میں ہے

# برہکان

شمارہ ۳

جلد ۴

ستمبر ۱۹۵۸ء مطابق صفر المظفر ۱۳۷۸ھ

## فہرست مضامین

نظرات

۱۳۰ سید احمد کبر آبادی

اسلام کا نظام امن و امان

۱۳۳ مولانا محمد خیر الدین صاحب مفتاح  
دارالافتار دارالعلوم دیوبند

عربی کی ایک قلمی کتاب سے

۱۴۹ جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فائق

تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۵۹ استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی

جدید عراقی شاعری کے رسپنا

۱۵۹ جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب رشید ایم بی

زہادی اور موصافی

۱۶۰ جناب سید نعیم الدین صاحب ہاشمی

اسٹیل خاں بجدی اور اس کی تصانیف

۱۶۱ جناب پروفیسر نظام الدین صاحب

دنیا کے اسلام

۱۶۲ ایس گوریچہ ایم۔ اے

ادبیات

۱۸۵ جناب سید احمد علی صاحب سیاب ٹمکی

قصیدہ

جناب آلم مظفر نگر

غزل

تبصرے



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# ظلمت

اس مرتبہ دوم آزادانہ وقت پر بعد جب سورہ یٰہنہ نے یہاں سورت کے چار بڑے فاصلوں کو ایک خاص اعزاز کی سند سے نواز دیا ہے ان کے ساتھ ہی ہمارے مخدوم ڈاکٹر محمد رفیع نے یہ نکتہ اُچی کو بھی عربی کے ایک نامور فیاض و محقق کی حیثیت سے یہ اعزاز عطا فرمایا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی ٹھوس استعداد اور بلند پایہ علمی تحقیقات و وسعت نظر کی بنا پر نہ صرف ہندو پاک میں بلکہ باہر کے علمی حلقوں میں بھی مشہور ہیں۔ موصوف نے فن حدیث پر جو مستقل تحقیقی کام کیا ہے اس کے کچھ حصے اردو اور عربی میں شائع ہو چکے ہیں۔ آج کل وہ ان سارے کاموں کو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں انگریزی زبان میں مرتب کر رہے ہیں۔ ان کی کتاب ”عربی و فارسی میں طبعی ذخیرہ ادویات کا مطالعہ“ جو ان کی سابقہ کی تحقیقی و مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ چہ روز میں برس میں جانے والی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا جنس و مقام یہاں ہے ورنہ میں بھی سب اس وقت ۱۹۵۱ء میں جو انڈینیشن اور نیٹس کانفرنس انڈین میں منعقد ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب نے اس میں حکومت ہند کی نمائندگی کی تھی۔ یہ اعزاز اب ہر سال ہی کسی کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آزاد ہندوستان میں سب سے پہلے شخص ہیں جن کو صدر جمہوریہ نے عربی میں علمی فعالیت کی بنا پر اردو میں ایک سند خاص عطا فرمائی ہے اور ساڈھوی ۱۰ روپے سالانہ کا وظیفہ اور ایک خلعت بھی عطا فرمایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو دل مبارک ہو پیش کرتے ہیں۔

حافظ علی ہارون نے اردو زبان کے پڑھنے والے اور دینی قومی کارکن ہیں۔ مولانا ابو نظام آزاد کے ساتھ ہی آپ کا خاص قرب رہا ہے۔ موصوف نے ماہنامہ ”آج کل“ بابت اگست ۱۹۵۸ء کی شاعت ”ابو نظام مذہب پر ایک مضمون“ میں لکھا ہے کہ ”۸۶ پر چکے ہیں کہ“

”یہ عالمی سطح پر مشہور عالم مذہب و عقائد ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے قلم سے کلام دیا۔ انھوں نے اردو و ہندی زبانوں میں اس پر اس نے جب مولانا کے فلسفوں کی ترویج کی ان کی رائے میں سب کاموں میں مشہور ہیں۔ ان کے مختلف کلامات ہیں اور ان کے کلامات میں کلمہ پڑھتے

رہتے ہیں مگر ان مختلف ممالک کے لوگوں اور مختلف زمانوں کے لئے اسلام ایک ہی رہتا ہے۔ لہذا اسلام کا کوئی مخصوص کلمہ نہیں ہو سکتا وہ (ابراہیم علیہ السلام) یہ بھی فرماتے تھے کہ کلمہ ایسا فہم ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی اور مختلف ملکوں میں مختلف مفکرین نے اس کا استعار مختلف معنی میں کیا ہے۔“

اس عبارت میں حافظ صاحب نے مولانا آزاد کی نسبت اسلامی کلچر کے متعلق ان کی جو رائے ظاہر کی ہے وہ سخت مفاد انگیز اور خاص طور پر مسلمانان ہند کے لئے جو دن رات اسلامی مہاجر اور اسلامی ثقافت کے تحفظ و بقا کے لئے کوشاں ہیں شدید راجن کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا کہ صرف سے اسلام کا کوئی کلچر ہی نہیں ہر مذہب اور تاریخ کے ان تمام مسلمات است انما ض کر لینا ہے جن پر ادب و فکر و نظر کا اب تک اتفاق رہا ہے اور جس کو خود قرآن نے بار بار یقینی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے اس بنا پر ہم کو یقین ہے کہ حافظ صاحب نے مولانا کی رائے اور اس کی نقل کی ہے۔ گفتگو میں یقین مولانا نے اصل معاملہ کے سب پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہوگی اور اس سے حقیقت واضح ہوگئی ہوگی۔ اب حائل صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کی مولانا سے جو مفصل مشورہ ہوئی تھی اس کو ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر کے تاریخ فرمادیں۔ برہان کے صفحات اس خدمت کے لئے حاضر ہیں۔

جب سے وزیر اعظم جواہر لال نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں رد و باطل کے متعلق ایک پرہوش تقریر کی اور ساتھ ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی میں اردو کے متعلق ایک نہایت اجماع و تہارتی رین و سوش منظور کیا ہے اردو کے متعلق ملک کی عام فضا بہت کچھ امید افزا نظر آتی ہے۔ اگرچہ کسی صورت میں اردو کو عدالتی رہنمائی ہونے کا شرف تو اب تک عین نہیں ہوا اور پیش بائیس لاکھ کے شیعوں سے جو یہ مذہب صمد رتبہ جو یہ خدمت میں پیش کیا گیا تھا اب تک اس کا کوئی جواب نہیں ملا ہے تاہم جوہر کی ششہ کو مرکزی وزارت داخلہ کی طرف سے جو پریس نوٹ شائع ہوا ہے اس نے اردو کی ترقی و ترقی کوئی حیرت و شگفتہ اور مضبوطی سے بننے میں نوٹ کا پہلا اثر تو اتر پردیش کی حکومت پر یہ ہوا ہے کہ اس نے یہ پیکر کے ساتھ عربی و اردو کو تسلیم کر لیا ہے۔ حالانکہ پہلے یہ گورنمنٹ سے اردو کے وجود کی قائل ہی نہیں تھی اس کے بعد اتر پردیش گورنمنٹ نے اپنے مختلف ماتحت محکموں کو بھی ہدایات جاری کی ہیں۔ وزارت داخلہ کے یہ نوٹ ہر حال نظر کر جائے اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ توجہ جو ہر اردو دانشور کو دینا چاہیے۔ اس کے وزیر اعلیٰ کے امداد پر خط لکھیے ہیں انہیں تو اس سے کہیں کہ اس کے متعلق اس کی توجہ کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ سیر نہ تھی بلکہ یہ شہریت اس کی توجہ کی ہے۔

سے عمل ہوا اور دونوں کے مطالبہ کا منشا ایک حد تک پورا ہو جائے گا۔  
تقسیم ہند کے مصائب میں سے ایک مصیبت یہ رہا ہوئی ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی اور ان کے املاک پر غارت گری کرنے والوں کی بن آئی ہے اور زندگی کا کوئی گوشہ اس سے محفوظ نہیں تاثرین کتب کی جماعت جو اشاعت عام جیسی مقدس ذمہ داری کی حامل ہوتی ہے افسوس ہے کہ وہ بھی اس وبائے عام کا شکار ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہندو پاکستان میں ایک ملک میں دوسرے ملک کے مصنفین کی کتابیں بغیر ان کی اجازت کے دھڑلے کے ساتھ شائع ہو رہی ہیں۔ اخلاقی نقطہ نظر سے تو یہ حرکت افسوس ناک ہے ہی علمی اعتبار سے بھی اس کا الم انگیز نتیجہ یہ ہے کہ علمی ترقی کی رفتار کتنی نظر آ رہی ہے اور اس سلسلہ میں جدید کوشش و کاوش کا دروازہ بند ہوتا معلوم ہوا ہے۔

یہ افسوس ناک صورت حالات کئی سال سے جاری ہے۔ ہندوستان کے بعض زخم خوردہ مصنفین نے اس سلسلہ میں پاکستان کے ادب باب حکومت کو توجہ دلائی تو ان کا جواب یہ تھا کہ دفعات کے تحت قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ اس جواب سے اتنی بات تو صاف ہو گئی کہ ایک ہندوستانی مصنف یا ادارہ کسی پاکستانی پبشر کی غارت گری کے خلاف ذاتی طور پر قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے مگر ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں اپنے ملک کی حدود کو پار کر کے دوسرے ملک میں قانون و انصاف کے دروازہ کو کھٹکھٹانا کس قدر مشکل ہے۔ اخبار اسٹیشن مین کی ایک اطلاع سے یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ حکومت ہند کی سٹیفک ریسرچ اور کلچر کی وزارت نے اس علمی و اخلاقی نذر کی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں پہل کی ہے اور حکومت پاکستان کو کچھ تجاویز ارسال کی ہیں ان تجاویز کا خلاصہ یہ ہے

۱۱۔ دونوں ملکوں کے مابین ایک ایسا معاہدہ عمل میں آئے جس سے ایک ملک میں دوسرے ملک کے مصنفوں شاعروں اور دیوبند کے چالی۔ اسٹ کا تحفظ کیا جائے۔ ۱۲۔ اس معاہدے کی رو سے دونوں ملکوں کی حکومتیں ایسے لوگوں پر مقدمہ چلائے، ورنہ ان کو سزا دینے کی ذمہ داریوں جرحہ پی۔ اسٹ کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ (۳) جرم ثابت ہونے پر جرموں پر جرمانہ بھی کیا جائے اور یہ رقم ان مصنفوں کو ادا کی جائے جن کی حق تلفی کی گئی ہو حکومت ہند نے یہ تجاویز پیش کر کے اپنی ذمہ داری پوری کر دی ہے اب حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ کشادہ دلی کے ساتھ ان تجاویز کو منظور کر کے اپنا دینی و اخلاقی فرض ادا کرے۔

معاہدہ ہندوستان کی اس دہشت سہیں اتفاق ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے اخبارات و رسائل کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے قلم کی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں آئیں ورنہ (۱) مجرم پبشروں کے اس ظلم کے خلاف پرزور احتجاج کریں۔ (۲) اپنے مقالات کے ذریعے ایسے پلٹ وں سے عوام کو متنفر کریں (۳) اپنے اخبارات

میں ان کے جوڑی کے مال کے اشتہارات شائع نہ کریں (۴) اپنی حکومت پر زور دیں کہ وہ اس لوٹ مار کے سد باب کے لئے بلاخر اقدام اٹھائے اور خرموں کو کیفر وادار تک پہنچائے۔



# اسلام کا نظام امن و امان

(مولانا محمد ظفر الدین صاحب دارالافتاء دارالعلوم دیوبند)

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ فرمائیے برہان ہدایہ جولائی ۱۳۳۴ء)

اسلام میں سزائیں اسلام میں دو طرح کی سزائیں ہیں، ایک کی تعبیر ”حدود“ کے نام سے کی جاتی ہے، اور دوسرے کی ”تعزیر“ سے، حدود ان سزاؤں کے نام ہیں جن کی سزائیں قرآن و احادیث میں صراحت کے ساتھ متعین ہیں، در تعزیر عام و امیر کی رائے پر محمول ہوا کرتی ہے، تعین صراحت کے ساتھ قرار دینا نہیں ہوتی۔

قصاص حدود میں سے ہے، یعنی یہ سزا رب العزت کی متعین کردہ ہے، کہ قاتل کو جرم کے ثبوت یا اقرار کے بعد قتل کر دیا جائے، اس سزا میں کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے رد و بدل کر دے، خواہ امیر مٹو سنیں ہو، اس کا نائب، بلکہ وہ اسی سزا کے اجراء پر مجبور ہے، اگر وہ قونی دائرہ میں رہ کر یہ نہیں کرتا، تو عند اللہ خود مجرم ہے۔

اس وضاحت کے بعد یہ بات بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو سکتی ہے، کہ یہ سزا اپنی جگہ بالکل درست اور جرم کے عین مطابق ہے، کہوں یہ یہ مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور اس کے علم سے بڑھ کر کسی اور کا علم و فہم ہو سکتا ہے، آگے یہ بات بھی ثابت کی جائے گی کہ یہ سزا عقل و خرد کے ہی باطنی مطابق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ایسا ہی ہے کہ یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اللہ کی تعین رب عزت کا بڑا احسان ہے، کہ اس نے ہمیں سب سے بہکدوش رکھا، و ہماری عقل کو متوجہ نہیں ڈالا، ورنہ ممکن تھا اس سب میں ہم سے بغض ہو جاتا، و یہ مسکین بیچارے

باعثِ تراع بن جاتا، جیسا کہ اس دور میں دیکھا جا رہا ہے۔

اس کا بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ قاتل اور اس کے حامیوں کے دلوں میں حاکموں کی طرف سے نفرت و انتقام کا جو جذبہ پرورش پا سکتا تھا، وہ سرے سے ختم ہو گیا، اور اپنی جگہ وہ اس سلسلہ میں ساری تنگ و دو سے بچ گیا۔

اس طرح کی سزاؤں کے اجراء کے سلسلہ میں جو اسلامی قوانین میں، وہ سراپا رحمت ہیں، جس کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئے گی۔

سزائیں اور جرائم اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ دنیاوی سزائیں جرم کے سلسلہ میں اس قدر ٹھوس اور محکم بنیاد پر قائم ہیں کہ کہیں سے ان میں خامی اور کمزوری کا نام و نشان تک نہیں ہے، اور ان کے اجراء کے بعد غیر ممکن ہے کہ جرم کی رشتہ رہا رہے، اس لئے کہ رب العالمین نے ہر ایک جرم کی سزا اس طرح متعین کی ہے، کہ وہ اپنی جگہ بالکل فٹ اور مناسب ہے، اور ساتھ ہی انت فی نفسیات کے مطابق، اسی طرف حافظ ابن القیم نے اشارہ کیا ہے

و در تب علی کل جنایت ما یناسبھا  
ہر جرم کی سزا بالکل اس کے مناسب و بخیر کی

من الحقوبۃ و یطیق بہا من  
گنی ہے جو اس کے لئے ماعل درست ہے،

النکال (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۸)

قتل کی شاعت جرم میں [جرائم کی فہرست سب سے پہلی جگہ ہے، در سوچا جائے، کہ کسی کو ناحق قتل کرنا، کتنا بڑا جرم ہے، اگر یہ جرم تمام جرائم میں عقل کے نزدیک عظیم تر معلوم ہو، کہ قاتل نے واقعی اپنے اس ناجائز فعل سے ملنے والے اس دامن کی دیوار میں شکاف ڈال دیا ہے، ملک میں خوف و ہراس پھیلانے کا ذریعہ بنا ہے، سب تو ہی اس کے اس بُرے فعل نے مقتول کے وارثوں کو نقصان پہنچا ہے، اس کے حباب کی بزم سوئی ہوئی ہے، اس کے گھر میں ویرانی کی ہے، اور نہ سب سے زیادہ کڑی ایک قیمتی جہاں مفقود ہوئی ہے

جس سے ممکن تھا قوم و ملک کو مستقبل میں بے عدوانہ پہنچا، — تو پھر دیکھنا چاہئے کہ کیا اس کی سزا جو اسلام نے مقرر کی ہے، اس میں کوئی افراط و تفریط ہے؟ یقین کے ساتھ یہ بات ہی جاتی ہے کہ اس سلسلہ میں اسلام نے جو سزا متعین کی وہ ہر پہلو سے درست ہے، اور ذرہ برابر اس میں کوئی انفرافری نہیں ہے، اگر اس جرم عظیم کی یہ سزا نہ ہوتی تو البتہ حیرت ہوتی۔

اجرا قصاص کے شرائط اسلام کا قانون یہ ہے کہ قصاص کا اجرا ہر ایک کے لئے جائز نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ اسلامی حکومت کے ہاتھ میں ہے اور حکومت بھی اس وقت اس کا اجرا کرے گی، جب معاملہ کی وہ پوری تحقیق کرے اور ثبوت یا اقرار سے قاتل کا جرم اس طرح ثابت ہو جائے، کہ اس میں کوئی اشتباہ باقی نہ رہے، سب تو ہی اس کے نافذ کرنے میں کوئی امر شرعی مانع نہ ہو۔

مختصر یہ کہ کتاب و سنت کی روشنی میں جب قاتل کا قتل کرنا ثابت ہو جائے، اور عدالت اس سلسلہ میں ڈیڑھ فیصدت دے۔ تو اس وقت پھر کوئی طاقت قاتل کو قصاص سے نہیں بچا سکتی ہے۔

دلی مقتول کے اظہارِ قاتل کے قتل کا جب فیصلہ نہ دیا جائے گا، تو اس وقت مقتول کے دلی کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ خود کو اربابہ میں لے اور قاتل کو اپنے ہاتھ سے قتل کر کے سکین خاطر حاصل کرے، یا پھر اگر وہ کسی وجہ سے خود قتل کی جرأت نہیں کر سکتا ہے تو کسی اور کے اس معاملہ کو سپرد کر دے، کہ وہ اس کی طرف سے قاتل کے قتل کا فریضہ ادا کرے۔

وہ دن نفس بھیسہ و بے نیہ بان	میں رزنی مقتول کو حق ہے کہ خود قتل کرے
یا مرغیروہ نفس زکات کی احسان	یا اپنے نائب کے ذریعہ سے اس طرح کہ وہ اپنے
مستدر علی از استیفاء و مفسدہ	سوا کسی دہ کو اپنی طرف سے قتل کرنے کا حکم دے



لضعف بدنه | ولضعف قلبه  
 اولقلته هلاکة الیه ینحتاج الی  
 الانابة الا انما لا بد من حضوره  
 عند الاستیفاء (برائع الفناج ج ۲ ص ۲۲۶)  
 کیوں کہ ہر شخص بذات خود اس طرح قتل پر قدرت  
 نہیں رکھتا ہے، اس کی کئی وجہیں ہوتی ہیں،  
 کبھی بدن یا قلب کے ضعف کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی  
 اس سلسلہ کی معلومات حاصل نہ ہونا، ایسی حالت  
 میں نائب بنانا ناگزیر ہوگا، لیکن اتنا پھر بھی ضروری  
 ہے کہ وہ قتل کرنے کے وقت خود موجود رہے۔

شبہات اور اس کے جوابات | قصاص کے سلسلہ میں جن لوگوں نے یہ اشکال پیش کیا ہے، کہ خوں  
 ریزی قتل کے ذریعہ کیوں کر بند ہو سکتی ہے، اس کے جواب میں حافظ ابن القیمؒ نے بڑی  
 عمدہ بات لکھی ہے، کہ غصہ کے تپوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلو پر غور نہیں کیا ہے،  
 اس لئے ان کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا، اور وہ شبہات و شکوک کے دلدل میں پھنس گئے۔  
 اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ ہے کہ قتل و خوں ریزی کے مجرمین کو ان کی سزا دینا،  
 عقل اور شہری حقوق کا تقاضا ہے یا نہیں، اور اس طرح امن و امان کی بحالی حکومت  
 کا فریضہ ہے یا نہیں؟ اگر جواب میں یہ کہا جائے کہ سزا دینا اور امن و امان کا قایم رکھنا  
 ضروری نہیں ہے، تو دنیا کا کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی اس جواب کو ایک لمحہ کے لئے  
 تسلیم نہیں کر سکتا ہے، کیوں کہ جرائم ہوں اور ان کی سزائیں نہ دی جائیں، اس کا مطلب  
 یہ ہوگا کہ ملک کا سارا نظام درجہ برجم ہو جائے، اور سپیک کے لئے سکون و آرام حرام قرار  
 دے دیا جائے، کسی کی جان اور عزت محفوظ نہ رہ سکے، اور زندگی و بال بن جائے، —  
 درائر یہ کہا جائے کہ جرائم کی سزا ضروری ہے، اور اس کے بغیر چارہ کار

نہیں، تو اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ جرم کی سزا کس نوعیت کی ہو، یا صرف خانہ پوری کے  
 لئے ہو، یا جرائم کے بند کرنے کے لئے بہرحال عقل کا جواب یہ ہوگا، کہ سزا ایسی ضرور  
 ہونی چاہیے، جو باعث عبرت ہو، اگر ایک طرف خود مجرم کو جرم کے ارتکاب سے روک سکے

تو دوسری طرف دوسرے اسے دیکھ کر اس طرح کے جرائم کے ارتکاب کی جرأت نہ کر سکیں۔ تاکہ امن و امان بحال رہ سکے، اور پبلک اطمینان کی زندگی گزار سکے۔

ملکی مفاد کی حیثیت اتنی بات جب واضح ہو چکی کہ جرم کی سزا ضروری ہے اور سزا بھی ایسی کہ وہ باعثِ عبرت ہو، اور جرم کو روکنے والی، تو اب یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے، کہ قوم و ملک کے امن و امان کی خاطر مجرم کا شخصی نقصان برداشت کرنا ضروری ہے خواہ یہ نقصان جانی ہو، یا مالی، پھر وہ کسی خاص عضو کا ہو، یا پورے جسم کا۔

اس بات پر دنیا کے سارے عقلاء متفق ہیں کہ ملکی مفاد کے لئے شخصی نقصان ناگزیر طور پر برداشت کیا جائے گا، کسی سر پھرے کو ملک میں اودھم مچانے اور بغاوت کی اجازت نہیں دی جائے گی، اگر کوئی احمق اس کے خلاف کہتا ہے تو اسے خود اپنی حماقت پر ماتم کرنا چاہیئے۔

سزا کی نوعیت اب ایک چیز اور قابلِ غور رہ گئی، وہ یہ کہ کیا یہ درست ہوگا کہ جرائم متفاد ہوں، اور سزائیں سب کی ایک، یا جرائم کیسے ہوں اور اس کی سزائیں متفاوت، یا پھر قتل کا تقاضا یہ ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہو، اگر کوئی یہ کہے کہ متفاوت جرائم کی سزائیں ایک سی ہوں، تو ایک احمق بھی یہ سن کر حیح اُٹھے گا، کہ یہ حکمت و انصاف کے بالکل منافی ہے، اسی طرح جرائم سب کے ایک ہوں اور ان کی سزائیں باہم متفاوت جب کہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں تھا کہ ایک ہی جرم، اگر کوئی ہندوستانی کرے تو قتل گردن زدنی اور انگریز کرے تو قتل عفو و درگزر، تو کون سیما الصحت کہہ سکتا ہے کہ یہ عدل و مساوات کے خلاف نہیں ہے۔

نے دے کر بات پڑے گا کہ تقاضائے انصاف یہی ہے کہ جیب جرم ہو، اسی کے مطابق اس کی ججی تلی سزا بھی دی جائے، جس میں کسی سے نہ تفریق ہو اور عاقبت کا معاملہ نہ کیا جائے، چنانچہ شریعت کا یہی فیصلہ ہے کہ سزا جرم کے مطابق ہو اور قنون میں

امیر و غریب، شاہ و گدا، شریف و کمینہ، اور ادب و پستی کی کوئی تمیز نہ ہو، بلکہ جو بھی جرم کا ارتکاب کرے اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

قصاص قتل کی روشنی میں جان بوجھ کر جو شخص کسی کو قتل کر ڈالے اس کی سزا اسلام نے قصاص تجویز کی ہے، جس کی تفصیل گزیر چکی، یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قتل عمد کی سزا جو قصاص تجویز کی گئی ہے، وہ کس حد تک مناسب ہے، اس سلسلہ میں ماقضائین القیم لکھتے ہیں

اسلام نے سزائیں جرم کے اندازہ سے مقرر کی ہیں، جس میں درجہ سے لے کر قتل

نفس تک کی سزائیں ہیں، چنانچہ جب جرم اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے اور اس جرم کی قباحت حد سے بڑھ جاتی ہے، تو ایسے موقع سے اسلام اتلاف جان کی سزا تجویز کرتا ہے جیسے کوئی کسی کو ناحق قتل کر ڈالے، یا کوئی مسلمان دین حق سے پھر جائے، یا ایسے جرم کا ارتکاب کرے، جس کا ضرر غیر محدود ہو تو ان صورتوں میں مجرم کی سزا یہی اتلاف جان ہوتی ہے۔

جن ظاہر ہیں نگاہوں میں بیزار باعث مفسدہ ہے، ان کو غور کرنا چاہیے کہ یہ مفسدہ

بہر حال محدود ہے لیکن اس سے متعلق جو مصلحتیں اور فوائد ہیں، وہ اس مفسدہ گونا گوں

بڑھے ہوئے ہیں، جس کی طرف قرآن نے اپنے معجزانہ انداز میں اشارہ کرتے ہوئے کیا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاتٌ يَا أَيُّهَا الْمُبِينُ اور تمہارے لئے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقید

تعالکم تقونہ تاکہ تم سمجھتے رہو۔

قصاص بہارت ہے یعنی اگر قصاص کا خدائی قانون نہ ہوتا، تو پورا عالم تہس نہس ہو جاتا، اور

انسان بعین معین کو موت کے لھاٹ انا نے میں ذرہ برابر دریغ نہ کرتا، کوئی اقدامی حملہ

کرتا اور کوئی رد عمل کے نام پر، قصاص کا قانون دراصل اتنی اقدامی اور رد عمل کی خوں یزی

سے پیدا ہونے والے مفسدہ کا سد باب ہے، لہذا جن لوگوں نے اپنی کوتاہ نظری اور غلط فہمی

سے یہ سمجھا ہے کہ قصاص کی مثال ”اذانۃ النجاسة بالنجاسة“ کی ہے، ان کی عقل پر



پردہ پڑا ہوا ہے ورنہ وہ ایسی بات ہرگز نہ کہتے، کیوں کہ قصاص دراصل اس نجاست کی پاکیزگی ہے، جو جرم کے ارتکاب سے پیدا ہوتی ہے۔

انسان کے مفاد کے لئے | اُتلافِ جان کی یہی ایک صورت نہیں ہے کہ احمقوں کی جماعت جانوروں کا ذبح ہے | اسے دیکھ کر چیخنے لگتی ہے، آخر کیا حیوانات کے اندر جان نہیں ہے، ہے اور یقیناً ہے، جس سے دنیا کا کوئی صحیح العقل انکار نہیں کر سکتا ہے، مگر با اس کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بہت سے جاندار انسان کی راحت اور اس کی مصلحت کی خاطر بے دردی سے ذبح کر دئے جاتے ہیں اور کوئی بھی اسے برا نہیں سمجھتا بلکہ وہ اپنا انسانی حق سمجھتا ہے۔ حالاں کہ اس صورت میں بھی جاندار کی جانوں کا اُتلاف ہی ہے۔

بات وہی ہے کہ چوں کہ جانوروں کے ذبح سے جو فوائد متعلق ہیں، وہ کسی گناہ اُتلافِ جان سے بڑھے ہوئے ہیں، پھر یہ کیا ظلم ہے کہ اسلام جب کہتا ہے کہ صالح افراد اور ملکی امن و امان کی بقا کی خاطر مجرم کو قتل کر دیا جائے تو کچھ لوگوں کو یہ مسئلہ قابلِ اعتراض نظر آنے لگتا ہے، اور وہ مجرمین کو بے گناہ صالح افراد کے برابر منوانے کے لئے حماقت سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، حالانکہ سب یہ جانتے ہیں کہ قوم و ملک کی خوش گوار زندگی کا دار و مدار ملکی امن و امان پر ہی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو زمین باوجود وسعت کے اہل زمین پر تنگ ہو جائے۔

کیا کسی کو اس کی اجازت دینا مناسب ہوگا کہ ملک میں قتل و خون کر کے خوف و ہراس پھیلانے، اور اس کو قرار واقعی منرا نہ ملے، یہ بھی کوئی عقلمندی ہے کہ شخصی مفاد کی وجہ سے جماعت کے مفاد کو نظر انداز کر دیا جائے۔

قاتل کی زندگی | پھر قاتل نے جس جان کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، اس کے متعلق بھی اپنے غور کیا کہ اس کی قدر و قیمت اللہ تعالیٰ کی نظر میں کیا ہے اور قاتل کس قدر معتبور، رسولِ کرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

الادھی بنیان السرب ملعون انسان اللہ تعالیٰ کی ایک مضبوط دیوار ہے،  
من ھدم من ملعون ہے وہ جو اسے ڈھائے۔

خود مجرم کو بھی اپنی جگہ سوچنا چاہیے کہ جب اس کے جرم کی وجہ سے قوم و ملک  
کا اطمینان و سکون پامال ہو رہا ہے، امن و امان کی مٹی پلید ہو رہی ہے، اور ملک  
کا حسین چہرہ داغدار ہو رہا ہے، تو وہ پہلے بذات خود اس سے کنارہ کش ہونے  
کی سعی بلیغ کرے، لیکن اگر وہ کامیاب نہ ہو، اور حاکم کے پاس اس کا جرم ثابت  
ہو جائے تو اس سلسلہ میں تسلیم ختم کر دینے میں کوئی ایسی بات نہ کرے، جس سے  
ملک کے وقار کو نقصان پہنچ سکے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جن ملکوں میں قصاص کا قانون باقی نہیں رکھا گیا، یا اس میں  
نرمی اور پلوتپی سے کام لیا گیا، اس ملک کا سکون و اطمینان غارت ہو کر رہ گیا،  
اور امن و امان کا آفتاب گہن میں آ گیا۔

اہلِ قصاص میں کوتاہی و سفارش ابھی وجہ ہے کہ اس باب میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اجماع  
ارت ہے کہ جرم کے ثابت ہو جانے کے بعد سزا کے اجراء میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی جائے،  
ورنہ کوتاہی کرنے والے بھی مجرم کے خانے میں آجائیں گے،

ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قصاص کی اہمیت جتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا  
من قتل عمرا فهو قود و من جل جو شخص عمداً قتل کرے اس میں قصاص ہے اور جو  
دوۃ فعیب لحنۃ اللہ و غضبہ اس باب میں حائل ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت  
و یقیل منہ صرف و لا عذر اور اس کا غضب ضروری ہے، نہ اس سے  
و داؤد و انسائی اس باب میں غدیہ قبول کیا جائے گا ورنہ کوئی

(جمع الفوائد ج ۱ ص ۱۷۱) سفارش۔

قصاص کے اجراء میں جو مانع بنے وہ اسلام کی نظر میں سخت مجرم اور قابلِ ملامت

ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من حالت بشفاۃ دون حد من حد و اللہ فقد شاد اللہ فی حکم رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ)

جس کی سفارش اللہ کے حدود میں سے کسی حد میں مانع بنے (تو وہ ایسا ہے) کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ میں اس کی مخالفت کی۔

قصاص صحابہ کرام کی نظر میں یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثیں بکثرت ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب معاملہ ثابت ہو جائے تو پھر اس سلسلہ میں سفارش یا کسی اور ذریعہ سے اجراء قصاص کو سرگزرد کرنے کی سعی نہ کرنی چاہیے۔ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں اس باب میں کسی طرح کی رو رعایت جائز نہیں تھی، حضرت سعید بن المسیبؓ کا بیان ہے کہ صنعا میں ایک شخص کو کئی آدمیوں نے مل کر قتل کر ڈالا، تفتیش سے سات آدمی شریک ثابت ہوئے، تو حضرت فاروق اعظمؓ نے ان ساتوں کو قتل کر ڈالا۔ اور فرمایا کہ اگر تمام اہل صنعا اس خون میں شریک ہوتے، تو بداشیان تمام کو اس ایک کے بدلے میں قتل کر داتا۔

بخاری کے الفاظ یہ ہیں

لو اشترک فیہ اهل صنعا لم یقتلہم

اگر اس میں تمام اہل صنعا شریک ہوتے تو بلا

(بخاری ج ۲ ص ۲۸۱)

شبہ میں ان تمام کو قتل کر داتا

انسانی جان کی حفاظت حکومت کے ذمہ کس قدر ضروری ہے صرف اسی ایک واقعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، اور اسی سے قصاص کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کیتی اہم اور بنیادی چیز ہے، کہ ایک جان کے لئے فاروق اعظمؓ جیسے مدبر اور دور اندیش فرمانروا اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر اس ایک جان کی قصاص میں صنعا کی پوری آبادی نہ یک ہوتی، تو وہ سب کی سب قتل کر دی جاتی۔

سہ موطا امام مالک



عدم قصاص کا انجام | ہمارے اس دور میں لاکھوں بے قصور جانیں تہ تیغ ہوتی رہتی ہیں مگر کوئی قاتل سے نہیں پوچھتا کہ تو نے یہ جرات بے جا کیوں کی، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قتل و خون ریزی کی وارداتیں دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔

کون نہیں جانتا ہے کہ انسانی طبائع کچھ اس طرح واقع ہوئے ہیں کہ وہ موقع پا کر ظلم و زیادتی سے نہیں چوکتے، اور اسی طرح اپنے غصہ کی تیزی اسے برداشت نہیں ہوتی، وہ پاگل بن جاتا ہے، اور بسا اوقات معصوم جان کے قتل سے اپنے ہاتھوں کو زنگین کر لیتا ہے تو کیا ایسے موقع پر عقل کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ظالم کو ظلم کا بدلہ اور اس کی سزا دے۔ مگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر قصاص و دیت کے مسئلہ میں کسی کو تردد کیوں ہوتا ہے۔

قاتل کے لئے رحم و کرم کی گنجائش | اسلام کے قانون قصاص میں رحم و کرم کی گنجائش ہے، مگر یہ مقتول کے ولی کی صوابدید پر موقوف ہے، اگر وہ راضی ہو جائے، اور قاتل کے قصاص سے درگزر کرے اور دیت قبول کر لے، تو اس صورت میں حکومت قاتل کی جان بخشی کر سکتی ہے یا سرے سے ولی مقتول معاف کر دے، نہ قصاص لے اور نہ دیت، تو اس صورت میں بھی جان بخشی کی گنجائش ہے، قرآن پاک میں جہاں قصاص کا تذکرہ ہے، وہیں یہ بھی ذکر ہے۔

تَمَنُّنٌ عَفْوٌ لَهُ مِنْ خَيْرِ شَيْءٍ فَتَبَاَعُ  
بِالْمَعْرُوفِ وَأَدْعُ إِلَيْهِ بِالْحُسْنِ  
ذَٰلِكَ خَفِيفٌ مِّنْ رَبِّكَمُ وَرَحْمَةٌ  
فَمَنْ أَعْتَدَىٰ بُعْدَ ذَٰلِكَ فَعَلَهُ  
عَذَابٌ أَلِيمٌ (بقرہ - ۱۷۸)

پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ تو  
باعداری کرنی چاہئے دستور کے موافق اور ادا کرنا چاہئے  
اس کو خوبی کے ساتھ آسانی ہوگی تمہارے رب کی طرف  
سے اور مہربانی پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس  
کے لئے دردناک عذاب ہے۔

شاید ترجمہ حضرت تھانویؒ اپنے تفسیری ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں

”ہاں جس قاتل کو اس کے فریق کی طرف سے کچھ معافی ہو جائے، مگر پوری معافی نہ ہو، تو وہ سزائے قتل سے تو بری ہو گیا، لیکن دیت یعنی خونہا کے طور پر ایک معین مقدار مال کی بذمہ قاتل واجب ہوگی، اس دقت فریقین کے ذمہ دواہر کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی وارث مقتول کے ذمہ معقول طور پر اس مال کا مطالبہ کرنا، کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے، اور مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ خوبی کے ساتھ اس مال کا مدعی کے پاس پہنچا دینا، کہ مقدار میں کمی نہ کرے اور خواہ مخواہ مال مٹول نہ کرے، یہ قانون دیت اور عفو تمہارے پروردگار کی طرف سے سزا میں تخفیف ہے اور شاہانہ ترحم ہے، ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی پھر جو شخص اس قانون کے مقرر ہونے کے بعد تمدی کا مرتکب ہو، مثلاً کسی پر جھوٹا یا اشتباہ میں دعویٰ قتل کا کر دے، یا معاف کر کے پھر قتل کی پیروی کرے، تو اس شخص کو آخرت میں بڑا دردناک حذاب ہوگا“

اسلامی قانون میں عتہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل میں صرف قصاص تھا، دیت نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اس امت پر رحم فرما کر قصاص کے ساتھ دیت کو بھی رکھا، کہ مقتول کے وارث قتل عمد میں اگر قصاص کے بدلہ دیت قبول کر لیں، تو قصاص سے قاتل بچ سکتا ہے۔

بلکہ شریعت مطہرہ میں اس کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ دلی مقتول سرے سے معاف کر دے، اور اس طرح قاتل اپنے جرم کی سزا سے محفوظ ہو جائے، سید لکونین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من اصاب نفس او خيل فانه  
يخاف واحدی ثلاثاً من العقاب  
واما ان ليقول اماناً ياخذ  
ياوه قصاص لے، یا معاف کر دے اور یا

لے بیان القرآن ج ۱ ص ۱۰۰ سے جمع اقوال ج ۱ ص ۱۰۰ من بخرو

الدیۃ - لابی دارڈ

وہ دیت قبول کرے -

(رجح القوائد ج ۱ ص ۲۷۳)

وارث مقتول کی زیادتی کی رد تمام | ان تین شکلوں کے سوا کوئی چوتھی شکل نہیں ہے، سید الکونین  
صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے

من اصاب بدم او خیل الخیل  
الجرح فهو بالخيار بين احدي  
ثلاث فان اراد الرابع فخذوا  
على يد يه بين ان يقتص او يعفو  
او يلخذ العقل فان اخذ من  
ذالك شيئا ثم عد بعد ذالك  
فله النار خالدا فيه فخذوا بدم  
رواه الدارمي مستوفى بقبول

جسے خون یا زخم کی تکلیف پہنچائی جائے، اسے تین  
میں سے ایک کا اختیار ہے لیکن اگر وہ ان کے  
سوا کسی چوتھی چیز کا ارادہ کرے، تو اس کے ہاتھوں  
کو پکڑو، وہ تین میں سے کسی کو قصاص لے، یا معاف  
کرے اور یا دمت و محمول کرے، ان میں سے  
بہ قبول کرنے کے بعد زیادتی کرے گا تو اس  
کا ٹھکانا جہنم ہے۔

اس حدیث میں صراحت ہے کہ کوئی کسی کو قتل کر دے تو دلی مقتول ان تین  
صورتوں میں کسی صورت پر عمل پیرا ہو کر نپا حق حاصل کرے، اور امن امان کے سلسلہ  
میں جو ناگواری اور برہمی پیدا ہو گئی ہے، اسے سرے سے ختم کر دے، تاکہ پبلک میں  
اس ہونے والے ناخوشگوار واقعہ سے کوئی غلط رجحان پرورش نہ پائے پائے لیکن  
اگر کوئی دلی مقتول یا اس بہ اختیار کوئی صورت تجویز کرے اس پر عمل پیرا نہ ہو، اور اس  
کو بہانہ بنا کر قصاص نہ کر دے کی سعی کرے اور فتنہ کو ہوا دینے کی تدبیر کرے تو وہ اسلام  
کی نظر میں سخت مجرم ہے، اور اس کے لئے جہنم کی وعید شدید ہے۔

دیت کا حق اگر یہ واضح رہے کہ قصاص کی جگہ دیت لینے کا حق ولی مقتول کو قتل کی رضا  
سے حاصل ہوگا، یعنی قاتل اس پر مجبور نہیں ہے کہ ولی مقتول دیت کا مطالبہ کرے تو



خواہ مخواہ ادا ہی کر دے، بلکہ وہ اس کا اختیار رکھتا ہے کہ اپنے کو قصاص کے لئے پیش کرے اور دیت سے انکار کر دے، اسی طرح قاتل کی گلو خلاصی کہ وہ دیت دے کر قصاص سے اپنے آپ کو بچالے، یہ دلی مقتول کی رضا پر موقوف ہے، کوئی دلی مقتول کو دیت قبول کرنے اور قصاص سے درگزر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا ہے۔

قتل عمدہ پر اسلامی قانون انتقام کا قتل عمدہ کے سلسلہ میں اختصار کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا، اس سے یہ بات خوب اچھی واضح ہو کر سامنے آگئی ہوگی، کہ اسلام کا یہ قانون ہر پہلو سے جامع مانع اور مکمل ہے، امن و امان کا پاس مقتول کے دارمین اور حامیوں کے جذبات کا لحاظ، اور خود قاتل کے ساتھ رحم و شائبہ، کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو تشدد رہ گیا ہو، اور جس پر اسلام نے پوری باریک بینی سے نگاہ نہ رکھی ہو۔

اس سلسلہ میں اسلام نے پہلے موانع کی آہنی دیوار کھڑی کی ہے کہ کسی کو قتل پر اقدام کی جرأت نہ ہو، بلکہ تہدید و وعید ہی اس کے ہاتھوں کو شل کر دیں، پاؤں میں بیڑی ڈال دیں اور دل و دماغ پر کنٹرول حاصل کر لیں، اس طرح امن و امان کی فضا میں برہمی کی سرے سے نوبت ہی نہ آنے پائے، لیکن ان فطرتاً چوں کہ عجت پسند اور ظلم و جہول واقع ہوا ہے، اس لئے بائیں ہمدہ کر گزرنے پر قادر ہے

اس لئے جرم کے ثبوت کے بعد معقول سزا تجویز کی گئی، تاکہ یہ آئندہ کے لئے روک بن سکے، اور مجرمین کے حوصلہ کو پست کر دے اور پھر دہائی دوبارہ ایسے جرم کے ارتکاب کی جرأت نہ کرے، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ملاحظہ فرمائیے

تحریر فرمایا

والمتحقق ما قد بعض امتی  
نعمتی بات زسی سے جو بعض متحج نے کہی ہے  
انما موانع قبل الفعل و سزا لجر  
کہ حدود، فعل سے پہلے یونہی کا درجہ رکھتے ہیں  
بعدہ ای بعد اسرعتہ یا منع  
در گزرنے کے بعد جرم و جناح کا یعنی اس قانون

الاقدام علی الفعل والبقاء ہا بعد  
 يمنع من العود الیہ (مرقاۃ ج ۴ ص ۵۵)  
 کا علم جرم کے اقدام سے روکتا ہے اور سزا کا وقوع  
 دوبارہ جرأت کا دروازہ بند کرتا ہے۔

قصاص کا قانون اسلام | ابن الہمام نے حدود کی انہی حکمتوں کی طرف اشارہ فرمایا

فقہاء کی نظر میں | محاسن الحدود  
 اظهر من ان يذكر البيان او  
 يكتبه البنات لان الفقيه وغيره  
 يستوی فی معرفۃ انہا لا امتناع  
 عن الافعال الموجبة للفساد...  
 والمقصود من شرعية  
 الحدود ان تجر عايتضرس  
 به العباد (مرقاۃ ج ۴ ص ۵۵)  
 حدود کے محاسن اس حد سے باہر ہیں کہ زبان آ  
 ذکر کر سکے اور قلم لکھ سکے، اس لئے کہ فقیہ وغیرہ  
 اس بات کے جانتے ہیں برابر ہیں کہ یہ ان افعال  
 کے روکنے کے لئے ہے جو موجب فساد ہیں اور  
 حدود کے قانون کا مقصد اس چیز کا روکنا ہے  
 جس سے بندوں کو نقصان پہنچے۔

نیز علامہ شمس نے قانون قصاص کی حکمت اور اس کے اسباب کو سامنے رکھتے  
 ہوئے، قانون قصاص کی عذرت پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں سبباً طور پر لکھا  
 الا انه لا يرفع الاقتصاص على الجزر  
 بالوعيد في الآخرة، الجزر انما  
 اقل القيس فان التران من انما  
 ينزجرون في العاجلة بالعقوبة  
 وذلك ما يكون متساوياً وحجفاً  
 به فشرع الله القصاص في الدنيا  
 ليحقق معنى الجزر (مبسوط ج ۲ ص ۵۵)  
 لیکن اگر آخرت کی وعید ہی پر اکتفا کیا جائے تو اقل  
 قیس کے سوا کوئی باز نہ آئے، اس لئے کہ زیادہ  
 زیگ قوی سزا سے ڈر کر بار آتے ہیں، اور یہ  
 اس وجہ سے کہ یہ سزا ہمہگاہ و رتعت کن ہے چنانچہ  
 اللہ نے قصاص و دیت کا قانون زبرد تو بیخ کے  
 لئے نافذ کیا۔

قصاص کا قانون | قصاص کی انہی حکمتوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام نے یہ معاملہ حاکم کے ہاتھ میں

نہیں دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو قصاص جاری کرے ورنہ نہیں، بلکہ حاکم قانون کا پابند ہے، جب جرم ثابت ہو جائے گا اس کو جاری کرنا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ ولی مقتول معاف کر دے، اور اس طرح وہ پچ جائے۔

حکومت کے اختیارات اب سوال یہ ہے کہ ولی مقتول نے معاف کر دیا، لیکن حکومت اسے قصاص میں باایں ہمتہ قتل کرنا چاہتی ہے تو کیا حکومت کو یہ حق ہے، یا نہیں، جواب یہ ہے کہ حکومت وقت کا فریضہ یہ ہے کہ جب ولی مقتول نے معاف کر دیا ہے تو یہ بھی درگزر کرے، لیکن اگر وہ قتل اس طرح کی زیادتی کے ساتھ متعلق ہے، جس کا اثر دور رس ہے اور عوام کو اس سے نقصان ویران میں بغاوت کا اندیشہ ہے تو ایسی صورت میں ولی مقتول کے عفو و کرم کے باوجود حکومت اگر ضروری سمجھے گی تو قاتل کو قتل کر سکتی ہے، مثلاً کسی نے کسی شخص کو مال و دولت کے لالچ میں قتل کر ڈالا ہے، تو علماء کا اتفاق ہے کہ اس صورت میں قاتل قتل کیا جائے گا، ورنہ مقتول کو معاف کرنے کا حق نہیں ہے، ہاں البتہ اگر اس قاتل نے قتل عداوت ذاتی کی بنیاد پر کیا، یا ایسے ہی کسی وجہ سے، تو فیصلہ اجراء قصاص میں اولیاء مقتول کے معاف کرنے کی بنیاد پر ہوگا۔

قصص میں ہتھیار اجراء قصاص میں کون سا ہتھیار استعمال کیا جائے گا، اس باب میں ائمہ کا اختلاف ہے، بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ مقتول کو جس طرح کے ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے قصص میں اسی طرح کا ہتھیار استعمال کیا جائے گا، اور وہ اپنی دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

فَاتَّعَابْتُمْ فَاِذَا قُتِلْتُمْ فَامْتَلُوا  
اور اگر پھر بے پروا ہو جاؤ گے تو تم کو تکلیف پہنچی جائے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ حَرَقَ حَرَقًا هَوَّاهُ وَهَتْ غَرَقًا غَرَقًا  
جس نے کسی کو جلایا اس کو جھونسن گے اور جس نے کسی کو گھونسا لگایا اس کو گھونسا لگائے

اور بعض ائمہ کہتے ہیں کہ قصص کے اجراء میں تلوار استعمال کی جائے، اس لئے کہ



نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے  
لا قود الا بالسيف

اور کوئی شبہ نہیں کہ راجح ہی مسدّد ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام نے ہر چیز میں تسکین پسند کیا ہے، خواہ مخواہ کی سختی کی اس میں گنجائش نہیں ہے، اور یہ مسلم ہے کہ قصاص کا منشا قاتل کو قتل کرنا ہے، نہ کہ اسے ستانا، پھر کون نہیں جانتا کہ تلوار سے یہ کام نسبتاً جلد انجام پائے گا، اور مقصد بھی حاصل ہو جائے گا، اس لئے اسی کے استعمال کا عقل فیصد کرتی ہے۔ حدیث سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان الله كتب الاحسان على كل شيء فاذا قتلتم فاحسنوا القتلة  
واذا ذبحتم فاحسنوا الذبيحة  
وليحد احدكم شفرته وليرح ذبيحته  
اللہ تعالیٰ ہر چیز میں احسان کی حویلی کے ساتھ انجام دینے کو  
ضروری قرار دیا ہے لہذا جب تم قتل کرو تو اچھی  
طرح قتل کرو، اور جب ذبح کرنے چلو، تو خوب  
اچھی طرح ذبح کرو اور چاہتے تم میں سے ہر ایک  
چھری کو تیز کرے اور جانور کو آرام پہنچائے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری حدیثوں کے پیش نظر فیصد کرنا پڑتا ہے کہ دوسرا مسلک  
ہی راجح ہے کہ قاتل کو تھوڑی سی سہولت رہے گی، چنانچہ حافظ ابن القیمؒ لکھتے ہیں  
واذا المکین بدم من موت القتلى  
ومن استحق قتل غموتہ بالسيف  
الفتح له... والموت به اسرع  
الموتات واقهها الله (علامہ مؤمنینؒ)

اس اصول کے تحت اگر کوئی ایسا دغا دار آلہ ایجاد ہو جائے، جو تلوار سے بھی  
زیادہ تیزی سے آدمی کو قتل کر سکے، تو قصاص میں اس کا استعمال درست ہونا چاہیے  
لیکن اگر یہ روئے دار نہیں ہے اور جان لینے میں کچھ کی سی تیزی رکھتا ہے جیسے مردوجہؒ

بھی بھائی بھائی کا اس کا استعمال قصاص کے سلسلہ میں درست ہوگا، یا نہیں، قابل غور ہے، (ناظرین مع ورائل اپنی رائے لکھیں)

# عربی کی ایک قلمی کتاب سے

## تاریخ ہند پر نئی روشنی

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فاروقی استاذ ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۳)

سفر اور حضر دونوں میں سلطان محمد بن تغلق کے لئے اتنے تقارے اور ڈھول بجائے جاتے ہیں جتنے اسکندر کے لئے بجائے جاتے تھے، یعنی دو سو تقارے، چالیس بڑے ڈھول، بیس بگلی اور دس جھانچہ (سُنج) اُس کے لئے پانچوں وقت بھی تقارہ بجایا جاتا ہے۔ سفر میں اُس کے ساتھ ان گنت روپیہ ہوتا ہے اور بے شمار عجیب و غریب سامان، شکار میں اس کے ہم رکاب تھوڑی فوج ہوتی ہے، یعنی ایک لاکھ گھوڑے اور دو سو ہاتھی، ان کے علاوہ لکڑی کے چار محل آٹھ سو اونٹوں پر، دو سو اونٹ فی محل کے حساب سے۔ ہر محل پر کالے ریشم کے پردے جن پر سونے کا کام ہوتا ہے لگے ہوتے ہیں، ہر محل دو منزلہ ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ متعدد خیمے اور ڈیرے ہوتے ہیں۔ جب سلطان تفریح یا اس سے ملنے چلتے کسی کام کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو اس کے ہمراہ تقریباً تیس ہزار سوار ہوتے ہیں، اتنے ہی ہاتھی، اور ہزار کاتل گھوڑے، زین و لگام، اور زیور و طوق سے مزین، بعض کی پوشش پر جواہرات اور یاقوت لگے ہوتے ہیں۔ ابک محل سے دوسرے محل میں شاہی سواری

کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد نجندی نے جو دہلی آکر شاہی لشکر میں ملازم ہوئے، مجھے بتایا کہ جب سلطان کی سواری ایک محل سے دوسرے محل کو گئی تو وہ سوار تھا اور اس کے سر پر چتر لگا تھا اور سلاحدار اس کے پیچھے ہاتھوں میں ہتھیار لئے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے آس پاس تقریباً بارہ ہزار غلام تھے، سب کے سب پیدل، بس چتر بردار، سلاحدار اور حمداور (پارچہ بردار) سوار تھے۔ شیخ مبارک نے مجھ سے کہا: تعلق شاہ کے سر پر سات چتر ہوتے ہیں جن میں دو پر انمول موتی لٹکے ہوتے ہیں۔ اور اس کی نشست گاہ سے شان و شوکت، سج دھج اور سلیقہ میں سوا سکندر اور ملک شاہ بن الپ ارسلان کے اور کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خان، ملوک اور امیر سفر ہو یا حضر جب سلطان کے ہم رکاب ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ جھنڈوں کا ہونا ضروری ہے ایک خان زیادہ سے زیادہ نو جھنڈے اور ایک امیر کم سے کم تین جھنڈے ساتھ رکھ سکتا ہے، حضر میں خان زیادہ سے زیادہ دس گول گھوڑے ساتھ رکھتا ہے اور امیر دو، لیکن سفر میں اپنی قدرت اور وسعت قلب (۹) کے مطابق جتنے چاہے رکھ سکتا ہے۔ جب یہ فوجی افسر باب شاہی پر آتے ہیں تو اس کے سورج کے سامنے اُن کے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اور اس کا سمندر ان کے بادلوں کو نگل جاتا ہے۔ محمد بن تعلق اتنی شان و شوکت کے باوجود بڑا مخیر اور متواضع آدمی ہے۔ ابو صفار عمر بن اسحاق شہلی نے بیان کیا: میں نے دیکھا کہ سلطان اپنی سواری سے اُترا اور ایک فقیر صالح، کے جنازہ کے پاس گیا اور اس کو کندھا دیا۔ بادشاہ میں بہت سی

سہ خندہ ایک مشہور شہر جو ماہراہ النہر میں دریائے سیحوں پر واقع تھا۔



خوبیاں ہیں :- قرآن اور ہدایہ جو حقیقی فقہ میں ہے، اس کو ازبر یاد ہیں، معقولات میں بھی اس کی بنیادیں گہری ہیں، خط نہایت پاکیزہ ہے، اس نے جسمانی، روحانی اور ادبی ریاضت بھی خوب کی ہے، شعر کہتا ہے اور شعر سنانے کی فرمائش بھی کرتا ہے، اشعار کے معانی سمجھتا ہے، علماء فضلاء سے بحث و مناظرہ کرتا ہے، شعراء اور بالخصوص فارسی شعراء کی غلطیاں پکڑتا ہے، جس کی وجہ اُس کی فارسی مہارت اور زبان دانی ہے۔ میں نے اس مسئلہ پر کہ 'کل' کو 'آج' پر کس حیثیت سے 'تَقَدُّم' حاصل ہے اس کو بحث کرتے سنا، منطقی کہتے ہیں کہ 'تقدم' یا تو باعتبار زمان ہوگا، یا باعتبار رتبہ یا باعتبار ذات، اس لئے یہ جائز نہیں کہ تقدم کسی ایک حیثیت سے بھی ہو، تعلق شاہ کی رائے تھی کہ اسی دلیل سے اہل منطق کا مذکورہ بالا موقف ٹوٹتا ہے، کیوں کہ 'کل' کا تقدم 'آج' پر مذکورہ بالا کسی اعتبار سے نہیں ہے۔ (۹) ابوصفار شبلی نے کہا: میں نے سلطان کو سب عالموں سے گو کہ ان کی تعداد بہت تھی، فرداً فرداً باتیں کرتے دیکھا، عمار اُس کے دربار سے منساک ہیں، ماہ رمضان میں ان میں سے ایک ہر روز صبح جہاں کے حکم سے بادشاہ کے ساتھ افطار کرتا ہے بشرطیکہ کوئی نکتہ بیان کرے، سب عالم اس نکتہ پر بادشاہ کے حضور بحث و مباحثہ کرتے ہیں، اور وہ خود ان کے ساتھ باتیں اور بحث کرتا ہے اور ارکان مجلس اس پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ ناجائز کاموں کی وہ بالکل رخصت نہیں دیتا۔ اور غیر شرعی حرکتوں پر کسی کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کی عمل داری میں مجرم کی پشت پناہی کرے، اندر شراب سے تو اس کو سخت چڑھتا ہے، شراب نوشی کی شرعی سزا (اسٹی کوڑے) دیتا ہے۔ سید شریف تلج الدین

بن ابی مجاہد حسن سمرقندی نے مجھ سے کہا: دہلی کے ایک بڑے خان کو شراب کی لت تھی، اور وہ اس کا بڑا عادی ہو گیا تھا، سلطان اس کو منع کرتا لیکن وہ باز نہ آتا، ایک دن بادشاہ کو اتنا سخت غصہ آیا کہ اس نے خان کو گرفتار کر لیا اور اس کی ساری دولت جو تینتالیس کروڑ ستر لاکھ مثقال<sup>۱</sup> سونے کے مسازی تھی، ضبط کر لی۔ بادشاہ کی شراب سے نفرت اور ہندوستان کی کثرتِ دولت کے ثبوت کے لئے یہ قصہ کافی ہے، مذکورہ رقم کا اگر مصری قنطار میں حساب لگایا جائے تو میزان تینتالیس ہزار سات سو قنطار ہوگی اور یہ میزان اتنی بڑی ہے کہ اس کا شمار مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ شریف حسن سمرقندی نے جو دنیا کے سیاح ہیں اور مختلف ملکوں کا گشت لگا چکے ہیں، ہندوستان کی دولت کے بارے میں ایسے قصے بیان کئے ہیں جن کو سن کر عقل حیران ہوتی ہے جیسا کہ ابھی نقل کردہ یا اُس جیسے دوسرے قصے حیرت ناک ہیں۔ محمد بن تغلق کے انعامات اور داد و دہش کے کارنامے ایسے ہیں جن کو دنیا اپنے محاسن کے صفحات میں جگہ دے گی اور زمانہ اپنے ہاتھ کے روشن گوشوں پر ثبت کرے گا، ان میں سے چند یہاں بیان کرتے ہوں۔ شیخ مبارک نے مجھے بتایا کہ یہ سلطان ہر دن پورے دو لاکھ (تینکے) خیرات کرتا ہے، جو شام و صبح کے سکون میں سولہ لاکھ درہم کے مسادی ہیں، کبھی کبھی اس کی خیرات پچاس لاکھ یومیہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کا دستور ہے کہ جب نیا چاند نکلتا ہے تو دو لاکھ (تینکے) خیرات کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سلطان کی طرف سے نوٹو نسخہ: چالیس کروڑ تیس ہزار مثقال<sup>۲</sup> کے مسال کا وزن: ایک لاکھ درہم بتایا گیا ہے اور درہم  $\frac{1}{2}$  ماش کے بقدر ہوتا ہے، اس حساب سے مسال پونے چار اور پانچ ماش کے لگ بھگ ہوتا ہے۔

سے بیس ہزار فقیروں کے روزینے مقرر ہیں، ہر فقیر ایک درہم (تقریباً نو آنے) اور پانچ رطل (تقریباً ڈھائی سیر) گیہوں کی روٹی یا چاول پاتا ہے۔ اس نے مدرسوں میں تنخواہ دار ہزار فقیہ مقرر کئے ہیں جو یتیموں اور بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ اُس کی طرف سے اجازت نہیں کہ دہلی میں کوئی پبلک سے بھیک مانگے، اگر کوئی محتاج سوال کرتا ہے تو اس کو روکا جاتا ہے اس کے واسطے سرکار کی طرف سے روزینہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔

قاضی نظام الدین ابوالفضل یحییٰ بن حکیم طیار سی (۹)، نے محمد سے بیان کیا: ”ابوسعید (ایلخانی تاجدار ایران) کے لشکر (اردو) میں ایک شخص عضد بن قاضی تھا جو وزیر بننا چاہتا تھا لیکن اس کا اہل نہ تھا، اپنے مقصد کے حصول کے لئے وہ وزیروں میں دشمنی اور لشکر کے لوگوں میں پیہم بغاوت پھیلاتا تھا۔ اربابِ حل و عقد نے طے کیا کہ اس کو مرکز سے کہیں دور بھیج دیا جائے، چنانچہ اس کو سفیر بنا کر دہلی بھیجا، اس کے ساتھ ایک شاہی خط تھا جس میں سلام و صداقت کے اظہار کے بعد تعلق شاہ کی خیر و عافیت دریافت کی گئی تھی، دراصل یہ مہم بہانہ تھی عضد بن قاضی کو ملک باہر کرنے کا، اربابِ حکومت چاہتے تھے کہ وہ پھر نہ لوٹے۔ عضد بن قاضی جب دہلی آیا اور سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور خط پیش کیا تو سلطان تپاک سے ملا، انعام و خلعت سے اس کو نوازا، اس کی قدر و منزلت کی اور نقد عطیہ دیا۔ پھر وہ جب شاہ ایران (ابوسعید) کے پاس واپس جانے لگا تو سلطان نے اس سے کہا کہ خزانہ میں جاؤ اور جو تمہارا جی چاہے لے لو۔ عضد بن قاضی شہر آدمی تھا، خزانہ میں جا کر ایک قرآن کے علاوہ اس



کچھ نہ لیا، بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس کو تعجب ہوا اور اس نے سید عضد سے پوچھا: تم نے بس قرآن لینے پر کیوں اکتفاء کیا؟ سید عضد: سلطان کے کرم نے مال و دولت سے مجھے اتنا بے نیاز کر دیا ہے کہ خزانہ میں کتاب اللہ سے بہتر مجھے کوئی چیز نہیں ملی۔ بادشاہ اس کے قول و فعل سے بہت محظوظ و متاثر ہوا، اور اس کو بہت سا مال و متاع عنایت کیا، اور ایک دوسرا عطیہ بطور تحفہ ابو سعید (شاہ ایران) کے لئے اس کے ساتھ کر دیا، دونوں کے عطیات کا مجموعہ آٹھ سو تومان تھا، تومان دس ہزار دینار کے برابر ہے اور دینار چھ درہم کا ہوتا ہے، آٹھ سو تومان کے معنی ہوئے اسی لاکھ دینار یا چار کروڑ اسی لاکھ درہم! سید عضد یہ دولت لے کر لوٹا تو اس کو اندیشہ ہوا کہیں اردو (۱۶/۵) میں اُس سے چھین نہ لی جائے اس لئے اس نے اس کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے اس طرح پیک کیا کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ امیر احمد بن خواجا رشید وزیر مملکت کا بھائی بعض بد عنوانیوں کی پاداش میں اردو سے نکالا گیا لیکن اس کے بھائی غیاث الدین محمد وزیر (ابو سعید) کی پاس خاطر کے لئے اس کو امیر ایلکاہ بنا دیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ سلطنت کے جس حصہ میں چاہے وہاں کے گورنروں کی عدم موجودگی میں حاکم رہ سکتا ہے، اتفاق کی بات کہ احمد بن خواجا کی سر راجہ سید عضد سے ٹڈ بھڑ ہو گئی، اول الذکر نے بہت سا روپیہ سید عضد سے چھین لیا اور اس سے ابو سعید اور خانوں کو تحفہ تحائف دینے کے لئے سونے چاندی کے کئی ادنیٰ بھر برتن بنوائے، وٹحسبہ سلسلہ الہی العود الی ارضہ و دہ، لیکن موت نے اس کو آ پکڑا، اس کے بعد

ابوسعید اور سید عسکری چلے گئے، حکومت کی بساط اٹ گئی اور سونا ضائع ہو گیا اور اس کے کمانے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ ابن حکیم نے کہا: دہلی کا یہ سلطان غیر معمولی فیاض ہے اور پرنسپل کے ساتھ بڑے لطف و کرم سے پیش آتا ہے۔ ایک فاضل فارس سے اس کے پاس آیا اور اس کی خدمت میں فلسفہ کی کتابیں پیش کیں جن میں ابن سینا کی شفاء بھی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب وہ حاضر ہوا اور کتابیں پیش کیں اس وقت قیمتی جواہرات کا ایک بڑا بندل سلطان کی خدمت میں لایا گیا، اُس نے مٹھی بھر موتی اُس بندل میں سے لئے اور نووارد کو دئے، ان کی قیمت بیس ہزار مثقال سونا اُٹھی، ہذا غیر لقیہ ما وصلہ بہ (۹)۔

سید شریف سمرقندی نے مجھ سے بیان کیا :- اہل بخارا خربوزے لے کر جو جاڑوں تک ان کے ہاں چلتے ہیں بادشاہ کے پاس آتے ہیں اور وہ ان کو بڑے بڑے عطیے دیتا ہے، میں ایک شخص سے واقف ہوں جو سلطان کے لئے دو اونٹ بھر خربوزے لے کر چلا لیکن ان کا بیشتر حصہ راستہ میں خراب ہو گیا اور صرف بائیس خربوزے صبح و سالم پہنچے، سلطان نے اس شخص کو تین ہزار مثقال سونا دیا۔ شیخ ابوبکر بن ابی حسن ملتانی نے جو حافظ ابن تاج مشہور ہیں اور جن سے میری ملتان میں ملاقات و گفتگو ہوئی (۹) کہا: پھر میں دہلی گیا تو میں نے وہاں بھی یہ بات مشہور پائی کہ سلطان محمد بن تغلق نے یہ عہد کیا ہے کہ کسی کو تین ہزار مثقال سے کم انعام نہیں دیں گے۔

خجندی نے مجھ سے کہا :- میں سلطان محمد بن تغلق کے پاس آیا

اور اُن سے ملاقات کی تو انہوں نے مجھے ہزار مشقال سونا عنایت کیا، اس کے بعد مجھ سے پوچھا: کیا تم ہندوستان میں رہنا پسند کرو گے یا وطن لوٹنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا: میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ سلطان نے مجھے فوج میں بھرتی کر لیا۔

شیخ ابوبکر بن خُلاں بڑی صوفی نے مجھ سے بیان کیا: سلطان نے ایک جماعت کے ساتھ جس میں میں بھی تھا، تین لاکھ مشقال سونا ماوراء النہر بھیجا، ایک لاکھ زباں کے علماء اور ایک لاکھ فقراء میں بانٹنے کے لئے اور ایک لاکھ سے سلطان کا سامان خریدنے کے لئے۔ سلطان نے ہم سے کہا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیخ بُرہان الدین ساغر جی شیخ سمرقند، جو علم و زہد میں یکتائے وقت ہیں، کبھی روپیہ پس انداز نہیں کرتے، تم ان کو چالیس ہزار تنکے دینا تاکہ وہ ان کی مدد سے ملتان آجائیں، جب وہ ہماری عملداری میں آجائیں گے تو ہم دل کھول کر ان کو دیں گے۔ اگر تم ان کو گھر پر نہ پاؤ تو یہ رقم ان کے متعلقین کو دے دینا تاکہ واپسی پر ان کو دے دیں اور کہہ دیں کہ ہماری خواہش ہے کہ اس روپے سے ملتان آجائیں۔ بڑی کہتے ہیں کہ جب ہم سمرقند پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ شیخ بُرہان چھین جا چکے ہیں۔ ہم نے روپیہ ان کی کینز کو دیا اور کہا کہ سلطان نے ان کو ملتان آنے کی تاکید کر دی ہے۔

فقیر ابوالحسنہ عمر بن سحاق شیبی نے مجھ سے بیان کیا سلطان محمد بن تغلق سفر میں ہوں یا حضر میں۔ اور ان کے ساتھ ضرور ہوتے ہیں۔ ایک جنگی مہم پر ہم اُن کے ساتھ جا رہے تھے (۱۹/۵) کہ فوج کے ہراول دستوں کی طرف سے فتح کی خوش خبری کے خط موصول ہوئے، بادشاہ



فتح کی خبر سے مسرور ہوا اور کہا کہ یہ فتح علماء کی برکت سے حاصل ہوئی ہے۔ اس نے حکم دیا کہ علماء خزانہ میں جائیں اور ہر فرد جتنا روپیہ لے سکے لے لے اور اگر کوئی کم زوری کی وجہ سے روپے کی بوریاں نہ اٹھا سکتا ہو تو وہ اپنا نمائندہ بھیج دے۔ علماء خزانہ میں گئے لیکن میں اور مجھ جیسے دوسرے بہت سے عالم جن کا تعلق صفت اول سے نہ تھا، رُکے رہے۔ ہر شخص نے دو تھیلیاں اٹھا لیں، ہر تھیلی میں دس ہزار درہم تھے۔ لیکن ایک عالم صاحب ایسے تھے جنہوں نے تین تھیلیاں لیں، دو بگلوں میں دبا لیں اور ایک سر پر رکھی۔ سلطان اس حریص عالم کو دیکھ کر ہنس پڑا، اس نے پوچھا کہ باقی عالم خزانہ میں کیوں نہیں گئے تو اس کو بتایا گیا کہ ان کا مرتبہ نیچا ہے، جانے والے پروفیسر ہیں اور یہ لیکچرر (معیذ) سلطان نے حکم دیا کہ ہم سب کو ہزار ہزار درہم دئے جائیں چنانچہ یہ رقم ہمارے درمیان تقسیم کر دی گئی۔

ابوصفاً شبلی نے کہا: اس سلطان کی حکومت میں سارے شریعت قائم اور اہل علم کا بازار گرم ہے، علماء کو توقیر و احترام کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے، اور وہ بڑے جوش سے ان اصولوں کو سینے سے رکائے ہیں جن کا ان کی اصلاح ظاہر و باطن سے تعلق ہے۔ وہ ہمیشہ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور اپنے مرام و مذہب میں اعتدال سے کام لیتے ہیں اور خوب سوچ بچار کر قدم بڑھاتے ہیں۔ یہ سلطان اجتہاد فی الجہاد میں ذرا کوتاہی نہیں کرتا۔ نہ شبلی کی رحمت سے نسی عنان و سنان (نیزہ) موڑتا ہے نہ سمندر کی طرف سے۔ یہ برابر اہل معمول ہے۔ اس نے ہند کے طول و عرض میں، عداوت کبیرہ الخفیہ، رفتہ اسد

کے بڑے بڑے کارنامے انجام دے رہے ہیں جن کے اثر سے وہاں کے اندھیرے میں اُجالا پھیلا، اور ہدایت و رشد کی بجلیاں چمکیں، اُس نے آتش خانے ڈھائے، بُت توڑے اور ہند کو غنڈوں سے پاک کیا، اس سے اس کی ذمی رعایا مستثنیٰ ہے، اس کی کوشش سے شرق اقصیٰ اور مطلع شمس تک اسلام پھیل گیا (لآلاء الصباح المشرق (۹) اس نے اُمت محمدیہ کا جھنڈا وہاں پہنچا دیا جہاں جیسا کہ ابونصر عسکری (مورخ) کہتا ہے، کبھی کوئی جھنڈا نہ گیا تھا، نہ جہاں کبھی قرآنی آیت یا سورت پڑھی گئی تھی، اس نے مسجدیں آباد کیں، ترمیم کے ساتھ اذان دینا اور زمرہ کے ساتھ قرآن پڑھنا بند کرا دیا، اس ممت کے پیروں کو کفار کے سر پر لا بٹھایا اور خدا کی مدد سے ان کی دولت اور وطن کا ان کو وارث بنا دیا۔ وَأَرْضًا لَمْ يَطْوَهَا وَهُوَ مَعَ هَذَا يَمْدُلُهُ فَاْفَقَهُ مَعَ كُلِّ خَافِقَةٍ (۱۰) خشکی میں اُس کے جھنڈوں کے عُقاب ہیں اور سمندر میں کشتیوں کے غُراب (کوئے) اور غلاموں کی اتنی کثرت ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب ہزاروں کوڑیوں کے مول نہ بیچے جاتے ہوں۔ میرے سب راویوں نے بتایا کہ خدمت گار کنیز کی قیمت دہلی میں آٹھ تنکے (تین روپے) سے زیادہ نہیں ہوتی، اور جو کنیزیں خدمت اور ہم بستری دونوں کے لئے موزوں ہوتی ہیں ان کی قیمت پندرہ تنکے (پونے چھ روپے) ہوتی ہے، دوسرے شہروں میں ان کی قیمت اور بھی کم ہے۔

(باقی)

اے اگر تاجنہ کا تنکے ماغیں اور تیس روپے اگر چاندی کا قرار دیں۔

# جدید عراقی شاعری کے رہنما

## زہاوی اور رُصافی

۱۲

(جناب مولوی رشید احمد صاحب ارشد ایم اے استاذ ادبیات عربی کراچی یونیورسٹی)

عراق عرب میں ترکی دور حکومت میں کئی علمی خاندان تھے جنہوں نے عربی علم و ادب کی کافی خدمت کی تھی جن میں الوسی خاندان سب سے زیادہ مشہور ہے مگر جس شخص نے سب سے پہلے عربی شاعری میں حالاتِ زمانہ سے متاثر ہو کر انقلابی خیالات پیش کئے وہ جمیل صدیقی الزہاوی تھا وہ ۱۸۶۳ء میں بغداد میں پیدا ہوا اسی لحاظ سے اس کا زمانہ وہی ہے جو دلی لکھنؤ لیکن اور حافظ و شوقی کا زمانہ ہے اسی کے والد علامہ محمد قاضی الزہاوی بغداد کے مفتی تھے مگر شاعر موصوف مذہبی خیالات میں بہت آزاد تھا اور اس نے مذہبی علوم کے بجائے فلسفہ اور شعر و شاعری سے کافی دلچسپی قائم رکھی زہاوی ابتدائی زمانے سے ہی ایک آزاد خیال فلسفی شاعر تھا۔ ترکی دور حکومت میں وہ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہا، وہ ترکی پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا مگر اپنی آزاد خیالی اور حق گوئی کی بدولت سخت قید و بند کے مصائب برداشت کرتا رہا اس نے حقوق نسواں کی حمایت میں اخبار المؤید مصر میں ایک مضمون شائع کر کر عربی ممالک میں بچپن برپا کر دی تھی اسی مضمون نے بغداد کے عوام کو اس قدر مشتعل کر دیا تھا کہ وہ اسے اسلامی شریعت کے خلاف سمجھ کر اس کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کی ملازمت جاتی رہی تھی بلکہ گھر سے نکلنے بھی مشکل ہو گیا تھا۔ بہر حال کچھ عرصہ کے بعد یہ شورش رفع ہو گئی تھی۔

زہاوی کا ابتدائی کلام قابل ذکر نہیں ہے اس کی شاعری میں بھی اس وقت جوش و



خروش پیدا ہوا جب وہ عثمانی حکومت کی قید و بند کے مصائب برداشت کر چکا تھا اور بغداد و جلاوطن ہو کر واپس آیا اسی وقت اس نے عربی ممالک کے مشہور رسائل میں غلط ابراہیم کی طرح قومی نظمیں شائع کرانی شروع کیں جن میں قوم کو تعلیمی و سماجی ترقی کی طرف آمادہ کیا گیا تھا۔

زبادی اپنے ہم عصر مصری شعراء سے زیادہ آزاد خیال ہے اس کا انداز فکر ولی الدین یکن ہے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اسی طرح اس کے کلام میں عہد قدیم کے خلاف بغاوت کے وہی جذبات اور وہی تلخی اور تیزی پائی جاتی ہے، دونوں عثمانی حکومت اور سلطان عبدالحمید خاں کے ضد و استبداد کے شکار ہوئے اور اسی کے خلاف لکھتے رہے، ولی الدین یکن نے اپنے اشعار اور قلم کے ذریعے زبادی کی اس وقت حمایت کی جب کہ عوام میں اس کی مخالفت بہت بڑھی ہوئی تھی۔

زبادی نے علم و تعظیم، حقوق نسواں، حریت و آزاد خیالی کی حمایت میں بہت زیادہ زور قلم صرف کیا ہے نظم کے علاوہ نثر کے ذریعے بھی اس نے مشرقی ممالک کے جمود و تقلید کی زنجیریں توڑنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اس نے اپنے جوانی کے زمانے میں بھی جب کہ وہ طب علم تھا نیوش کے نظریہ ”کشش ثقل“ کی مخالفت کر کے سائنس کی دنیا میں بھل چلا دی تھی اس پر عربی جراند و رسائل میں بہت عرصہ تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا گو اس کے یہ خیالات مقبول نہ ہو سکے تاہم اس سے اس کی اجتہاد و فکر و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاعر موصوف کے نظم کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں جس میں ایک مجموعہ رباعیات کا بھی ہے اس میں شاعر نے رباعی کی طرز میں عمر خیام اور قدیم فلسفی شاعر آریو اللہ کے جواب میں مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے جن میں چھوٹی بھری اور بعض خاص قسم کی بھری استعمال کی گئی ہیں ان میں اخلاق، سیاست، فلسفہ، معاشرت،

سائنس، وصف نگاری، عشق و محبت، مصیبت و بدبختی، یقین و شک، ہزلیا سب پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد اتحادیوں نے عربوں پر جو مظالم کئے تھے، ان پر بھی بڑی دردناک نظمیں تحریر کی ہیں اس کی نظموں میں رنج و غم کے جذبات کافی ہیں مگر ان نظموں میں جن میں نوجوانوں کو ترقی کے لئے آمادہ کیا گیا ہے۔ محبت و عمل اور جوش و خروش کا پیغام دیا گیا ہے اکثر اشعار میں اس نے محکام کے ظلم و استبداد اور علماء کے جمود کی مخالفت کی ہے، اصلاح و تجدید اس کی شاعری کا سب سے بڑا مقصد معلوم ہوتا ہے۔

عراق کے مشہور ادیب انور شاذل نے عراق کے اہل قلم کے ایک جلسہ میں ہونہ بادی کی یاد میں منعقد کیا گیا تھا۔ شاعر موصوف کے شاعرانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے اسے فرانس کے مشہور شاعر دکٹر ہیوگو سے مشابہ قرار دیا تھا انھوں نے دونوں شاعروں کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ دونوں شاعر اپنے ملک کے انقلابی دور میں نمودار ہوئے اور دونوں نے ظلم و استبداد کے خلاف حریت اور صداقت کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی، سی طرح اپنی حق گوئی کی بدولت دونوں نہ صرف مذہبی رہنماؤں کے حملوں کا شکار ہوئے بلکہ اپنے ہم عصر ادیبوں کے حسد اور دشمنی کا نشانہ بھی بنے۔ یہاں تک کہ ذاتی عادات و اطوار میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ تھے دونوں میں ایک قسم کی خود پسندی کی حادث بھی تھی۔

زہاوی کی گونا گوں شاعری کا احاطہ کرنے کے لئے اس کا مکمل نمونہ کلام پیش کرنا بہت مشکل ہے تاہم چند اشعار کا زور دہندہ ترین ہے۔ جوانوں کو ہمت و رحق پسندی کا پیغام دیتے ہوئے شاعر موصوف یوں رقم طراز ہے "پنی شعلہ بیانی سے اپنے دل و دماغ کے افکار کو جرأت کے ساتھ پیش کر دے" سیلِ تذرو،

”زندگی اور بچوں کی طرح اپنی منزل مقصود کی طرف ہمت اور جرأت کے ساتھ گامزن ہو جاؤ۔ تم سب کے سب اپنے نفس کے حاکم بن جاؤ کیوں کہ یہ دور تمام ادوار کا سردار ہے، حق و صداقت کو کھلم کھلا ظاہر کرو اور لوگوں کے سامنے تمام اسرار کو آشکار کر دو زندگی کیا ہے؟ ایک دائمی کشمکش یا کمزوری کی قوی سے بند آزمائی ہے، اولوالعزم انسان کے لئے فلاح و کامرانی ہے اور کمزور کے لئے تباہی و بربادی ہے۔ اے بوڑھے انسانو! تم مرد میدان نہیں ہو اس لئے پیچھے ہٹ جاؤ۔ اے نوجوانو! تم آگے بڑھو۔ آگے بڑھو“

شاعر موصوف سرزمینِ عراق اور خطۂ بغداد کے دل فریب مناظر سے اپنی دلیہانہ شیفتگی کا ثبوت اس طریقہ سے پیش کرتا ہے

”اے عراق کے آسمان! تم کس قدر صاف اور پاکیزہ نظر آتے ہو اور اسی وجہ سے بہترین آسمان ہو۔ میری طرف دیکھو کیوں کہ میرے دل و جان تم سے انتہائی محبت کرتے ہیں، مجھے اس وقت دیکھو جب صبح کے وقت خاموشی سے شجر پر چڑا دل نغمہ زن ہوں مجھے رات کے وقت دیکھو جب ستاروں کی نکاہوں سے رات کی تاریکی میں آفتاب غائب ہو جائے مجھے اس وقت دیکھو جب رات کے سناٹے میں مخلوق خدا خاموش ہو اور رزق زمین پر کوئی شور و غل نہ ہو۔ میرے دیکھنے کا وہ وقت بھی کیا خوب ہے جب فطرت رات کی تاریکی میں چشموں کے نغمے سنتے کے لئے ہمیشہ گوش ہو۔

اس وقت بھی مجھے دیکھو جب موسمِ خزاں میں درختوں سے پتے جھڑ جائیں اور جب باغ پھولوں سے اندر اس کے پتوں پر تازگی سے خالی ہو جائیں۔ مجھے اپنی چشم نیلگوں سے چپکے چپکے بادوں کے جھانکوں سے بھی دیکھو۔ اے آسمان! اگر تم مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو میری آنکھیں روتے وقت بھی تمہاری شکر گزار نظر آئیں گی۔“

حق گوئی کی سمیت میں شاعر موصوف اس طرح نغمہ رنج ہے



”حق کی حمایت سے تمہیں جاہلوں کا شور و غوغا نہ باز رکھے کیوں کہ جو سچائی کا دل  
دادہ ہے وہ لوگوں کے سب دشمن کی پرواہ نہیں کرتا۔ سچائی حقیقت بن کر ہمیشہ باقی رہتی  
ہے خواہ مغرور انسان اس سے چشم پوشی کرے۔“

حریت و آزادی کے بارے میں شاعر اس طرح منظم سرا ہے

”میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ حریت پسند شاعر کا کیا فرض ہے؟ جب وہ اپنے  
شعروں میں حقیقت نگاری کرنا چاہے

۲. لوگ چاہتے ہیں کہ ایسا شاعر غلاموں کی رستہ بیاں نہ کہ وہ قبیلے کا نائب ہو  
جائے مگر آزادی کے دل میں ایسے جذبات بھرے ہوئے ہیں جو اسے لعل اظہار  
نیماں پر مادہ کرتے رہتے ہیں۔“

ایک دوسری نظم میں حریت و آزادی کی عظمت کا بیت اس طرح لایا جاتا ہے  
”زندگی میں اگر آزادی مل جائے تو وہ ایک لازمی نعمت ہے۔“  
محبوب آزادی کا گیت گاؤں جو ہمیں پھر چلی گئی ہے۔ وہ غور و فکر سے گئی ہے  
طرح آفتاب غروب ہونے کے بعد غمناک مورتا ہے۔ کسی طرح حریت و آزادی کی بدولت  
ایک طویل عرصہ تک ہمارا شمار فانی قوموں میں نہ ہو۔ مگر غدار زمانہ نے ہماری امیدوں  
کا خاتمہ کر دیا جس کا ہمیں دہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہم ابک و دیر اس کا بھی اسے کا جب زمانہ  
ہمیں اس کی خوش خبری سنائے گا۔“

علاقہ نویسوں کی حمایت میں شاعر موصوف نے بہت عمدہ نظمیں بھی ہیں اور سی  
حمایت کے سلسلہ میں بہت تحفیں لکھی ہیں جو اس کے خوف سے نظمیں کا ترجمہ  
نہیں پیش کیا جاسکتا، تم کی ساری میں وہ خود لکھی ہیں۔ کیا یہ سب سچ ہے

رفع السعیر مرآۃ  
وہیں انداز

”قوم کو مرد و عورت دونوں جماعتیں مل کر سر بلند کرتی ہیں جس طرح ایک پرندہ اپنے دونوں بازوؤں کی بدولت پرواز کرتا ہے۔“

شاعر موصوف آخر زمانہ میں . معذور و لاچار ہو گئے تھے اور قوم کی ناقہ دانی سے متاثر تھے اسی سلسلے میں انھوں نے یہ دو شعر کہے ہیں

۱ انا لا یسأل عنی احد حین اغیب

۲ انا کالرحمة مفقود و کا حق غریب

”میرے بارے میں کوئی نہیں سوال کرے گا جب میں دنیا سے غائب ہو جاؤں گا۔ اس وقت میری مثال ایسی ہوگی جیسے کہ خدا کی رحمت جو مفقود ہے یا جیسے حق و صداقت (اس ملک میں) اجنبی ہے۔“

زباوی کی شاعری کا ایک علمی اور تعلیمی پہلو بھی ہے چونکہ اس کو فلسفہ اور خاص کر فلکیات اور طبیعیات سے گہری دل چسپی تھی اس لئے اس نے اپنی نظمیں میں اجرام فلکی اور طبیعیات کے قوانین کو عمدہ پیرائے میں نظم کیا ہے۔ اس نے سائنس اور اس کی معلومات پر اس قدر نقشہیں تحریر کی ہیں کہ موجودہ نقاد ان سے انکار اس کا شمار ان قدیم شعراء میں کرتے ہیں جنہوں نے طلباء کی سہولت کی خاطر علوم و فنون کی کتابوں کو منظوم شکل میں تحریر کیا تھا چنانچہ حال میں ایک مصری نقاد ڈاکٹر شوقی ضیف نے العلم فی شاعر الزہدی کے نام سے ایک مقالہ تحریر کیا ہے جس میں اس کی نظموں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے جن میں فلکیات اور طبیعیات کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ ورنہ نظموں کا نمونہ بھی درج کیا گیا ہے جن میں دارون کے نظریہ نشو و ارتقاء پر بحث کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زباوی بالکل مادہ پرست نہیں تھا بلکہ وہ اصلاح پسند اور مذہب کا قائل تھا اسی طرح وہ مادیت اور روحانیت کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ زباوی کی ان تمام علمی و تعلیمی نظموں کا تذکرہ کرنے کے بعد نقاد موصوف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس کی ان تعلیمی نظموں میں شعریت نہیں ہے وہ رقمطراز ہے۔

”اس نے ان نظموں میں اپنے احساسات اور جذبات کو بہت کم شامل کیا ہے اس کے ان اشعار کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایسے وحشت ناک صحرا میں آئے ہیں جس میں کوئی زندگی نہیں ہے اور نہ دلچسپی کا کوئی سامان ہے اس میں دلچسپی کیسے پیدا ہو سکتی ہے جب کہ وہ یہ معلومات پیش کرتے وقت نہ رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور نہ خوش ہوتا ہے اس وقت وہ بڑا عالم ہوتا ہے اور اپنے علم میں جذبات کو شامل نہیں کرتا۔ اسی طرح اس نے شعر و شاعری پر ایسا بھاری بوجھ ڈال دیا ہے جس کو برداشت کرنے کی اس میں طاقت نہیں ہے اسی طرح ان نظموں میں نہ صرف شعریت مفقود ہے بلکہ شعری زبان اور موسیقی پر بھی بُرا اثر پڑا ہے کیوں کہ جب وہ علم کی گھاٹیوں اور اس کے پیچ در پیچ جنگلوں میں گھستا ہے تو زبان و موسیقی دونوں چیزوں کا پتہ نہیں چلتا۔“

ڈاکٹر شوئی صیف کی رائے ان مخصوص نظموں کے بارے میں ایک حد تک صحیح ہے مگر زبانی کی عظمت اور شہرت ان نظموں کی وجہ سے نہیں ہے اس کی عظمت ان لافانی نظموں کی بنیاد پر قائم ہے جن میں اس نے حریت و آزادی اور حب الوطنی کے گیت گائے ہیں اور جن کا بہت تھوڑا نمونہ ہم ابھی پیش کر چکے ہیں ان نظموں میں سچے جذبات و احساسات کی فراوانی ہے اس قسم کی نظمیں جدید عربی شاعری میں ایک بیش بہا اضافہ ہے اس کی ان مخصوص تعلیمی نظموں میں اگرچہ بہت زیادہ شعریت نہیں ہے بلکہ علم و حکمت کا عنصر غالب ہے تاہم یہ نظمیں بھی اس کی ادبی اور فنی صلاحیت اور قادر الکلامی کا زبردست ثبوت ہیں کیوں کہ ان نظموں میں شاعر موسوف نے عربی نظم میں پہلی دفعہ جدید سائنس کے دقیق مسائل اور نظریوں کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ملک کے نوجوانوں کو فلیٹ و طبیعیات کے مسائل میں دلچسپی لینے پر آمادہ کیا ہے۔



اگر اس چیز کی افادی حیثیت بھی تسلیم نہ کی جائے تب بھی زہاوی کی نظموں کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جو اسے زندہ جاوید بنانے اور افانی شہرت دینے کے لئے کافی ہے۔ معروف رصافی عراق کی جدید شاعری کا دوسرا علم بردار شاعر معروف الرصافی تھا۔ زہاوی کی طرح وہ بھی ابھی تک تمام عربی دنیا کا ہر دل عزیز شاعر ہے۔ آج کل کے عراقی نوجوان شعراء کی طرح ان دونوں شاعروں نے ادبی و فنّی قوانین میں تجربے نہیں کئے بلکہ انھوں نے عربی شاعری کی کلاسیکل شکل کو برقرار رکھا مگر معانی و خیالات کے لحاظ سے بہت تبدیلیاں پیدا کیں۔ قدیم شعراء صرف اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے تھے یا حکام و امراء کی قصیدہ خوانی کا مطلع نظر تھا عوام اور قوم کے دکھ درد، ان کے رنج و غم یا شادی و مسرت کے اظہار۔ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا ان کے شعروں سے۔ جدید شعراء کو چھوڑ کر جن میں ابوالعلاء المہدی کی شخصیت زیادہ نمایاں ہے، اور کوئی عوام کا ترجمان نہیں بن سکا۔ عراق کی جدید شاعری میں عوام کے دکھ درد کا اظہار مسرت پہلے معروف الرصافی نے کیا۔ اس کی شاعری میں عوام کے رستے ہوئے ناسوروں کو دوا شکاف کیا گیا ہے اور شاعر موصوف نے بلا تفریق مذہب و ملت، ہر مصیبت زدہ سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا ہے اس کی شاعری افانی ہے اور رنگ و نسل، مذہب و ملت کی حدود سے آزاد ہے۔

رصافی کی شاعری میں رنج و غم کے جذبات زیادہ نمایاں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے زمانے میں عراق کی سیاسی معاشی اور معاشرتی حالت نہایت انتہائی زہنی و فانی دور خلافت کا انتہائی پس ماندہ نسوہ بن کر رہ گیا تھا۔ ترکی حکام لوگوں پر ظلم و ستم کرتے تھے اور قاصد سلطان عبدالحمید خاں کا دور "ستبدان" اپنی رعایا کے لئے بہت تباہ کن رہا۔ مصر ایک حد تک ترکوں کے قبضے سے آزاد ہوئی تھی مگر وہ اس زمانے میں لے دہشت میں تھی۔ شعراء عربی امعا صو زکا شوائی ضیف صفحات ۲۵ تا ۳۲ مطبوعہ

عربی ممالک کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔ شام و لبنان میں بھی امریکن اور مغربی ممالک کے مشنری پادریوں اور علماء کی بدولت علم و ادب کی روشنی پھیلنی شروع ہو گئی تھی مگر عراق میں جہالت و استبداد کا دور دورہ تھا وہاں صحیح معنوں میں کوئی تعلیمی ادارہ حکومت کی طرف سے قائم نہیں تھا صرف فوج اور ان کے بچوں کے لئے چند معمولی ادارے قائم تھے اور رصافی کو بھی مجبور ہو کر ان میں سے ایک میں داخل ہونا پڑا مگر وہ اپنے تعلیمی مراحل کو کامیابی کے ساتھ نہ کر سکا۔ اسی لئے وہ بغداد کے مشہور عالم علامہ محمود لشکری اور اوس کی خدمت میں حاضر ہوا اور بارہ سال تک اُن سے فیض حاصل ہوتا رہا اور اوسے خاندان عراق کا مشہور علمی و دینی خاندان تھا چنانچہ علامہ موصوف کے فیض صحبت نے رصافی کے دل میں انسانی ہمدردی اور شفقت کے جذبات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے۔

اس عرصہ میں رصافی معلم کی حیثیت سے مختلف تعلیمی مدارس میں کام کرتا رہا ان تعلیمی مشغول کے ساتھ اس کی شاعری بھی جاری رہی۔ چونکہ عراق اخبار و رسائل سے خالی تھا اسی لئے اس کی نظمیں مصر کے مجلہ نقیب اور مشہور اخبار الموید میں چھپتی رہی جن میں ملک کی سیاسی اور سماجی حالات پر کڑی تنقید ہوتی تھی۔

ترکی مملکت میں دستوری اصلاحات نافذ ہونے کے بعد شام موصوف نے استنبول کا سفر کیا وہاں وہ ایک سرکاری تعلیمی ادارہ کے معلم اور مشہور قومی جریدہ سبیل ارشاد کے مدیر مقرر ہوئے وہ ترکی کے مشہور مدراء و اعلیٰ عظمین میں عربی زبان و ادب کی تاریخ پر لکھ چکے بھی دیتے رہے نیز پہلی جنگ عظیم تک وہ ترکی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے اسی عرصہ میں انہوں نے ترکی زبان میں کافی ہدایت حاصل کر لی تھی جنگ عظیم کے خاتمہ پر وہ شام آ گئے وہاں سے وہ بیت المقدس کے دارالمعلمین کے پروفیسر مقرر ہو کر گئے اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں جب عراق کے حالات بہتے ہوئے تو وہ بغداد آ گئے اور

وزارت تعلیم کے ماتحت ترجمہ و تالیف کی کمیٹی کے نائب صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

عراقی قوم نے ابتداء میں ان کی قدر نہیں کی اور وہ بہت تکلیف اٹھاتے رہے مگر جب ملک آزاد ہوا اور لوگوں میں علمی شعور پیدا ہوا تو ان کی بہت عزت اور احترام ہوا اور اب ان کے مرنے کے بعد انھیں قومی شاعر تسلیم کرتے ہوئے ان کے شاعرانہ کمالات پر کتابیں اور مقالات تحریر کئے جا رہے ہیں ان کے اشعار کے وہ مجموعے جو وہ اپنی زندگی میں شائع نہیں کر سکے تھے، شائع کئے جا رہے ہیں۔

رصاصی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے قصہ کے انداز کو عربی شاعری میں مقبول بنایا جس کی قدیم شاعری میں بہت بڑی کمی تھی ان منظوم قصوں میں زیادہ تر بکس بیوہ عورتوں اور یتیموں کے دکھ درد کا نقشہ اس انداز میں کھینچا کرتے تھے کہ شعریت کی اصل روح برقرار رہتی تھی انھوں نے اپنے اشعار میں حریت پسندی، بکس طبقہ نسواں کی حمایت، غریبوں اور یتیموں کی مفلسی اور بیماری کا ذکر کر کے ملک میں انقلاب برپا کر دیا اور عوام کی ہمدردیاں مظلوم طبقہ کی طرف مبذول ہو گئیں اس سے پہلے عراق کے اعلیٰ حکام اور سرمایہ دار غریب طبقہ کا کچھ خیال نہیں کرتے تھے مگر انھوں نے اپنے کلام میں بار بار ان کی حمایت کئے عراقی شاعری کا رخ ہی بدلتا دیا ان کی ان نظموں کی مقبولیت کو دیکھ کر آنے والے شعرا بھی یتیموں بیوؤں اور مظلوم طبقہ نسواں کی حمایت میں کثرت سے نظمیں لکھنے لگے یہاں تک کہ کوئی مشہور عراقی شاعر ایسا نہ تھا جس نے ان موضوعات پر نظمیں نہ لکھی ہوں خواہ وہ قدیم طرز پر شعر لکھتا ہو یا آزاد شاعر ہو۔ بہر حال رصاصی کی شاعری کے بھی چار اہم عناصر ہیں

(۱) عمدہ قسم کی وصف نگاری اور اضعیف انداز بیان۔



(۲) سماجی اصلاح

(۳) خزن و ملال

(۴) قصہ کے پیرائے میں نظمیں

رصافی کی نظمیں بحر طویل میں ہیں اور انداز بیان رزمیہ اور بیانیہ ہے وہ غالباً دنیا کے عرب کا سب سے زیادہ نڈر اور بے باک شاعر تھا جس نے سیاسی اور معاشرتی برائیوں کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کی ہے اور اس کے اظہار خیال میں شازوں سے کام نہیں لیا ہے مصری قومی شاعر حافظ ابرار، سیم بارہا سیاسی و باؤ میں آکر سیاسی معاملوں میں شازوں اور کنایوں سے کام لیتا تھا مگر رصافی انجام کی پرواہ کئے بغیر کلمہ حق کہنے میں بالکل پس و پیش نہیں کرتا تھا۔

پہلی جنگ عظیم میں جب شریف مکہ نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تو اس موقع پر عرب قوم پرستوں نے اسی بنا پر اس کا ساتھ دیا تھا کہ وہ ترکوں کے پنجے سے آزاد ہوں گے۔ اس وقت قوم پرستی کے جذبے میں سرشار تھے کہ ہمیں سے یہ آواز بلند نہیں ہوئی کہ دو مسلمان قوموں کی باہمی خد نہ جعلی کس قدر شرمناک واقعہ ہے ہمارے ملک کا قومی شاعر علامہ قبالی نے وطنیت اور قومیت کے اس خطرناک جہان کو محسوس کیا تھا اور اسی موقع پر اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی مگر عرب دنیا میں بہت کم ادیبوں نے اسے محسوس کیا تھا مگر رصافی نے نہایت بلند آواز میں عربوں کو مخاطب کیے ہوئے کہا تھا:

مَاذَا تَقُولُ ذَا أَنْتَ مُحَمَّدٌ  
وَيْدَا تَقْضَانِ مِنْ دِمِ الْإِسْلَامِ

(تم کیا جواب دو گے جب دوزخ میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہی حالت میں آئے

کہ تمہارے ہاتھوں سے سلام کا خون بہ رہا ہو گا۔)

رصافی نے ”مطلقہ عورت“ و ”تسیم“ بہت مشہور نظمیں لکھی ہیں خواتین کی حمایت میں اپنے ملکی

معاصر زبانی کی طرح اس کا قلم بہت رواں تھا ایک نظم میں اس نے پہلی جنگ عظیم کے سرور

لہ الادب العسوی فی العراق لرفیعی لبطی مطبوعہ مطبعة السلفية مصروفات ۱۳۲۲



شامل ہیں، ارکاٹ کے آخری رئیس تھے) اپنے دونوں تذکروں ”صبح وطن“ اور ”گلزار اعظم“ میں درج کئے ہیں، ”صبح وطن“ میں صرف اسی قدر صراحت ہے ”ابجدی تخلص، میر اسماعیل خاں نام نواب عمدة الامراء کا استاد تھا، بہت سارے اشخاص اس کی قابلیت سے فیض یاب ہوئے، نواب والا جاہ نے انور نامہ کی تکمیل پر اس کو اس کے وزن کے مطابق چھ ہزار سات سو روپیہ مرحمت دیا۔ تھے اور ماہ ربیع الاول ۱۱۳۰ء میں ملک الشعراء کے خطاب سے ممتاز فرمایا۔ اس کا کلام سادہ متقدمین کے طرز پر ہے۔“

دوسرے تذکرہ گلزار اعظم میں زیادہ حالات درج کئے ہیں چنانچہ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

”ابجدی تخلص، مولوی میر اسماعیل خاں، سید شاہ میر بی پوری کا فرزند، محمد قاسم تخلص بہ فرشتہ کی (جس نے تاریخ نورس نامہ یعنی تاریخ ذشت لکھی ہے) اولاد میں تھا۔ چنگل سہٹ میں جو مدرسے چھتیس میل کے فاصلہ پر ہے توند ہوا، عربی فارسی کی علی تعلیم اپنے وقت کے ممتاز اور بلند پایہ علماء سے حاصل کی، نواب والا جاہ نے اس کو اپنی ملازمت کے دائرہ میں منسلک کر کے اپنے فرزند نواب عمدة الامراء کی تعلیم کے لئے مقرر فرمایا تھا، نواب امیر الامراء بھی اس کی تعلیم سے مستفید ہوئے ابجدی فارسی شاعری میں بلند مرتبہ رکھتا ہے دیوان فارسی اور اردو میں مرتب کئے تھے بیسیوں قصیدے لکھے ہیں ایک قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

ہر عقدہ مشعل کہ بیک مرتبہ شد از ناخن تدبیر امیر الامراء شد  
 ابجدی کی تصانیف میں کئی مثنویاں شامل ہیں یعنی ہفت جوہر اس میں بہرام گور کا قصہ نظم کیا گیا ہے مخزن اسرار نظامی کے جواب میں مثنوی زبدۃ الافکار مرتب کی، اس کے علاوہ انور نامہ، مودت نامہ، قصہ راجب و مرغوب بھی اس کی تصانیف

۱۔ صبح وطن معبود اللہ صفحہ (۲۷۰) یہ تذکرہ فارسی میں ہے۔



ہیں۔ اس کے علاوہ تحفۃ المعرفین کی شرح بھی لکھی ہے جس وقت ابجدی نے انور نامہ لکھ لیا تو والا جاہ نے اس کو چاندی میں تول کر اس کے وزن کے مطابق چھ ہزار سات سو روپیہ رحمت فرمائے، ۱۱۹۳ھ میں ابجدی کو ملک اشعر کا خطاب دیا گیا اور ۱۱۹۳ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

توزک والا جاہی میں ایک پچسپ قصہ ابجدی کے متعلق درج ہے  
ان دونوں تذکروں میں جو اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ تذکرہ ”صبح و طن“ میں ابجدی

۱۱۹۳ھ یہ داستان دچسپ اور موجودہ زمانہ میں ایک افسانہ سے کم نہیں ہے بیان کرتے ہیں کہ ابجدی اپنی شادی کے دن جھنگل پیٹ سے پرگنہ کرکٹ پالہ گیا اور وہاں شادی کی تمام رسوم ادا ہوئیں، دو طن کوئے کر اپنی قیام گاہ کو آیا رات کو جب تیرہ بجے دس بجے میں داخل ہو کر سو گیا تو رات کے وقت دروازہ کی زنجیر کی آواز سن کر ابجدی کی آنکھ کھل گئی۔ مگر کوئی اندر آنے والا نظر نہیں آیا۔ وہ بہن پٹنگ پر بدستور سو رہی تھی ابجدی پٹنگ پر بیٹھ گیا اور اب کچھ عرصہ کے بعد پورا دروازہ کھل گیا اور کوئی شخص اندر آتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اس کو حیرت ہونے لگی اسی عرصہ میں اس کو کسی نے تھپڑ مارا اور مار سے وہ بے ہوش ہو گیا، جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو مکان کے صحن میں پڑا پایا اور مغل دروازہ کے لوگ اس کو گھیرے ہوئے نظر آئے۔ اور اب وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوا میں اُڑنے لگا اور اتنی بلندی پر پہنچ گیا آبادی، مکانات حتیٰ کہ پہاڑ بھی نظروں سے غائب ہو گئے اور اس سے کان میں رنڈوں جیسی آواز آنے لگی، اور اس سے سوال کیا جانے لگا کہ اس کو سمندر میں پھینکا جائے یا جھنگل بیابان میں، اور اس اعتبار میں اس کے سر پر ایک تھپڑی اور خون جاری ہو گیا اور اب ابجدی کو علم ہوا کہ اس کو جنات پکڑے ہوئے ہیں اور وہ ان کا مہر ہے، ابجدی نے خدا کی درگاہ میں رسول اللہ صلیم کے وسیلہ سے دعا کی اور یہ واقعہ ہوا۔

یہ قصہ ابجدی کے بیان میں ہے۔ ابجدی نے یہ قصہ مستند کی کئی مرتبہ شہر میں لکھنے کا یہ اثر ہوا کہ ابجدی سے بستی کی طرف لانے لگے اور آخری زمین میں ڈال دیا گیا اس کے پتھر کو کرکٹ یا لہری خندق میں پڑا پایا، بڑی ٹوٹ گئی تھی۔ اب صبح ہو گئی اور اس نے لوگوں کو آواز دی اس کی آواز سن کر اس کا ایک دوست حسن محمد آیا اور اپنے مکان پر لے گیا ایک سات تک اس کا علاج ہوتا رہا مگر اس کے بعد جینیت ہی رعت ہوتا۔ زبان پر نکت تھی جو مدت النہ باقی رہی اور وہ ایک آدھ میل سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ اور تمام دن میں سوچا رورق سے زیادہ لکھنے کی طاقت نہیں تھی اس نے ایک ملازم کو لکھنے کے لئے مامور کیا تھا اور زبانی کہہ کر لکھوایا کرتا۔

(رنگل زار اعظم مطبوعہ)

کے والد کا نام سید شاہ لکھا گیا ہے، غالباً لفظ ”میر“ سہو کتابت سے متروک ہو گیا ہے کیوں کہ ابجدی کے والد کا نام سید شاہ ہی ہونے کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے، دوسرا اختلاف یہ ہے۔ صبح وطن میں ملک الشعراء سے ۱۱۷۹ھ میں ملقب ہونا لکھا گیا ہے اور گلزار اعظم میں ۱۱۹۱ھ لکھا ہوا ہے ان دونوں سنیں کے قطع نظر اہتے (مصنف کی لاگ) نے ۱۱۸۹ھ میں ملک الشعراء کا خطاب منے کی صراحت کی ہے، بہر حال ابجدی کے دربار والا جاہی سے ملک الشعراء کے خطاب سے سربلند ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

ابجدی کی تصنیف میں سب سے اہم کتاب ”انور نامہ“ ہے اس کی تصنیف ۱۱۷۴ھ میں ہوئی ہے انور نامہ ایک فارسی مثنوی ہے، جو انشی عنوان پر منقسم، اور (۸۲۰) شعر پر مشتمل ہے یہ مثنوی انور الدین خاں گویا موی کے فرزند محمد علی خاں والا جاہ رئیس رکاٹ کے حسب خواہش لکھی گئی ہے، اس میں انور الدین صوبہ دار ارکاٹ کے حالات ابتدا سے ان کے انتقال تک اور پھر والا جاہ کے حالات ۱۱۸۴ھ (۱۷۶۹ء) تک درج ہیں، اہتے نے یہ صراحت کی ہے کہ انور نامہ میں نور الدین خاں کے حالات درج ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں انور الدین خاں کے انتقال کے بعد محمد علی خاں والا جاہ کے عہد حکومت کے بارہ سال کا حال بھی درج ہے، اور دراصل اس کی تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

ابجدی نے نہ واقعات اور حالات اپنے چشم دید نظم سے ہیں یا پھر سرکاری کاغذات سے اس کا مواد حاصل کیا ہے، اس لئے انور نامہ کی اہمیت تاریخی لحاظ سے بہت زیادہ ہے، اور پھر ادبی لحاظ سے بھی اس کو ایک باندیا مثنوی قرار دینا ضروری ہے، چونکہ ابجدی کی کا تار الکلام شاعر تسلیم کیا گیا ہے اس سے یہ مثنوی دو تو لحاظ سے خصوصیت رکھتی ہے اب تک ارکاٹ کے تاریخی حالات اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کی رسی کی زبردستی داستان صحیح طور پر مدون نہیں ہوئی ہے اس لحاظ سے مورخین کے لئے یہ کتاب خصوصیت

سے قابل ملاحظہ ہے۔

ابجدی کی دوسری تصانیف یعنی قصہ راغب مرغوب، مودت نامہ ہفت جوہر ہمساری، نظر سے نہیں گزریں اس لئے ان کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی جاسکتی۔  
ابجدی فارسی کے ساتھ اردو کا ادیب اور شاعر بھی تھا چنانچہ اس کا اردو دیوان مرتب ہوا ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک صرف اس کا ایک ہی نسخہ ہمد بسکا ہے جو اندیا آفس لندن کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ دیوان کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔

گرم ہے ہنگامہ ہر سویار کا ہے تماشا جلوۂ دیدار کا

منکر رویت نہ ہو اسے فلسفی دیدہ ہے یہاں دیدۂ درچار کا

جان دینے پر بھی گر ٹھہارے یہول مفت ہے سودا ترے بازار کا

ابجدی کی اردو تصانیف میں اس دیوان کے علاوہ ایک در کتاب ”تختہ الصبیان“

ہے، یہ کتاب بچوں کی تعلیم کے لئے لکھی گئی ہے اس کے اندر عربی فارسی الفاظ

کے معنی اور قواعد وغیرہ کا تذکرہ ہے، یہ رسالہ والا جاہ کے پوتے عبدالعلی کے لئے لکھا گیا ہے اس کا ایک مخطوط نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں ہے۔

آغاز

اللہ الہ خدا کا نانوں سبھی جاگے اس کا تقانوں

رسول نبی ہے پیغمبر افضل سب میں ہے بہتر

مصنف نے اس رسالہ کے متعلق جو صراحت کی ہے وہ یہ ہے

مندرج اس میں ہے لغت عرب مندرج اس میں اصطلاح عظام

محتوی حامل قواعد ہے مشتمل بر فنون شعر و کلام

چند در چند اس میں ہے داخل از رموزِ فواید اسلام



نام اس کا ہے تحفۃ الصبیاں تاکہ ہو طفل گان کو استفلام

بعدت کے بحسب آرزو کل کیا یہ نسخہ رنگیں بہار  
میں لکھا عبد العلیٰ خاں واسطے وہ ہے صاحب زادہ والاتبار  
لطف اس کا کار فرمائے جناب ذات اس کی سایہ پر درگاہ  
نور بخش دیدہ روشن دلاں باغ مقصد کا درخت باردار  
.. .. ..

نامور جد اس کا والا جاہ ہے ہے پدر اس کا امیر نام دار

## اختتام

سات سو پر ہے بیت چالیس قل مادل ہوئے زیب کلام  
خیر یہ رسالہ رنگیں ختم ہے والسلام والا کرام

## خاتمہ

تمت الرسالۃ تحفۃ الصبیاں بعون الملک المستعان بتاریخ نہم ذیقعدہ  
۱۲۰۲ھ

اتجیدی کی کوئی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی خصوصاً انور نامہ ایک  
اہم تاریخی دستاویز ہے۔

# دنیا سے اسلام

(جناب مدیر لائف انٹرنیشنل نیویارک)

مترجم

(جناب پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے)

(۲)

حضرت محمدؐ نے اپنی زندگی میں ذاتی طور پر عورت کی سماجی حیثیت کو بلند کیا تھا۔ لڑکیوں کے قتل عام کی مذمت کرتے ہوئے آپؐ نے یہ بتایا کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں خدا کی عطا کردہ نعمتیں ہیں۔ اسی طرح بددوں کی لاتعداد شادیوں کی مخالفت کرتے ہوئے انھوں نے تلقین کی کہ تمھاری نظر میں جو عورت خوبصورت اور نیک ہو اس سے بیاہ کرو۔ دو، تین یا چار عورتوں سے بیاہ کیا جاسکتا ہے لیکن اگر یہ خدشہ ہو کہ چاروں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہیں ہو سکتا تو ایک ہی سے شادی کرنی چاہیے۔ آج بہت سے مسلمان حضرت محمدؐ کے ان الفاظ کو ایک شادی کے حق میں پیش کرتے ہیں اور اس بنیاد پر اور معاشی وجوہات کی بنا پر مسلمانوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ایک یا دو بیویاں رکھتے ہیں۔ دوسری قدیم رسومات اسلام سے خارج ہو رہی ہیں یا مٹ رہی ہیں۔ ترکی مکمل طور پر اور مصر، شام، لبنان، ایران، عراق اور فلسطین میں بڑی حد تک پردہ کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ آج بھی عرب کے بعض حصوں شمالی افریقہ اور خصوصاً پاکستان میں جو تمام مسلم اقوام میں عورتوں کے لئے انتہائی قدامت پرست رجحان اور نظریہ رکھتا ہے پردے کا رواج پایا جاتا ہے۔ تاہم پاکستان میں صرف شہری عورتوں کی نصف تعداد جو کل آبادی کا ایک نہایت ہی قلیل حصہ ہے

پردہ کرتی ہے۔ چند مسلم ممالک میں جن میں پاکستان بھی شامل ہے عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے حق سے باز رکھوں گے۔ یہاں درمیں حق رائے دہندگی بھی دیا گیا ہے۔ اسلام میں عورتیں ہر جگہ ان سماجی پابندیوں کے خلاف بغاوت کر رہی ہیں، روشن خیالی مسلمانوں کے نزدیک اسلامی زندگی میں شہرہ کی ایک وجہ عورتوں کو مفلوج بنا دینا ہے چند اور اسلامی رواج جو یا تو ماخوذ ہیں یا مذہب کی طرف سے عائد کردہ ہیں بعد کے دو صفحوں پر دئے جاتے ہیں۔

”ایک مسلمان بچے کی ختنہ کی جاتی ہے“

اسلام میں دوسری رائج رسوم کی طرح رسم ختنہ بھی اس عہد کے مروجہ مذہبی رسوم سے اپنائی گئی تھی اور اس رسم کو حضرت محمدؐ نے سب سے آخر میں رواج دیا۔ قرآن میں ختنہ سے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ شاید اس لئے کہ غیر ضروری سمجھا گیا۔ زمانہ قدیم سے یہ رسم مصریوں، ابی سینا والوں، عربوں اور یہودیوں میں رائج تھی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان اس رسم کو ادا کرتے ہیں اور اسے بھی عقائد کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ اس رسم سے متعلق نظریات میں جگہ جگہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ مقامات پر اسے حکم سمجھا جاتا ہے۔ لیکن لازمی نہیں سمجھتے۔ دوسرے مقامات پر اسے ضروری اور لازمی سمجھا جاتا ہے یعنی جو ختنہ نہ کرے وہ صاحب ایمان نہیں۔ بہت سے علاقوں کے لئے یہ رسم جشن کے طور پر منائی جاتی ہے یعنی اس موقع پر دعوتِ طعام اور محفلِ قرض و مروت منعقد کی جاتی ہے۔

تکفین و تجہیز،

اگر رسوماتِ تکفین و تجہیز کو مفصل طور پر دیکھا جائے تو ہمیں بہت سے اختلافات نظر آئیں گے لیکن علم طور پر مسلمان تجہیز و تکفین کے سلسلے میں ایک ہی مرکزی مذہبی دستور کی پابندی کرتے ہیں۔

جوں ہی ایک شخص کی موت واقع ہوتی ہے اس کے جسم کو دھویا جاتا ہے یعنی غسل دیا جاتا ہے۔ ہاتھوں کو اس طرح رکھا جاتا ہے جیسے کوئی عبادت میں مصروف ہو اور لاش کو کفن میں



رکھا جاتا ہے۔ اس سے قبل کہ میت کا چہرہ ہمیشہ کے لئے چھپا دیا جائے۔ اس کے رشتہ دار اور عزیز اس کا آخری دیدار کرتے ہیں۔ قبرستان میں تلاوت کلام الہی کی جاتی ہے اور میت کے کانوں میں یہ جملے کہے جاتے ہیں، تمہارا رب کون ہے؟، اللہ، تمہارا دین کیا ہے؟، اسلام، اس کے رسول کون ہیں؟، محمد، یہ ان جوابات کی یاد دہانی کے لئے ہے جو قبر میں منکر و نکیر نامی فرشتے اس سے دریافت کریں گے، کیوں کہ اگر ان فرشتوں کے سوالات کے جوابات دینے میں غلطی سرزد ہو جائے تو وہ قیامت تک اسے اذیت اور تکلیف دیں گے۔ لاش کو قبر میں اس طرح اتارا جاتا ہے کہ اس کا منہ تعبکی طرف رہے ایک اصول کے تحت کفن حذف کیا جاتا ہے تاکہ فرشتوں کی آمد پر لاش ٹھیک طرح بیٹھ سکے۔

## ماہ رمضان

### ’نزولِ قرآن پر اظہارِ شکر کا مہینہ‘

حضرت محمدؐ پر سب سے پہلے وحی ’شبِ قدر‘ میں نازل ہوئی۔ ’شبِ قدر‘ روایتاً اسلامی سال کے نویں مہینے رمضان کی ۲۷ تاریخ کو ہوتی ہے۔ اسی لئے حضرت محمدؐ نے اعلان کیا کہ رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھنے کا مہینہ ہے۔ اس ماہ میں قرآن کا نزول ہوا۔ اور اعلان کیا گیا ’ماہ رمضان کے دوران میں جنت کے دروازے کھلے رہتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند رہتے ہیں اسی طرح شیطان مہینہ بھر گرفتار رہتا ہے۔ روزہ کے تصور سے حضرت محمدؐ عرصے سے متعارف تھے اس سے قبل یہودی اور عیسائی تسخیرِ نفس اور قرب الہی کے لئے روزہ رکھا کرتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں روزہ غروبِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک ہوتا تھا لیکن حضرت محمدؐ نے اس کے برخلاف پورے مہینے کے روزوں کا اعلان کیا اور روزے کے مختلف اوقات مقرر کئے یعنی صرف روزِ روشن ہی میں روزہ رکھا جائے۔ صرف اس وقت تک کھاد نہ ہو جو جب تک کہ صبح کا زہکے وقت ایک سفید ڈوری کی ایک

سیاہ دوری کے مقابلے میں تمیز نہ کر سکو۔ اس کے بعد غروبِ آفتاب تک مکمل روزہ رکھو۔ اکثر مسلمانوں کے نزدیک تمام مذہبی فرائض میں رمضان کے روزے سب سے اہم ہیں اور وہ انہیں نہایت پابندی سے انجام دیتے ہیں۔ بیمار، ضعیف، نابالغ اشخاص اور حاملہ عورتوں کے علاوہ ہر مسلمان کو ماہِ رمضان کے دوران صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک کھانے، پینے اور مباشرت سے لازمی طور پر اجتناب کرنا چاہیئے ایک دن کا روزہ ذرا سے جھوٹ یا بری نظر کی وجہ سے باطل ہو جاتا ہے روزے کے درمیان ان اوقات کو عبادت اور ریاضت میں گزارنا چاہیئے لیکن کچھ لوگ محض سو کر گزارتے ہیں اسی طرح تجارت اور عوامی مشاغل میں ان کے وقت سست رفتاری سے انجام پاتے ہیں لیکن جوں ہی مغرب کی اذان ہوتی ہے زندگی میں تازگی آجاتی ہے رمضان کے خاتمے پر کرمس سے مشابہت رکھتا ہوا ایک جشن عید منایا جاتا ہے۔ اس روز نمازِ شکرانہ ادا کی جاتی ہے بھائی چارہ کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور تحفے تحائف پیش کیے جاتے ہیں۔

صوفیائے کرام مختلف طریقوں سے قربِ خداوندی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں

دوسرے مذاہب کی طرح اسلام میں بھی ایسے اشخاص گذرے ہیں جو عمیق ترمذی تجربات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تاکہ اس طرح وہ قُربِ الہی سے مشرف ہوں انھوں نے صدیوں میں چند مسلم صوفیائے کرام نے ربانی اشتغالی پٹائے۔ بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں برادرانہ فضا میں ایک عظیم درویش برادری کا قیام عمل میں آیا۔ آج درویشوں کے ستر خانوادے ہیں، مغربی ممالک میں سب سے زیادہ مشہور فرقہ 'موویہ' ہے جو مذہبی درویشوں کی وجہ سے 'سیاح درویش' بھی کہلاتے ہیں۔ 'شیخہ' فرقے کے کچھ لوگ مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے مذہبی میدانِ درجانات کے زیرِ اثر ہر سال دس روز تک حضرت محمدؐ کے نو سے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا

عشرہ مناتے ہیں جس میں شان و شوکت کا اظہار کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے جانشینوں کی حیثیت سے جسمانی تکلیف دہی کے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں جن پر ہندوستان کے علاوہ عراق اور ایران میں پابندی عائد کی گئی ہے۔

”ایک نیا فرقہ جو اسلام میں ایک نئی رسالت تسلیم کرانا چاہتا ہے“

کوئی مذہب اسلام کی سی اس تیز رفتاری سے نہیں پھیلا لیکن تبلیغ کا طریقہ مغربی نظریہ سے ملتا جلتا نہ تھا۔ یعنی اسلام میں ترویج و اشاعت صرف تلوار اور شعلوں کے ذریعہ کی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام دہیاد کی اجازت دیتا ہے۔ اکثر مفتوح لوگوں نے معافی کی خواستگاری پر اسلام کو ترجیح دی اور مسلمان ہو گئے۔ مسلمانوں نے اکثر بیڑیوں اور عیسائیوں کو جزیہ اور خراج ادا کرنے میں مذہبی آزادی دی۔ اکثر اشخاص نے اس کی بہترین مذہبی پالیسی کی وجہ سے اسلام اختیار کیا اور ان صدیوں میں جب کہ بوستان اسلام میں فسگفتگی اور بہار چھائی ہوئی تھی۔ نہایت ہی خاموش اور پرسکون طریقے پر اس کی اشاعت ہوتی رہی۔ عرب تجارتی اسلامی احکام کو ہندوستان، چین اور انڈونیشیا تک پہنچا کر اشاعت اسلام کے لئے بہت سی کوششیں کیں۔ موجودہ وقت تک اسلام میں کوئی منظم تبلیغی تحریک نہیں تھی جہاں ایک طرف کٹر مسلمانوں نے خدا اور انسان کے درمیان کسی کی سفارش سے انکار کر کے کسی مستقل نظام میثوائی کو فروغ نہ پانے دیا۔ دوسری طرف اسلامی عقیدے نے ہر مسلمان کو مبلغ قرار دیا۔ اسلام خود اپنے غور رکھ بھی نہ سکا۔ دوسرے مذاہر کے عقائد سے نفرت اور حقارت کی وجہ سے بیرونی نئی اور مفید تجاویز کو اپنانے سے اسلام نے انکار کیا، لیکن آج یہ علامات نظر آرہی ہیں اسلامی تبلیغ نے عیسائی تبلیغ کی اصطلاح میں لچپی لپی شروع کر دی ہے۔ قاہرہ کی قدیم یونیورسٹی جمیعہ الاذہر جو اسلامی فہرست کا ایک مرکز ہے اور جس نے مغربی اثرات کی کافی مخالفت کی تھی۔ اس تبلیغ کے میدان میں طلبہ کو تربیت دے رہی ہے اور بہت سے مذہبی ادارے



اور ان کی شاخیں مذہبی زور اور تاثیر کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ ان تمام میں سب سے زیادہ زور دار اور اہم فرقہ 'احمدیہ' ہے جس کے مرکزی مقامات پاکستان میں ہیں۔ اور جس کے مبلغین یورپ، افریقہ، امریکہ اور مشرقِ بعید میں پھیلے ہوئے ہیں۔

'احمدیہ' جماعت کی تحریک گزشتہ نصف صدی میں ہندوستان سے اٹھی اس کی ابتداء اسلام کی دیگر جماعتوں اور فرقوں کی طرح غیر معمولی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں پنجاب کے ایک مقام قادیان سے مرزا غلام احمد نامی ایک مصلح نے یہ اعلان کیا کہ وہ نئی وحی اور عہد جدید میں اسلام کی نئی تعبیرات کا پیغامبر ہے۔ اُس نے یہ بھی انکشاف کیا کہ اُس سے متعلق قرآن اور انجیل دونوں مقدس کتابوں میں پیشین گوئی کی گئی ہے اس نے عیسیٰ اور عہدِ نئے کا بھی دعویٰ کیا اور یہ کہا کہ وہ حضرت عیسیٰ سے مشابہت رکھتے ہوئے خصوصیات کا حامل ہے۔ (بعد میں اس نے خود کو حضرت عیسیٰ پر فوقیت دی) چند سالوں کے بعد اُس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ ہندو مت کے 'کرشنا' کا وہ اوتار ہے (لائف انٹرنیشنل ۴ اپریل) اُسے اپنی پیشین گوئی کی قابلیت پر بھی فخر حاصل تھا۔ اُس نے اپنے مخالفین کی اموات کے بارے میں جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ اس حد تک صحیح ثابت ہوئیں کہ حکومت کرنے والے اُس پر پیچیدہ اذیت کے استعمال کرنے پر پابندی لگا دی۔ اس کی تعبیرات آزاد خیالی پر مبنی تھیں وہ اشد اعتدال اور شمشیر و جہاد کی بجائے تعلیم و ہدایت سے کرنا چاہتا تھا۔

۱۹۰۷ء میں مرزا احمد کی وفات کے بعد اُس کے پیروکار دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک قادیانی، گروہ جو مرزا احمد کو پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرتا تھا اور دوسرا گروہ جو اس نظریہ کی مخالفت کرتا تھا۔ آخر لڑکر گروہ نے جماعتِ اسلام لے لے دی اور میں پیٹ سوسائٹی، قادیان کی۔ آج یہ دونوں گروہ تمام عالم میں تبلیغی کام کر رہے ہیں۔ قادیانیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے افریقہ میں جو اس تبلیغ کا خاص نشانہ تھا، اس کا تذکرہ راسخ شخص کو اس مذہب میں شامل کرایا۔

یہ واضح ہے کہ دنیا میں اسلام جہاں کہیں پھیلا ہے صرف اس وجہ سے کہ "سفید" نسل کے لوگ تعصب اور جانبداری کی وجہ سے عیسائی کی ان تعلیمات کو بھول بیٹھے جس میں انھوں نے انسانی برادری اور مساوات پر زور دیا تھا۔

عیسائیت اور یہودیت کی طرح اسلام بھی جنوب مشرق کے بحر روم سے ملحقہ علاقوں کے قبائل سے شروع ہوا۔ یہوشلم کی وہ پرانی چٹان جو عیسائیت سے قبل کے عہد میں ایک قربانگاہ کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے لئے ایک مقدس عبادت گاہ بن گئی۔ حالاں کہ اس سے قبل کبھی بھی مسلمانوں نے اسے استعمال نہیں کیا تھا دنیا کی مختلف النوع اسلامی آبادی میں مختلف نسل و قوم کے لوگ ہیں اور اکثریت ان لوگوں کی ہے جو دیگر رنگوں و نسلوں کے گروہوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ ان میں سے تین چوتھائی آبادی ایشیا میں سستی ہے اور بقیہ آبادی میں سے اکثر افریقہ میں آباد ہیں لاکھوں حشیوں نے جو کل آبادی کا تقریباً پانچواں حصہ ہیں سلام قبول کیا ہے۔ افریقہ کے چند حصوں میں جہاں عیسائیت اور اسلام تبلیغ میں ایک دوسرے کے مقابل ہیں اگر دس اشخاص سلام قبول کرتے ہیں تو کسی دوسرے مذہب میں صرف ایک ہی شخص داخل ہوتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مغربی افریقہ میں سفید نسل کے

مذہب "عیسائیت" کے مقابلے میں سیاہ نسل کا مذہب "اسلام" ہے یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جہاں سلام کے ماننے والوں کی کثیر تعداد ہے اکثر مسلمان یا تو ہندومت ترک کر کے مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں یا ان کے آباء و اجداد نے سماجی دینچ پیچ اور ذات پات سے گھبرا کر ایک ایسے مذہب کے دامن میں پناہ لی جو اپنے ماننے والوں میں مساوات کا علم بردار ہے۔ اسلام جیسے جہاں نواز اور روادار مذہب ہیں، ہر ایک مسلمان، خواہ وہ سفید نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سیاہ نسل سے، خواہ وہ سرخ قوم سے تعلق رکھتا ہو یا زرد سے، امیر ہو یا غریب اپنے آپ کو دنیا کے بسنے والے تمام مسلمانوں

کا بھائی سمجھتا ہے۔ توحید کے برحق اصول کے تحت اسلام حکومت الہیہ کے زیر سایہ انسانی برادری کی تخلیق کرتا ہے اسلام کے دائرے میں آنے والے نو مسلموں کا بلا تفریق مذہب و ملت مساویانہ استقبال کیا جاتا ہے۔

اس تبلیغی تحریک کے علاوہ اب یہ آثار نظر آرہے ہیں کہ مسلمانوں کے بلند عزم اور کوششیں اسلام کو اس جمود اور ٹھہراؤ سے نکالنے میں مصروف ہیں جو مغربی دنیا کی بیداری کی وجہ سے اسلام کی عظیم المشان سلطنت پر اثر انداز تھا۔

دنیا کے تمام حصوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں بستے ہیں، سیاسی، روحانی اور معاشی طریقے پر ترقی اسلام میں کوشاں ہیں۔ ترکی میں جہاں اتاترک کی حکومت کے فرمان کے بموجب اسلام کی کافی مخالفت کی گئی تھی۔ اب گزشتہ پانچ سالوں میں تقریباً سینکڑوں مسجدیں بنوائی گئی ہیں اور قومی ریڈیو اب مختلف مذہبی مسائل پر پروگرام نشر کرتا ہے اسی طرح ترکی زائرین کعبہ کی تعداد ہر سال کئی ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ ایران میں علم معرفت حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد ۱۹۵۰ء کے مقابلے میں چالیس فی صدی بڑھ گئی ہے۔ یہی کارروائیاں شمالی افریقہ میں بھی نظر آرہی ہیں۔

اسلام کے بین الاقوامی طاقت کی حیثیت سے دوبارہ نمودار ہونے کی ایک نمایاں وجہ سعودی عرب کے بادشاہ شاہ سعود، پاکستان کے سابق وزیر اعظم محمد علی درمصر کے وزیر اعظم جمال عبدالناصر کی ملاقات ہے جو جمال عبدالناصر کی حج کے لئے پہلی مرتبہ مکہ آنے پر ہوئی تھی۔ وزیر اعظم مصر نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلم ممالک کے سربراہ اور وہ لوگوں کی ایک کانفرنس ہر سال حج کے موقع پر منعقد کی جائے۔ شاہ سعود نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور تجارتی کا خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک مجلس مذاکرہ کیا جس کے نتیجے میں اس سال حج کے بعد سعودی عرب کے صدر مقام 'ریاض' میں سلامی دنیا کی اس قسم کی پہلی کانفرنس ہوگی۔ مغربی اثرات کی وجہ سے ہر جگہ سلام میں کشمکش کا احساس پایا جاتا ہے۔ بے دینی اور قومی خیالات کے دباؤ اور



سعودی عرب جیسے ممالک کی افراط زر نے مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے تقاضوں اور اسلامی روایات سے مسلمانوں کی وفاداری کے درمیان جو گہرا اختلاف ہے اس سے خبردار کر دیا ہے۔

عہدِ یاسنی میں اسلام نے اپنے اندرونی اختلافات سے چشم پوشی کے باوجود بیرونی اثرات سے بے گانگی اور بے زاری برتی۔ آج بہر حال اسلام جو جدید دنیا کی قوتوں سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ جدید قدامت کی اور مذہبی مصلحین جدت کی مخالفت کر رہے ہیں اور اسلام کو فراموش کردہ تصورات و خیالات کی طرف لے جا رہے ہیں کچھ لوگ، ضعیفی کی روایات کو ترک کر دینے پر مصر ہیں۔ ان دو متضاد نظریات کے درمیان درمیانی راستہ ہے جس کے متعلق مبلغین یہ کہتے ہیں کہ اسلام اندرونی طور پر اصلاح کے بعد مغربی ممالک سے مساویات اور آزادانہ تعاون کی بنیاد پر مل سکتا ہے۔ اسلام کی اس اندرونی کشیدگی کی ایک اہم مثال ہمیں پاکستان میں ملتی ہے جہاں اسلامی عقائد کی وجہ سے ایک ایسے دستور کا نفاذ جو سیاسی ضرورتوں اور قرآنی احکامات پر مبنی ہو۔ ایک مشکل در اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ دوسرے مقامات پر بھی مسلم زعماء اسلامی قوانین کو بدلتے ہوئے سماجی نظام سے مطابقت بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سخت در کٹر مذہبی عقائد میں تجدید کی ایک اور مثال جامعہ لازہر کا دہ اعلان ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آئندہ تعلیمی سال سے جامعہ کے دروازے خواتین کے لئے کھول دئے جائیں گے۔

مشرق اور مغرب، جمہوریت اور اشتراکیت کے درمیان موجود عالم گیر کشمکش میں اسلام کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کیوں کہ اسلام نہ تو مغرب سے نہ مشرق۔ بلکہ دونوں کا حصہ دار ہے۔ یہ ایک جانب یورپ اور ایشیا کے درمیان اور دوسری سمت یورپ اور افریقہ کے درمیان چھایا ہوا ہے حالانکہ اکثر ممالک میں اشتراکی ہیں۔ لیکن تعداد میں قلیل اور غیر منظم ہیں۔ حکومت روس میں تقریباً دو کروڑ مسلمان ہیں۔ مسلمان آبادی کا پانچواں حصہ وسطی ایشیا میں مقیم ہے اور بقیہ لوگ قزاقستان اور دیگر نواح مختلف حصوں میں رہتے ہیں تاہم حکومت روس اسلام کو اپنا مہنوا بنانے کی بجائے انہیں، بنانے کی ہر ممکن سعی کرتی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کو پسماندہ خیال کیا جاتا ہے۔ رحمت

پرست کہہ کر کھام کھان لی توہین کی جاتی ہے۔ یہ مغربی دنیا کی ایک غلط فہمی ہوگی اگر وہ  
اسلام کو اشتراکیت کے لئے بھروسہ خود ایک رکاوٹ سمجھیں گے یہ بیچ سے مذہب اسلام اور  
عقیدہ نیت ایک ہی بنا رہے بھرے ہیں۔ ان کے دستان سب بھی جہنم سے ساری خدافات  
موجود ہیں جن کو دور کرنا ہے۔ مسئلہ جذبہ کی موجودہ ذریعوں میں سے، قباشر یہ مذہب انوں کے لئے  
ایک اندھا پائی حیلہ پیش رکھتا ہے جب کہ تعبیر میں اس سے عاری ہے اس میں شریعتیں کہ  
اسلام جس پر مبنی ہے ان کے مستقبل پر اثر کرتے ہیں۔ اسلام کے یہ پانچ اصول ہیں جو  
حقیقت کا پورا حجب کرتے ہیں اور جتنے میں میں سے یہ سب سے بڑا ہے، تھوڑے روز ہر پورا  
مبنی ہے اس پر یہ سب سے بڑا ہے اس میں سب سے بڑا ہے اس میں سب سے بڑا ہے اس میں سب سے بڑا ہے  
موفق رہتے ہیں کہ مبنی حاصل کی ہے۔ سی وجہ سے بہت سے مسلمان باطن میں کفر کے  
روحانی ور مذہبی مسائل حقیقت میں ناک ہیں جیسے نعمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا باطنی قبول ایک  
جنگ ہے۔ ہم پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک کلمہ جادو جہد سے نکل کر در پڑی  
جہد جہد کا وقت کے طور سے ہے جو چاہے وہ جہد جہد کیا ہے۔ تو حضور نے فرمایا  
واللہ و فی جہد جہد

دشمن دشمن ہیں اور دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
مکرمہ مذہب کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں صلیب یوں در ہودیوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں جہد جہد کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں جہد جہد کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں جہد جہد کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں جہد جہد کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں جہد جہد کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں جہد جہد کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔  
میں جہد جہد کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔ دشمنوں کے لئے یہ سب کچھ ہے۔

تو یہیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کی تھی اور حضرت ایساؑ سے لے کر  
 حضرت محمدؐ تک تمام پیغمبر یہاں عبادت کے لئے آئے تھے اسی چنانچہ حضرت محمدؐ شہیدِ جرج کو فلاک  
 پر گئے تھے اور قیامت کے دن اسی چنانچہ اسے افضل اپنا صورت پہنکیں گے وہ بڑا گنبد جو اس چنانچہ کو اپنے حصہ  
 میں لئے ہوئے ہے بلکہ ان عباد گاہوں میں حج و عمرہ پریم سے اس مقدس سرزمین پر کھڑی ہیں تازہ ترین تھیں۔  
 حضرت سلیمانؑ نے اپنا شاندار عبادت خانہ ۹۶۶ء ق م میں تعمیر کرایا جسے *Meluhadano* نے  
 ۵۸۶ء ق م میں منہدم کر دیا۔ بابل کے زفرج کے بعد ۵۸۶ء ق م میں یہاں ایک نیا مندر  
 بنایا گیا جس کی جگہ ۲۰ قبل مسیح میں ہیروڈ (Herod) کے مندر نے لے لی۔ ۱۲۵ء میں شہنشاہ  
*Hadrrian* نے اسے مسر کر کے اس کی جگہ بت پرستوں کا ایک مندر بنوایا۔ دسویں  
 سال بعد ملکہ ہینا (*Helina*) جو روم کے پہلے عیسائی قسطنطین کی والدہ تھیں یروشلم  
 آئیں اور تمام مشرکانہ مشہدوں کو منہدم کرانے کا حکم دیا۔ اس وقت سے ۶۳۸ء تک جب  
 کہ خلیفہ حضرت عمرؓ نے یروشلم فتح کیا۔ یروشلم کا تمام فضاء اس مقدس مقام پر پھینکا جاتا تھا۔ اس  
 ناپاک اور گندگی سے حضرت عمرؓ کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ کھوں نے خود اس جگہ کو پاک فضا کرنے میں مدد دی۔  
 صدیوں سے مسلمان قبۃ الصخرہؑ کی تعظیم کرتے ہیں اور تمام خاندانوں کے بادشاہوں نے  
 اس پر خصوصی توجہ دی ہے۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک جب کہ اس پر صلیبی مجاہدوں کا قبضہ تھا اور  
 پراکھ صلیب نصب کر دیا گیا تھا اور چنانچہ کو قربان گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ کسی زمانے  
 میں یادری اس چنانچہ کے مزاروں کو ہوزن سونے کے عوض بھی کرتے تھے اور زائرین اسے تبرک  
 سمجھ کر وہ پیکے باتے تھے۔ لیکن بعد میں عیسائی بادشاہوں نے اس پر ایک لوہے کا جھگڑا بنا  
 دیا اور اس کا ردبار دیوار تخت کردی۔ یہ جھگڑا آج بھی چنانچہ کی حفاظت کرتا ہے۔  
 جس وقت مسیح موعودؑ یروشلم فتح کیا تو انھوں نے اس جھگڑے کے علاوہ تمام عیسائی منشیات  
 مٹا دیں اور عمارت کے اندر فی جگہ کو خراب و مسموم سے خواہ صورت بنایا۔ موجودہ عہد میں تاریخی شہیدِ جرج  
 نے کافی نقصان پہنچایا جب یہاں کو ایک منشیہ کے تحت قسطنطین ملکہ تو اس نے فوری تعمیر و مرمت کا کام  
 شروع کیا لیکن دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے اسے روک دینا پڑا۔



# اسلام کی روحانیت

(خط کا ترجمہ)

مدیر، لائف انٹرنیشنل، نیویارک

جناب عالی:

اپنے 'لائف انٹرنیشنل' نے ۸ اگست ۱۹۵۵ء کے شمارے میں اپنے قارئین کے سامنے دنیا کے اسلام کا ایک روشن خاکہ پیش کیا ہے۔ اس عیدِ تقدیر مذہب کے حقائق کو جمع کر کے پیش کرنا ایک عظیم الشان کوشش ہے۔ میں یہ عمر کہ سلام اس قدر جلد اس طرح پھیلائی سے حل نہ ہو نہ کار اس کا یہ جواب ہے۔

ملاشک اسلام فی معمولی ادب و رے طور سے اس بات پر زور دے رہا ہے کہ اس زندگی کو صحیح معنوں میں کس طرح گزارنا چاہیے۔ مشکل سی ہے زندگی کا یہ سب سے زیادہ جو جس کے لئے اس مذہب نے مثالی عملی حل پیش نہ کیا ہو۔ ان تمام شکلیں کے پیش نظر ہمیں یہ یاد رہے کہ ان فہم سراسر ترین روحانی پہلو کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

اس کی روحانیت اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ خدا در اس کے حقائق کو صحیح طریقہ پر اس طرح تسلیم کیا جائے۔ خدا ایک ہے، ہمیں صرف کسی کی عبادت کرنی ہے۔ دین اس کا واحد حق ہے۔ اور ہم کسی اور کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں۔ اور یہی روحانی پیغام ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لئے مفید ہے۔ محمد کو متعین کیا گیا تھا کہ وہ اس کو تمام کائنات میں منتشر کر دیں۔

یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جب انسان اس پیغامِ ربانی سے پیش رو رہتا ہے تو خدا کی خوشنودی حاصل کرتا ہے اور خالق کے نظری اور کافی قوانین سے موافقت کرتا ہے۔ درجب وہ دوسروں کو ذمہ نشین کرانے کے لئے نکلتا ہے تو اسے بے پناہ قدرتی مدد ملتی ہے۔

یہی وہ متحرک قوت تھی جو محمدؐ نے ان کے فطریوں کے خقب پر تھی۔ اسی لئے وہ شکست سے کبھی دوچار نہ ہوئے اور دس گنا مساعدات پر قابو پایا۔ گویا روحانیت کی فتح جسم پر ہوئی۔ قدیم مسلموں کو ہمیشہ اپنی پرافتخار سے جنگ کرنا پڑی۔ فطریوں نے دست درازی کی خاطر سرگزشت نہ کی۔ جب تھقی، فطریوں و سبوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لئے تھے تو سب سے پہلے خدا سے برتری عبادت کے ذریعے: یعنی بھائی بننے کی سوت کی۔ اگر یہ بل نہیں نہ ہو تو اس کا دوسرا پل پیش کیا کہ وہ جزیہ دے کر کے صحیح سلامت رہیں۔ میں جب یہ سنائی پیش نہیں کھدائی گئیں تو انھوں نے تلوار اٹھائی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ یہ روحانی پیغام اس بڑی زمانہ میں ہی قدر سچا ہے جب کہ پہلے تھا اور ایسے ہی ہمیشہ رہے گا۔ دین اس کا مسخ ہے۔ سے بہ نادر کے ساتھ دینا جائے۔ تمام دنیا کے اتحاد اور خوشی کے لئے پھیلا رہا ہے۔

طاقت سے ہمیں بہ جرأت مدد نہ دوشہ ش سے اس کے نو اس جو زندہ فطریوں کا بت کراچ بھی



# کتابت

## قصیدہ

بمنقبت قدوة الواصلین زبدة المتقین قطب قطاب عالم ربانی  
حضرت مجدد الصلواتی مولانا شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ  
از سیدی وجہدی المحترم مولانا حکیم سید احمد علی سیما بٹونکی  
(پیش سیدی)

بیا بہ منظر چشم و دل عزیزاں باش  
چو خلق عاطفت من رہ و تو خود خواہی  
مطایع خلق شدن بیش ازین کنی خود  
بہ کار ساز جہاں ساز کار خود بگزار  
زمانہ نیست چو گاہے ز نوش و غیش تی  
در این ہمہ بنود از پتہ حصول ثروت  
غلام حضرت شیخ احمد مجدد شو  
چو رنہ کاری خود در ادبیں تو  
بہ رسد شش خستہ دن کشور عس  
خجہ شش سبب نفس کہ در خویش  
دمن بہ خندہ میالا کہ دل بہ میراند  
کسے بہ رتبہ عالی نہ می رسد بہ حمد  
تجربہ کن کہ وجودت بہ ملک  
طنی بندگی ز خو جگان دید کہیز  
تیار پیش کسے بر کہ بے نیاز بود



ز فیض صحبتِ دانندگانِ راہِ سلوک      بیا بہ منزلِ قُرب و قُربِ جانِ باش  
 تو عشقِ درز بہ سلطان نہ باز رو جایش      کہ از حصولِ رضایش بہ خلقِ سلطانِ باش  
 ترا دریں تنِ خاکی تہادہ اندازاں      کہ خود بہ حلم و تواضعِ نجاک یکساں باش  
 ہزار ساں غمتِ گر بہ جاں کشد سیلاب  
 ہنوز حرص بہ بندش ہزار چنداں باش

## غزل

از

(جناب آلم مظفر نگری)

جب دل کے دونوں حرفِ بہم کر دئے گئے      معنی طرازِ لوحِ دِ قلم کر دئے گئے  
 خود ہو گئے وہ عیش و عالم سے بے نیاز      جو آشنائے لذتِ غم کر دئے گئے  
 اس کے سوا حقیقتِ عام ہے اور کیا      ذرے ملا کے چند بہم کر دئے گئے  
 تقلیدِ رہنما کا نتیجہ تو دیکھئے      منزل سے دور اور بھی ہم کر دئے گئے  
 بڑھتی ہی جا رہی ہے اب فسّر کی شوق      ہم کیوں رہیں صفِ کرم کر دئے گئے  
 سمجھا نہ جن کو درِ خور سے خانہٴ عشق نے      وہ جامِ وقفِ محفلِ جم کر دئے گئے  
 نسبت نہ جن کو قہقہے کوئی ایسا کفر سے      وہ کیوں شریکِ دیرِ حرم کر دئے گئے  
 زارِ وزغن کے شور سے کم رہتا آج کل      نعمتِ عسراںِ حرم کر دئے گئے  
 پوچھیں گے باغبان سے کہ فصیح بہار میں      کیوں دورِ صحنِ بغ سے ہم کر دئے گئے  
 آج ان کی بزمِ ناز میں نہ ہوں کے ساتھ      درجۂ اہلِ عشق بھی کم کر دئے گئے  
 یہ سوچتا ہوں دیکھ کے ذرا غم کو میں      کس کے گناہ اس میں رقم کر دئے گئے

نیچے آلم بہ لحنِ حجازی جو تھکے مرے

وہ سب ہی وقفِ سازِ عجم کر دئے گئے

## تیسرے

انسٹروکشن ٹو اسلام | از ڈاکٹر محمد حمید اللہ تقطیع کلاں - ٹائپ جلی وردن قیمت ۵۰ روپے  
ملنے کا پتہ - حبیب نیڈکو، اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن - انڈیا

ڈاکٹر حمید اللہ نے جواب فرانس میں مستقلاً مقیم ہو گئے ہیں۔ پیرس میں ایک سوسائٹی قائم کی ہے جس کا مقصد تصنیف و تالیف اور تحریر و انشاء کے ذریعہ اسلامی تاریخ و فلسفہ اور اسلامی دینیات کو یورپ و امریکہ میں متعارف کرانا ہے چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے زیر تبصرہ کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں فاضل مولف نے صاف مگر دل نشین انگریزی میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری بیان کی ہے اور اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ اسلام کی اصل تعلیمات دوسرے مذاہب کی تعلیمات کی طرح محرف نہیں ہیں اس لئے ان پر مکمل عقائد کیا جاسکتا ہے۔ اس ابتدائی بحث کے بعد مختلف عنوانات پر مثلاً ”زندگی کا سدھی تصور“ ”ایمان اور عقیدہ“ ”اسلام کے مذہبی اعمال“ ”روحانی زندگی“ ”نظام اخلاق“ ”سودم کا سیاسی نظام“ ”اسلام کا قانون اور اقتصاد“ ”نظام“ ”مسلمان عورت“ ”غیر مسلموں کا اسلام میں مرتبہ“ ”سائنس اور علوم و فنون کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ“ ”اسلام کی عام تاریخ“ ”مسلمان کی روزانہ کی زندگی“ ان عنوانات پر مختصر مختصر مگر بڑی حد تک جامع و مبصرت فریز لکھا گیا ہے۔ اس کتاب یہاں ختم ہو جاتی ہے مگر اس کے بعد تین صفحے کے جو عنمیمے ہیں ان میں بھی بڑے کام کی معلومات ہیں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے مفید ہیں ان عنمیموں میں نماز کی حیثیت اور تمام ادعیہ جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں زاوے تاخرن کو پہلے عربی میں نقل کیا ہے اور پھر انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعد ایک نقشہ ہے جس میں موجودہ بیسویں صدی کے ختم تک سب سے تمام سدھی تیوہار انگریزی تاریخ کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ماسک جو خط سنو سے بہت دور یعنی ۵۰۰۰ سال پہلے کی جو بات میں رہتے ہیں ان کے پانچوں وقت کی نمازوں کے اوقات کا پروگرام بنا کر پیش کر دیا ہے۔





# بُرھان

شمارہ ۴

جلد ۱۴

اکتوبر ۱۹۵۸ء مطابق ربیع الاول ۱۳۷۸ھ

فہرست مضامین

نظرات	سید احمد الہ آبادی	۱۹۳
ء بی کی ایک قلمی کتاب ہے	جناب ڈاکٹر خورشید احمد ذرق صاحب	۱۹۳
تاریخ ہند پر نئی روشنی	استاذ ادبیت ء بی دہلی یونیورسٹی	۱۹۴
یہ کتاب مزہ اور سادگی شاعری پر یک نظر	جناب ڈاکٹر قاضی محمد ابراہیم صاحب ایم اے	۲۰۴
	پی ایچ ڈی سلامیہ یوسف کالج جولیشوری	۲۰۴
۱۸۹۸-۱۸۹۹ء میں	جناب ڈاکٹر عابد رضا صاحب بیدار	۲۲۶
ایک ہندوستانی سیاح کا سفر نامہ	جناب مولوی فضل الرحمن صاحب مدنی قاضی پورہ	۲۲۶
ء بی سومہ دفترون پر سلام کا اتر	جناب شراحمد صاحب فاروقی	۲۴۶
فارسی و اردو کی چند کمیاب کتابیں		
کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں		
ادبیات		
غزل	جناب آلم مظفر نگر	۲۵۱
تبصرے	(س) (م)	۲۵۲

# نَظَرْتُ

سیرت کے جلے بلکہ کانفرنس جس کثرت سے اور جس دھوم دھام اور تزک و احتشام سے آج کل ہوتے ہیں۔ پہلے بھی کبھی ہوتے تھے؟ اور جس قدر روپیہ ان پر خرچ ہوتا ہے۔ پہلے بھی مذہبی اجتماعات ہر کبھی اتنا خرچ ہوتا تھا؟ لیکن آج مسلمانوں کی مہینداری۔ مذہبی زندگی اور نابت الی اللہ کا حال کیا ہے؟ اس حیثیت سے وہ اگلے زمانہ کے مسلمانوں سے بہتر ہیں یا بدتر؟ انھوں نے کچھ ترقی کی ہے یا اور انحطاط و تنزل میں جا پڑے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام جیسی اپنی زندگی بنالینے کا جذبہ ان میں کچھ قوی تر ہوا ہے یا اور مضعف تر ہو گیا ہے؟ ان سوالات کا جواب ظاہر ہے۔ اس کے متعلق دورائیں ہرگز نہیں ہو سکتیں: اب سوال یہ ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ سیرت کے جسوں یا بالفاظ صحیح تر عید میلا دالنبی کو اس طرح مناسک کے دستور سے پیسے ہوتا یہ تھ کہ جموعہ نماز کے بعد سام طور پر وعظ ہوتا تھا۔ یا کانفرنس بھی ہوتی تھیں تو مواعظ کی ہوتی تھیں۔ جن میں علمائے کرام جو علم و عمل کے اعتبار سے نمایاں شخصیت کے مالک ہوتے تھے۔ دو، تین تین گھنٹے وعظ کہتے تھے۔ ان مواعظ میں کیا ہوتا تھا؟ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور اس کی صفات کا بیان۔ یوم آخرت اور اعمال و افعال پر قرآنی وعد و وعید کا تذکرہ۔ انبیائے کرام اور بزرگوں کے قصے اور ان کے وقوت زندگی۔ جنت و دوزخ اور دنیا کی بے ثباتی و بے حقیقی کی تشریح و توضیح۔ پھر ان مواعظ میں کہیں قرآن مجید کی آیات پڑھی جاتی تھیں اور کہیں احادیث نبویہ کبھی مولانا روم کیثنوی کے اشعار پڑھے جاتے تھے اور کبھی جامی و سعدی۔ ابوسعید ابوالخیر سنائی اور عری و قدوسی کے ولولہ انگیز اشعار و قطعات ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سامعین کے قلوب میں رقت پیدا ہوتی تھی۔ خدا کی عظمت اور یوم آخرت کا ڈر جو مذہب کی اصل بنیاد ہے ان چیزوں کا اعتد و جازم اور یقین کامل پیدا ہوتا تھا۔ سننے والوں کا تاثر حجب شدید ہوتا تھا تو ان میں انابت الی

اور تقرب مع اللہ کا جذبہ و ولولہ جو دین کی اصل غرض و غایت ہے ابھرتا تھا اور وہ ان کے ہر عمل و فعل پر چھا جاتا تھا۔ ایسا ہونا تھا بھی طبعی کیونکہ دین کی طرف دعوت دینے کا ہی وہ طریقہ ہے جو قرآن کے مطابق ہے اور جو انبیائے کرام اور سف صالحین نے خفیہ رکھا ہے۔ قرآن کو، زاون تاخر پڑھ جائے آپ بار بار اور بڑی شد و مد کے ساتھ جس چیز کا تذکرہ پائیں گے وہ خدا کی عظمت و جہدست اور یوم آخرت ہی ہے۔ ان کے عہد وہ اور جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب انھیں دو پر مبنی اور قیام ہیں اور انہیں تو وہی اسی لئے۔ رسولوں کی بعثت کا تذکرہ ہے تو وہ بھی انھیں کی وجہ سے اور پھر قصص و امثال ہیں تو وہ بھی ان دونوں چیزوں کی حقیقت اور اہمیت کو زیادہ سے زیادہ واضح کر دینے کی غرض سے!

لیکن اب آج کل عید میلاد النبی کی تقریب سے جو جلسے ہوتے ہیں ان میں کیا ہوتا ہے؟ شاید پنڈل بنائے جاتے ہیں۔ ان کو دھن کی طرح سجا جاتا ہے۔ تمغوں کی جھانکا ہٹ سے پنڈل بچھوئے جاتے ہیں تقریر کرتے والوں میں مسلم اور غیر مسلم، لہ اور غیر لہ دونوں قسم کے حضرات ہوتے ہیں یہ تقریریں زیادہ سے زیادہ گھنٹہ دہ گھنٹہ ہوتی ہیں۔ جو غیر مسلم اور غیر لہ مقرر ہوتے ہیں ان سے تو اور توقع بھی ہو سکتی ہے جو وہ ہوتے ہیں وہ بھی وقت و فیشن کے مطابق خدا کی ذات و سنت و ذکر کریں گے۔ ورنہ یوم آخرت و جہنم و دوزخ کا نہ مودن آدم کی شہنشاہی میں گئے ورنہ جای نہ دے گا۔ یہ سب تہذیب و تمدن کے تقاریب و رسوم میں ذکر ہو گا تو اسلام کی ان تعلیمات و احکامات کے ان اثرات کا ان سے آج بھی کسی اور غیر مبنی سی حالات پر استدہان کیا جاسکے۔ اسلام کے سب سے نظام کا تذکرہ ہو گا۔ ان کی تعریف و ستائش ہو گی۔ اسلام میں حقوق بنی نوع انسان پر دیا گیا ہے۔ ان کے حقوق۔ اسلام اور کون سا مذہب ان کے حقوق کا سہارا ہے؟ اسلام ہی ہے۔ اسلام ہی ہے جو اصل مقصد ہے یعنی امانت الی اللہ اور تقرب مع اللہ۔ خدا کی آخری و سب سے بڑی بات کوئی ذکر نہ ہو گا کیونکہ یہ باتیں دقیق و سست ہیں ورفیشن کے خلاف ہیں۔ ان کے خلاف ہیں۔ ان کے خلاف ہیں۔



بعد پٹال میں مشعرہ ہوگا۔ قونی ہوگی اور آتش شب کے سہانے لہجے میں یہ متبرک مجلس ختم ہو جائے گی۔  
 تقریروں کا یہ انداز تو سی وقت ہوگا جب کہ مقرر صاحب موضوع سخن کے اندر محدود رہنے کی کوشش  
 کریں۔ ورنہ عام طور پر دیکھنے میں یہ جی آتا ہے کہ سیرت کے عمسوں میں جو تقریریں کی جاتی ہیں وہ  
 کسی کیسی حیثیت سے یہ سپر سی اور غیر تاریخی ماکرہاتی میں یہ ممتزج ہوتا ہے کہ ذکر تو کیا سوتا سوتا ہو  
 یہ حریف بہ ہاتھ آتا ہے جس پر پوری سہولت ہے۔

میں نے نہیں سنا کہ کسی نے غیبی و تمہید کا کرمب رکھا جس عنوان سے بھی کہہ دے  
 کہ اس کے بیان میں مسلمانوں کو مثلاً وسط یا یہ ہے اس سے قاتل و حدیث  
 نہ تیار اور نہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 نہ تیار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 میں نے سنا ہے کہ اس میں سب سے پہلے جو کچھ ہے اس کی قومیوں کی زندگی اور نفس  
 پر اثر ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 جو کچھ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 اس سے پہلے کہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو

اس سلسلہ کا مقصد یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے کہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 نہ تیار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 میں نے سنا ہے کہ اس میں سب سے پہلے جو کچھ ہے اس کی قومیوں کی زندگی اور نفس  
 پر اثر ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 جو کچھ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو  
 اس سے پہلے کہ اس کی تائید و تمہید اور نہ ہی اس کی مذمت میں زندگیوں کی راتنی میں ہم کو

# عربی کی ایک قلمی کتاب سے

## تاریخ ہند پر نئی روشنی

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۴)

ابو صفاء عمر بن اسحاق شیلی نے کہا کہ میں نے ایک قریب البلوغ اور کارگزار غلام چار درہم (تقریباً دو روپے) میں خریدا، اسی سے غلاموں کی ارزانی کا اندازہ کر لیجئے، شیلی نے کہا: غلاموں کی ارزانی کے باوجود ایسی ہندی کینز بھی ہوتی ہیں جن کی قیمت میں سزاہ تکے، دس دس ہسز (روپے) در اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بن تاج حافظ نے بھی یہی بات کہی۔ میں نے پوچھا کہ اس قدر ارزانی کے باوجود کینزوں کی قیمت اتنی زیادہ کیوں ہے تو سب ریوں نے باتفاق کہا کہ اس کی وجہ ان کا شعوری، مصنوعی حسن ہے۔ اس نوع کی کہ کینز حافظ قرن موتی ہیں، مکھن جانتی ہیں، شعر اور تاریخ سناہ ہیں، کاتے در ستار بج نے میں، ماہر ہوتی ہیں، شطرنج اور چومر (نرد) کھیلتی ہیں۔ اس صنف کی کینز فخر مباحات میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی ہیں، کوئی کہتی ہے: میں تو نین دن میں اپنے آقا کا دل موہ دیتی ہوں؛ دوسری کہتی ہے: میں ایک ہی دن میں اس کے دل کو مہک بن جاتی ہوں۔ "تیسری کہتی ہے: میں ایک ہی گھنٹہ میں اس کے دل پر فتح دیتی ہوں؛ چوتھی کہتی ہے: ان دنوں گھنٹے کا، یہ جادو کو کچھ جھپٹتے جیتا ہے، میرے ریوں نے باتفاق کہا۔

ہند کی حسینائیں ترکی اور قباچ کی عورتوں سے زیادہ دل کش ہوتی ہیں ، ان کی عمدہ تعلیم و تربیت اور ہنر دانی اس پر مستزاد ۔ ان کا رنگ بیشتر سنہرا یا چمپی ہوتا ہے ، لیکن گوری اور گل قام عورتوں کی بھی کمی نہیں ۔ ہندوستان میں ترکی ، قباچ ، رومی اور ہر نسل و قوم کی عورتیں موجود ہیں پر ترجیح ”بلاچ ہندی“ ہی کو دی جاتی ہے ، ان کی دل آویزی عداوت اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے جن کے اظہار سے الفاظ قاصر ہیں ۔

سراج الدین عمر شبلی نے مجھ سے کہا :- اس ممکت میں رزس اور اسکندریہ سے در آمد کئے اسی کے کپڑے نہیں پہنے جاتے بلکہ یہ کہ سلطان کی طرف سے کسی کو پہنائے جاتے ہیں ۔ عام طور سے (خوش حال) لوگ اعلیٰ قسم کی روئی کے کپڑے پہنتے ہیں ، روئی کے سوت سے بغداد کے چھوٹے کوٹ سے ملتی جلتی قمیصیں بنائی جاتی ہیں ، لیکن بغداد کے کوٹوں یا نصانی (؟) کا ہندی قمیصوں سے کیا مقابلہ ! ہندی سوتی کپڑا اس سے کہیں بڑھیا اور دیدہ زیب ہوتا ہے ۔ اس کی کچھ قسمیں عمدگی میں نواسا (؟) کے ہم مرتبہ ہوتی ہیں اور خوب گفت اور آب دار ۔

شیخ مبارک نے مجھ سے بیان کیا :- بس وہ لوگ غلاف چڑھی یا زیور سے آراستہ زینوں پر بیٹھتے ہیں جن کو سلطان اس قسم کا انعام عطا کرتا ہے ۔ انہیں پانے والے کو اب اس بات کی رخصت ہوتی ہے کہ زین کو غلاف یا زیور سے مزین کرے ۔ عام طور پر غلاف چڑھی زینوں پر چاندی کا کام ہوتا ہے یا چاندی کے زیور سے ان کو آراستہ کیا جاتا ہے ۔ شیخ مبارک نے کہا :- سلطان سکاری منصب داروں کو خواہ وہ اہل سیف ہوں ، خواہ اہل قلم ، خواہ اہل علم ، اعلیٰ قسم کا سامان ، چاندی ، مال ، دوست ، جواہرات ، گھوڑے ، زرکار زمینیں ، زرکار



بچے اور قسم قسم کے کپڑے عنایت کرتا ہے، اس کے انعام کی فہرست سے  
 صرف ہاتھی مستثنیٰ ہیں، ہاتھی رکھنا صرف شاہی حق ہے اور اس میں کوئی دوسرا  
 اس کے ساتھ شریک نہیں ہوتا۔ ہاتھی کے کھانے چارہ کے لئے سرکار سے کئی قسم  
 کے راتب مقرر ہیں، سلطان کے تین ہزار ہاتھیوں کے خرچ کے لئے شاید ایک بڑی  
 حکومت کی آمدنی درکار ہوتی ہو۔ میں نے (مؤلف) نے شیخ مبارک سے پوچھا کہ  
 شاہی ہاتھیوں پر کیا خرچ آتا ہے تو انھوں نے کہا: ہاتھی مختلف قسم کے ہوتے  
 ہیں اور اس کے مطابق ان کا کھانا چارہ ہوتا ہے۔ میں ہاتھی کی زیادہ سے زیادہ  
 اور کم سے کم غذا بتاتا ہوں۔ ایک ہاتھی کے لئے ہر دن زیادہ سے زیادہ بیس سیر  
 چادل، تیس سیر جو، بیس سیر گھی اور آدھی گٹھری گھاس درکار ہے۔ ہادوتوں اور  
 دیکھ بھال کرنے والوں کا مشاہرہ بھی بہت ہوتا ہے اور کئی قسم کا۔ شیخ مبارک  
 نے کہا: ہاتھیوں کا داروغہ اکابر سلطنت میں سے ایک ممتاز آدمی ہے جس  
 کی جائداد بقول شبلی عراق جیسے بڑے ملک کے برابر ہے۔ سلاطین ہند میدان  
 جنگ میں اس فوجی ترتیب سے کھڑے ہوتے ہیں: قلب لشکر میں بادشاہ  
 ہوتا ہے اور اس کے ارد گرد امراء و علماء آگے پیچھے تیر انداز، میمنہ و میسرور  
 دور تک پھیلے ہوتے اور ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے  
 سامنے ہاتھی لشکر ہوتا ہے، ہاتھی آہنی تاروں کی جھولیں پہنے ہوتے ہیں اور ان  
 پر کیوں سے جڑے برجوں میں سوراخ برہمان ہوتے ہیں، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان  
 کیا۔ برجوں میں تیر پھینکنے کے سوراخ اور جھرد کے ہوتے ہیں جن سے جلتے پیردل  
 کی بولیں پھینکی جاتی ہیں۔ ہاتھیوں کے سامنے پیادہ غلام، تلواروں اور ہتھیاروں  
 سے مسلح دشمن کے سواروں پر تلوار کے دار کر کے ہاتھیوں کے لئے راست کھولتے  
 ہیں اور عقب میں تیر انداز برجوں سے تیر پھینک کر دشمن کے سواروں کو بھگاتے

ہیں، اور میدان اور میسرہ کے سوار دور دور تک چاروں طرف سے دشمن کو گھیر لیتے ہیں، اور ہاتھیوں کے پیچھے اور آس پاس لڑتے ہیں، ان تدابیر سے نہ تو دشمن کے رسولوں کو غارت گری کا موقع ملتا ہے اور نہ فوج کے اندر گھسنے کا، اور اگر دشمن کا کوئی سپاہی فوج میں گھس بھی آئے تو مشکل ہی سے زندہ بچتا ہے کیوں کہ سلطان کی ہر طرف سے گھیرا ڈالی فوجیں محتاط رہتی ہیں۔ اوپر سے تیر اور آگ کی بارش ہوتی ہے اور نیچے سے پیدل فوج موقع پاتے ہی اچانک وار کرتی ہے، اس طرح موت اور تباہی دشمن کا ہر طرف سے محاصرہ کئے رہتی ہے۔

ہند کے اس سلطان کو جو فتوحات اور کامبیاں حاصل ہوئیں اور جس پیمانہ پر اس نے نئے نئے علاقے فتح کئے، اور جس طرح اس نے کافروں کے مرکزوں کو ٹھہرا، اور جادو گردوں کا جادو توڑا، اور بتوں اور مجسموں کی پوجا کے حق میں اہل ہند کی دیلوں کو جس طرح باطل کیا، ان سب امور میں ہند کا کوئی دوسرا مستم ج دار اس کا ہم سر نہیں۔ بجز ہند کے دور افتادہ گوشوں میں ہٹا ہٹکا، ایسے جزیرے رہ گئے ہیں جہاں اس کی حکومت نہیں ہے اور جن کی اس کو خبر بھی نہیں، اگر خبر ہوتی تو وہ ان کو بھی مسخر کر لیتا۔ ہند کی مجلسیں اس کے ذکر کی بہترین خوشبو سے مہک اٹھی ہیں۔ "تَحْتَ رَمَادُ بِلَافِ بَاغِي فَدِي مَتِ جَوَاهِرُهَا" (۱) وہ آج سلطانِ ہند ہے اس لفظ کا طلاق کسی اور پر نہیں ہوتا، اور یہ معزز نام اس کے سوا کسی اور کو راست نہیں آتا۔ شبلی نے کہا: مناسب ہے کہ مسلمان اس سلطان کے حق میں اس کے شوقِ جہاد کے لئے خدا سے دعا، خیر کریں۔ یہ ہیں اس کے احسانات اور یہ ہیں اس کی خصلتیں۔

محمد خمندی نے مجھ سے بیان کیا: یہ سلطان ہر ہفتہ بدھ کے دن ایک مجلس منعقد کرتا ہے جس میں عام لوگ جمع ہوتے ہیں۔ سلطان ایک بہت بڑے

میدان میں بیٹھتا ہے جہاں اس کے لئے ایک بڑا چتر لگایا جاتا ہے، اس کے نیچے ممتاز جگہ پر ایک ادبجے تخت پر سلطان بیٹھتا ہے جس پر سونے کے پتر چڑھے ہوتے ہیں اور جواہرات جڑے ہوتے ہیں۔ اربابِ دولت دائیں بائیں صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں، پیچھے سلاحداریہ اور خجہ داریہ ذمہ دار حکم بین اُداب (الاشغاف) (۱) سے حکم (۲) اور دوسرے عہدے دار اپنے حسبِ مرتبہ جگہوں پر ہوتے ہیں۔ سلطان کے سامنے عدتِ خن، (۵/۲۲) صدر بہاں اور سکریٹری بیٹھتے ہیں، صاحبِ کھڑے ہوتے ہیں۔ عام منادی کرا دی جاتی ہے کہ اگر کسی کو کوئی شکایت یا ضرورت پیش کرنا ہو تو لائے، جب کوئی آتا ہے یا بادشاہ کے حضور کھڑا ہوتا ہے تو اس کو نہ تو مارا جاتا ہے اور نہ اپنی عرضداشت پیش کرنے سے اس کو رد کیا جاتا ہے۔ وہ (آزادی سے) اپنی شکایت بادشاہ کے سامنے رکھتا ہے اور بادشاہ جو مناسب ہوتا ہے حکم دیتا ہے۔ (ہفتہ کے) باقی دنوں میں اس کی مجلسِ بیعِ شام منعقد ہوتی ہے جس میں خن، ملک اور امیر حاضر ہوتے ہیں۔ سلطان سے آدابِ مجلس میں ایک بات یہ ہے کہ کوئی شخص بڑا ہتیار تو کیا چوٹی چھری تک لے کر اس کے پاس نہیں آ سکتا، اور ہر آنے والے کو سلطان کے پاس جانے سے پہلے غور سے دیکھا بھالا جاتا ہے۔ سلطان کی مجلس سات دروازے پر ہے اور پہلے دروازہ پر ایک شخص مامور ہوتا ہے جس کے پاس بگڑ ہوتا ہے۔ جب کوئی خان یا ملک یا بڑا آدمی آتا ہے تو وہ شخص بگڑ بجاتا ہے تاکہ سدان کو معلوم ہو جائے کہ کوئی بڑی ہنسی آ رہی ہے اور وہ ہر طرح چوکنا در تیار رہے۔ بابِ عالی پر آنے والا خواہ کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو پہلے دروازہ سے پیادہ ہو جاتا ہے اور ساتوں دروازے پیدل چل کر سلطان کی خدمت میں



حاضر ہوتا ہے، ہاں محدودے چند لوگوں کو سلطان کی طرف سے رخصت ہوتی ہے کہ چھ دروازے تک سوار رہیں۔ آنے والا جب دروازے طے کرتا ہے تو اس اشار میں برابر بغل بجاتا رہتا ہے، حتیٰ کہ ساتویں دروازہ کے قریب پہنچتا ہے جہاں سب آنے والے مجتمع ہوتے ہیں۔ جب اذن باریابی پانے والوں کی تعداد پوری ہو جاتی ہے تو ان کو حاضری کی اجازت ملتی ہے۔ داخل ہونے والوں میں جو بیٹھنے کے اہل ہوتے ہیں، وہ سلطان کے آس پاس بیٹھ جاتے ہیں اور جو اہل نہیں ہوتے وہ کھڑے رہتے ہیں۔ تاحضیٰ، وزیر اور سکریٹری بیٹھتے ہیں، آخر الذکر ایسی جگہ بیٹھتے ہیں جہاں سلطان کی نظر ان پر نہیں پڑتی، سبٹ پھیلا دئے جاتے ہیں، حاجب عرضداشتیں پیش کرتے ہیں، ہر صنف کی درخواست کے لئے الگ حاجب ہوتے ہیں، ساری درخواستیں بڑے حاجب کو دے دی جاتی ہیں، وہ ان کو بادشاہ کے سامنے رکھتا ہے۔ جلسہ برخاست ہونے پر، سلطان، سکریٹری کے پاس بیٹھتا ہے اور وہ درخواستیں اس کے حوالہ کرتا ہے جن پر اس نے حکم لکھے ہوتے ہیں، سکریٹری ان کو نافذ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد سلطان خاص مجلس کرتا ہے اور ان عالموں کو بلاتا ہے جو عادیۃً اس کی خدمت میں رہتے ہیں، وہ عالموں کے ساتھ بیٹھتا ہے اور ان کے ساتھ لطف و یگانگت سے پیش آتا ہے اور گفتگو کرتا ہے۔ یہ علماء اس کے ”معتد خاص“ ہیں۔ تمثیری دیر بعد وہ ان کو لوٹنے کا اذن دیتا ہے اور اب ندیموں اور گولیوں کی محفیں گرم ہوتی ہیں۔ کبھی ندیموں سے مصروف گفتگو ہوتا ہے اور کبھی کوئی گویا اس کو نغمے سناتا ہے، لیکن خلوت ہو یا جلوت وہ کسی حال میں پاکبازی، طہارت اور عفت کا دامن نہیں چھوڑتا، حرکت و سکون ہر حال میں اپنے نفس کا محاسب کرتا ہے، اور خلوت و جلوت دونوں میں خدا پر اس

کی نظر رہتی ہے، نہ خود کسی حرام کا مرتکب ہوتا ہے اور نہ دوسرے کو اس کی رخصت دیتا ہے۔ ریشلی نے مجھ سے کہا: دلی میں بالکل شراب نہیں ہوتی، نہ تو ظاہر نہ چھپا چوری، کیوں کہ شراب کے معاملہ میں یہ شخص (سلطان) خصوصیت کے ساتھ سخت ہے، اور شراب پینے والوں کو بہت ناپسند کرتا ہے، پھر اہل ہند خود بھی شراب سے رغبت نہیں رکھتے اور نہ دوسری نشہ آور چیزوں سے، کیوں کہ انھوں نے پان کو مُشکرات کا نعم البدل بنا لیا ہے، جو حلال اور پاک ہے جس میں کوئی آلودگی یا ضرر نہیں، بلکہ اس میں ایسی خوبیاں ہیں جو شراب میں مفقود ہیں، مثلاً یہ کہ وہ منہ کی بو کو خوشبو میں بدل دیتا ہے، کھانا ہضم کرتا ہے، اور روت میں خاص نفاذ و سرور پیدا کرتا ہے، بوش و خواں قائم رکھتا ہے، ذہن کو صاف کرتا ہے اور مزے دار ہوتا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی تین ہوتے ہیں:- پان کا پتہ، چھالہ اور چونا جو خاص طریقہ پر بنایا جاتا ہے۔ ریشلی نے کہا:- اہل ہند کے نزدیک پان سے زیادہ پُر اعزاز جہاں نوازی کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں اگر کوئی شخص کسی کو جہان بنائے اور مختلف کھانوں، شربتوں، حلویوں اور بھولوں سے اس کی خاطر مدارات کرے، لیکن پان نہ دے تو گویا اس نے جہاں نوازی کا حق ادا نہیں کیا اور جہان کی یوری قدر و منزلت نہیں کی اسی طرح اگر کوئی بُرا آدمی کسی طلاق کی خاطر مدارات کرتا جائے تو اس کو پان پیش کرتا ہے۔

علامہ سراج الدین ابو صفاء ریشلی نے مجھ سے بیان کیا:- اس سلطان کو اپنی سلطنت، اپنے لشکر اور رعایا کے حالات معلوم کرنے کا خاص خیال رہتا ہے، اس کا ایک ادارہ ہے جس کے مشورے کو مہتمی کہتے ہیں۔ انہیں کے کسی گریڈ یا طبقے میں، ان میں سے بعض کو تعلق سدا اور عوام سے ہے، کئی

کو جب کوئی ایسی بات معلوم ہوتی ہے، جس کی خبر بادشاہ کو ہونا چاہیے تو وہ اپنے سے اوپر افسر کو رپورٹ بھیجتا ہے، وہ اپنے سے اوپر کو حتیٰ کہ رپورٹ سلطان تک پہنچ جاتی ہے، دور دراز صوبوں سے خبریں بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ایسی ڈاک چوکیاں ہیں جیسی مصر و شام میں پائی جاتی ہیں، لیکن یہاں زیادہ نزدیک ہوتی ہیں، تیر کی چوگنی مسافت پر روز پر یا اس سے کم، ہر چوکی پر دس ڈاک بردار ہوتے ہیں، ان میں سے جس کی باری ہوتی ہے وہ ڈاک لے کر اپنے سے اگلے کے پاس امکان بھرتیزی سے بھاگتا ہے، اور اگلی چوکی کے ڈاک بردار کو دیتا ہے، اب یہ بھاگ کر اپنے سے اگلے ڈاک بردار کے حوالہ کرتا ہے، ڈاک ربنے کے بعد ہر شخص عادی چال سے اپنی اپنی چوکی کو لوٹ آتا ہے، اس طرح ڈاک دور ترین جگہوں پر کم سے کم وقت میں پہنچ جاتی ہے، ڈاک گھوڑوں سے زیادہ جلد۔ ہر ڈاک چوکی پر مسجدیں ہیں جہاں نماز با جماعت ہوتی ہے، مسافر ٹھہرتے ہیں، پینے کے لئے پانی کے تالاب اور کھانا چارہ کے لئے بازار ہیں، اس لئے کسی مسافر کو اپنے ساتھ زادِ راہ اور خیمہ ڈیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سلطان کے اہتمام جہانداری میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے سلطنت کی دونوں راج دہانیوں۔ دہلی اور دیوگیر کے درمیان ڈاک چوکیوں میں ڈھول کے ذریعہ خبر رسانی کا انتظام کیا ہے۔ جہاں کہیں کوئی شہر فتح ہوتا ہے یا کسی قلعہ کا محاصرہ اٹھتا ہے یا کوئی قلعہ حصار بند ہوتا ہے (۱) تو ڈھول بجا دیتا ہے، جب کئی چوکی پر اس کی آواز پہنچتی ہے، تو وہیں بھی ڈھول بجاتا ہے، اس طرح سلطان کو جو موقع جنگ سے دور ہوتا ہے شہر کے

۱۔ معصبات امینہ میں تیرہ کم، ۱۰ فٹ پر روز چار سو ذراع یعنی قریب ۲۶۶ گز بتائی ہے، اس حساب سے دو ڈاک چوکیوں کا درمیانی فاصلہ لگ بھگ ساڑھے دس سو (۱۰۵۰) گز ہوا۔

مِصْلِحُ الْمُنِير، ذکر میل ص ۳۵۱



فتح ہونے یا قلعہ کے حصار بند ہونے کی خبر ہو جاتی ہے، آج کل ایسی خبریں  
 بردن اس کو معمول ہوتی ہیں (۹) اس سلطان کے وقار اور دھاک کو دیکھ  
 کر دل ٹپکتے ہیں حالاں کہ وہ لوگوں سے قریب رہتا ہے اور نرمی سے بات کرتا ہے۔  
 اگر کوئی اس سے ملنا چاہے تو بار یاب ہوتا ہے، اس کے حاجب (داروغہ در)  
 خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے ملاقات میں روڑے نہیں اٹکاتے، خدا نے اس کے  
 عہد حکومت میں ہر قسم کے رزق کی ریلیں پس کی ہے اور اپنی نعمتیں دگنی چوگنی  
 کر دی ہیں، اگرچہ ہند ہر زمانہ میں خوش حالی اور داد و دہش کے لئے مشہور  
 رہا ہے۔

مُجَنّدی نے مجھ سے بیان کیا: میں نے اور میرے تین ساتھیوں نے دہلی  
 کے ایک گاؤں میں پیٹ بھر کر گائے کا گوشت، روٹی اور گھی ایک پھیل چار  
 پیسے) میں کھایا۔ میں عنقریب اہل ہند کے سکے بیان کروں گا، اس کے بعد  
 مُجَنّدی نے ہند کے بھاء بتائے جو سکوں کے ذریعہ مقرر ہوتے ہیں اور جن  
 کے ذریعہ نرخوں کا علم ہوتا ہے۔

شیخ مبارک نے مجھ سے کہا:- لَکَ اُتْمَر کے معنی ہیں سونے کے ایک  
 لاکھ تنکے (مسائل میں - لَکَ اُتْمِیض کے معنی ہیں سونے کے ایک لاکھ تنکے)  
 ہند کے لوگ تَنْدَہ، لُحْمَاء کو تنکہ سُرخ کہتے ہیں اور اس کی قیمت تین مثقال  
 (سونے) کے برابر ہے۔ چاندی کا تنکہ ٹھنی (ہشتکائی) کے برابر ہوتا ہے یہ ٹھنی  
 تحت در وزن میں چاندی کے س درہم کے مساوی ہے جو مصر و شام میں رائج  
 ہے، اور جس کی قیمت دونوں سکوں میں یکساں ہے۔ اُٹْمِی چار سُلطانیوں کے  
 برابر ہوتی ہے، سُلطانی کو دَوّ اُتی کہتے ہیں، سُلطانی، چھ اُتی کا تہائی ہوتی ہے،  
 چھ اُتی تیسرا سکہ ہے جس سے ہند میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ سُلطانی

اٹھنی کی چوتھائی ہوتی ہے، اُس کے آدھے کو اِکّنی کہتے ہیں، اِکّنی اور جتیل قیمت میں برابر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سِکّہ بارہ اُتی ہوتا ہے، اٹھنی کا ڈیوڑھا۔ اور ایک اور سِکّہ سولہ اُتی ہوتا ہے، دو اٹھنیوں کے برابر۔ اس طرح ہند میں کل چھ سکے رائج ہیں :- سولہ اُتی - (شازدگانی، مسالک - شازدگانی) بارہ اُتی (دوازدگانی - مسالک - دوازدیدگانی) اٹھنی (ہشتگانی - مسالک - ہشتگانی) چھ اُتی (ششتگانی) دو اُتی (سلطانی) اِکّنی (یکانی) سب میں چھوٹا اِکّنی ہے (مسالک - سب سے چھوٹا دو اُتی ہے) ان تمام سکوں کے ذریعہ (مسالک - ان تینوں سکوں سے) لین دین اور تجارت ہوتی ہے، لیکن دو اُتی زیادہ چلتی ہے، دو اُتی کی قیمت مقرر و شام کے تقری درہم کے چوتھائی کے برابر ہے۔ سلطانی (دو اُتی) میں آٹھ پیسے ہوتے ہیں یعنی دو جتیل، جتیل چار پیسے کا ہوتا ہے۔ اس طرح اٹھنی میں جو مقرر و شام کے چاندی کے درہم کے برابر ہے بتیس پیسے ہوتے۔ (باقی)

اُردو کے عظیم المرتبت شاعر میر محمد تقی میر کے اچھے قلم سے لکھے ہوئے دلچسپ، عبرت نگیز، اور حیرت آمیز واقعات

## میر کی آپ بیتی

میں ملاحظہ فرمائیے۔

اسے معروف نقاد شاعر احمد نوری نے اصل فارسی کتب سے ترجمہ کیا ہے اور جا بجا ضروری محوّمات حواشی میں لکھ دی ہیں۔

ترجمہ، بیف کے حسن کا اعتراف تمام نقاد علمی جریدوں اور عالموں نے کیا ہے۔

طباعت اعلیٰ - کتب عمده - کاغذ نفیس - گٹ اپ شان دار - مکتبہ برہان دہلی سے ۲/۸ میں طلب کیے

## ایرج مرزا اور اس کی شاعری پر ایک نظر

(جناب ڈاکٹر قاضی محمد ابراہیم صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ اسلامیہ کالج جوگیشوری)

قاری ادب کو جن شعرا پر تازہ ہے ان میں ایرج مرزا کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ایرج مرزا کی زندگی کا دور ایران کی تاریخ میں نہایت اہم ہے اس زمانے میں ایران مغرب کے اثر پذیر ہو رہا تھا جمہوریت اور آزادی کی صدا میں اس ملک کے گوشے گوشے میں سنائی دے رہی تھیں اہل ایران میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔ شاہان وقت کے خلاف نعرے عام تھے قاجار خاندان کا چراغ ٹھٹھا رہا تھا اس بیداری کو ادیبوں اور شاعروں نے ہوا دے کر اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ اسی زمانہ میں ایرج مرزا نے جنم لیا۔

ایرج مرزا ایران کے شاہی خاندان سے متعلق تھا زمانے کے حالات کے اعتبار سے قاجار خاندان ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایران زمانہ دراز سے جنگ کا میدان بن چکا تھا۔ ہزاروں لڑائیوں اس عظیم الشان ملک میں لڑی گئیں۔ کسی خاندان پر باد ہوئے اور کسی پر سرنڈار آئے۔ بیکانہ لڑائیوں میں جمہوریت اور آزادی کی بونہ تھی۔ کسی نے آزادی کے نعرے نہیں سکائے۔ یہ لڑائیاں تخت و تاج حاصل کرنے کے مقصد سے لڑی گئیں کسی نے تلوار اُٹھائی تو تاج کی حفاظت کے لئے کسی کا سر تر تیغ ہوا تو تخت و تاج کے تحفظ کے لئے۔ تخت و تاج ہی کے لئے جاں بازوں نے جاں شادوں نے اور بڑے بڑے سوراخوں نے اپنی جانیں کھ کر اپنی جاں بازی ایرجوں مردی کا ثبوت دیا اس وقت کسی نے آزادی و جمہوریت کے لئے آواز بلند نہیں کی۔ سہراب رستم کا یہ مایہ ناز ملک آزادی و جمہوریت سے ہنوز نا آشنا تھا۔ شاید آشتی قاجاریوں کے نصیب میں تھی۔

ایرج مرزا کا پورا نام شاہزادہ ایرج رزاجعلی ملک بن غلام حسین مرزا بن سب ایرج بن فتح علی شاہ قاجار تھا اس کی ولادت رمضان ۱۲۹۱ھ میں تبریز میں ہوئی جیب کہ خندہ ایرج۔ ایرج مرزا کے



دیوان کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں :

”شاہزادہ ایرج مرزا ..... در ماہ رمضان ۱۲۹۵ ہجری قمری در تبریز متولد شدہ“

تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ایرج مرزا کی ولادت کے متعلق یہی لکھا ہے۔ دراصل اس قسم کی معلومات میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے۔ ایرج مرزا کو وفات پانچے زیادہ عرصہ نہیں گزرا اگر پیدائش کی ٹھیک تاریخ کا بھی سراغ لگتا تو زیادہ مفید ہوتا تاہم ریسرچ کے طلبہ کے لئے یہ چیز قابل تحقیق ہے۔ چونکہ شاہی خاندان میں پیدا ہوا تھا اس لئے اس کی تربیت بھی شاہانہ طریقہ پر ہوئی جیسا کہ اس کے اپنے ذیل کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔ ان اشعار میں ایرج ان خادموں کا ذکر کرتا ہے جن کی گود میں اس کی پرورش ہوئی :

من آن ساعت کہ از مادر بزرادم	بدم ہر دو چنگ مر فدام
مرا گشتند ہر دو مر دو خادم	بنوبت روز و شب بر من ملازم
یکی ملایکی لالای من شد	سر زانوئے این دو جای من شد
بمن گفتند کیس لالا و ما	کہن خدمت گذارانند بر ما
نیاکان ترا ہم این دو بودند	کہ روز و شب پرستاری نمودند
تو ہم از این دو یابی پرورشہا	خوری از سفر اینان خورشہا

جوں ہی ایرج نے ہوش سنبھالا اس کے سرپرستوں نے اس کی تعلیم کی طرف توجہ دی اور بہتر سے بہتر اساتذہ کا اس کی تعلیم کے لئے تقرر کیا چنانچہ ان اساتذہ میں آقا محمد تقی (عارف اصفہانی) اور مرزا نصر اللہ (بہار شیروانی) کے نام خاص قابل ذکر ہیں جسے ایرج اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے :

”ایرج مرزا بادیو دسترس در خدمت دو استاد بزرگ آقا محمد تقی (عارف اصفہانی) و مرزا نصر اللہ (بہار شیروانی) تلمذ کردہ تھے۔“

فسوس اس بات کا ہے کہ تذکرہ نگاروں نے یہ نہیں بتایا کہ ایرج مرزا نے ان اساتذہ سے کیا سیکھا لیکن

۱۔ دیوان ایرج مرزا ص ۸ ۲۔ ایضاً ص ۸ ۳۔ ایضاً ص ۲

زمانہ کے رواج کے مطابق یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ابتدا میں فارسی اور ہندسہ کی تعلیم پائی، انیسویں صدی جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ایران کی تاریخ میں انقلاب خیر ثابت ہوئی۔ اسی صدی میں ایران مغرب سے زیادہ متاثر ہوتا شروع ہوا اور یہی وہ زمانہ ہے جب کہ فارسی دبے کر وٹ لی اس میں بھی ایک انقلاب دیا ہوا یہ انقلاب نہ اس انقلاب تھا اس کی نوعیت ایک خاص نوعیت تھی اسی زمانے میں فارسی کے علم بردار اس کے نکتے پر مبنی دالے صاحب قلم اس کے ادیب و شاعر دل و درختوں نے ایک نئی تحریک جاری کر کے فارسی کو عربی و عربی الاصل لفاظ سے پاک کرنا شروع کیا یہی نہیں بلکہ ان کی جگہ مغربی زبانوں کے لفاظ کو استعمال کرنا شروع کیا خصوصاً ان ترقی پسندوں نے فرانسیسی لفاظ زیادہ استعمال کئے اس دینی انقلاب کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ اہل ایران نے فرانسیسی زبان کو اپنے ملک میں دسی تبہ بخشا جو ہندوستان میں انگریزی کو حاصل تھا۔ لہذا تعلیم یافتہ شخص اس زبان سے روشناس ہونا پابا غٹ فخر سمجھتا تھا۔ ایرج مرزا بھی اسی ملک کا باشندہ تھا۔ اس نے بھی اس زبان پر عبور حاصل کیا جس کا اندازہ اس کے کلام سے بخوبی لگ سکتا ہے اس ضمن میں اس کی ایک نظم بہت مشہور ہے جس کے متعلق ڈاکٹر ایچ سحاق صاحب یوں لکھتے ہیں :

”دریں بیت خود را مقید کرہ است کہ کلمات فرانسوی در شعر استعمال کند“

ایرج کے یہ شعر حسب ذیل ہیں :

بسند در یور و جنگام      در سہ کردم کار تن      قرۃ  
بسکہ فت و ادم و انکت کردم      اشتباہ برزت دنت      کردم

اس نظم کے فرانسیسی الفاظ یہ ہیں :

(۱)	سور	Lure	بمعنی زمیں	(۶)	شمیز	Chamere
(۲)	تہ	Lute	تہ تابستان	(۸)	پاراف	Paraph
(۳)	دوسید	Desside	” فکل	(۹)	یورد	Berrou
(۴)	پونتر	Pontr	پیس	(۱۰)	آمور	Amour
(۵)	قرۃ	Quate	نوم	(۱۱)	نوم	Amu
(۶)	نت	Note	نوم	(۱۲)	نوم	Zero

سوزن آوردم و سنجاق زدم      پوتر و پنس باوراق زدم  
 ہی نشستم بمناعت پس مینر      ہی تیاندم دوسیه لائی شمیر  
 ہی پاراف ہشتم و امضا کردم      خاطر مدعی ارضا کردم  
 گاہ با رنگ و زمانی باہو      پیشخدمت طلبیدم بہ پورو  
 تو بمیری ز امور انعام      از شر و شور و شور افتادم  
 حکم زانہد شیفر و نومرد      نیست در دست مرا غیر زرد  
 ہی بدہ کار تن و بستان دوسہ      ہی بیار از در دکان نسہ

ابنہذا ایرج مرزانے دوران تعلیم میں اس زبان کو بھی سیکھا۔ خسرو ایرج کی ذیل کی تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرج مرزانے فرانسیسی زبان اور علوم متداولہ کو تہذیب کے مشہور مدرسہ میں حاصل کیا یہ مدرسہ دارالفنون تبریز کے نام سے مشہور ہے۔ ابنہذا ایرج مرزانے منطق اور بیان کے درس بھی پڑھے چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں :

”در ہنگام رشد برای تکمیل زبان فرانسہ در سایر علوم متداولہ بمدرسہ دارالفنون تبریز وارد شدہ و تابع

از مدرسہ در حورۃ درس شتہینہای برای تفصیل منطق و معانی و بیان حاضر می شد۔“

تخصیص علم کے اسی دور میں ایرج مرزا کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔ صغریٰ سن میں جب کہ وہ سوہ سال کا تھا اس کے کمزور کندھوں پر زندگی زدن کا بوجھ رکھ دیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس کے والد کا انتقال ہوا جس کی وجہ سے اس کی ذمہ داریوں میں در بھی اضافہ ہو گیا۔ سب سے بڑی چیز جو ایرج مرزا کی پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی وہ خانوادہ کی پرورش و تلاش معاش کی نگرانی جس کی وجہ سے اسے اپنے اصولوں کی قربانی بھی دینی پڑی۔ شروع ہی سے ایرج نے تربیت پسند طبیعت پائی تھی وہ ملازمت کو ملوث زندگی سمجھتا تھا جہاں آدمی کو اپنی خودی کھودینا پڑتی ہے اور اپنے آقا کی بے جا خدمت کرنا عین ذرغ سمجھا جاتا ہے زندگی کے اس موڑ پر اگر ایرج نے ان تمام چیزوں پر غور کیا۔ اس کے سامنے دو چیزیں تھیں ایک طرف کنبہ کی ذمہ داریاں اسے تلاش معاش پر مجبور کر رہی تھیں اور دوسری طرف اس کا



خودی اسے روک رہی تھی کہ وہ خودی کو نہ نیچے زندگی کی کشمکش میں جیت کسی ایک کی ہوتی ہے  
ایرج مرزا نے بادل تاخواست ملازمت کہ طوق گلے میں پہن لیا۔ اس کے بیشتر اشعار سے معلوم ہوتا  
ہے کہ وہ ملازمت اور غلامی سے سخت متنفر تھا لیکن نہ جائے، ندن نہ پائے رفتن چنانچہ اس کے ذیل  
کے اشعار سے اس کی نفرت کا پتہ چلتا ہے جہاں قدم قدم پر خوشامد کرنی پڑتی ہے :

گاہ حاکم شدن و گاہ دبیر      گاہ مذہم شد و گاہ یارِ دزیر  
با سفر ہای پیانی کردن      تاقتِ راحتِ خود پی کردن  
گرد سرداری سلطان رفتن      بد قربان بد قربان گفتن  
گفتن اینکه ملک ظل خداست      سینہ اش آئینہ غیب نماست

ایرج نے ۱۳۲۴ء میں جب کہ اس کی عمر ۲۴ سال کی تھی ملازمت اختیار کی اور اس طرح زندگی  
کے اگستے دور میں اس نے قدم رکھا سب سے پہلے ایرج مرزا مظفر الدین شاہ قاجار کی خدمت میں داخل ہوا :

”ایرج مرزا در سن ۱۳۰۹ ہجری قمری در دربار ولیعهد (مظفر الدین شاہ قاجار) راہ یافت“

یہ چیز قابلِ ذکر ہے کہ قاجار خاندان کے سب سے افرادِ علم و ادب کے دل دادہ تھے۔ اس خاندان کے سردارین  
نے اور شاہزادوں نے شعرا اور ادیبوں کی دل سے قدر کی اور انہیں ہمیشہ بہا صلی دے کر ان کی ہمت و ترقی  
کی یہی نہیں بلکہ اس خاندان کے بیشتر افراد صاحبِ تصنیف اور شاعر بھی تھے۔ جیسے کہ ڈاکٹر رضا زاد  
شفق کی ذیل کی تحریر سے واضح ہے یہ تحریر ان کی مشہور و معروف تصنیف ”تاریخ ادبیات ایران“  
سے ماخوذ ہے مصنف موصوف کا بیان ہے کہ فتح علی شاہ قاجار شاعر تھا اور نیز صاحبِ دیوان  
بھی تھا اس کے علاوہ ناصر الدین نے قصائد بھی لکھے اور غزلیں بھی موزوں کی ہیں۔ اسی طرح اس  
خاندان کے شاہزادوں نے بھی قصیدے، غزلیں اور مثنویاں لکھیں۔ فریاد مرزا نے اپنے والد  
عباس مرزا نایب السلطنت کے حالات کو ایک سالہ میں قلم بند کیا ہے۔ یہ شاہزادہ شاعر بھی تھا۔  
عباس مرزا کا بھائی محمد مرزا بھی موش اور بل تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر موصوف کے الفاظ یہ ہیں :  
”بعضی از شاہان و شاہزادان قاجار خود شاعر و مولف بودند چنانکہ فتح علی شاہ دیوان اشعار دارد“

ناصر الدین شاہ قصاید و غزلیات سرودہ۔ عمدہ ای از شاہزادگان قاجار نیز . . . . .  
اشعار سرودہ و قصائد و غزلیات و غزلیات و مثنوی با کفہ اند . . . . .

شاہان قاجار کی اس ادب و دستی کے علاوہ یہ بھی جانتا چاہیئے کہ انھوں نے شعر کو صلوں سے نوازا اور ان کی ہمت افزائی کی۔ نشاط و ور قاجار کا ایک مشہور شاعر تھا۔ ناچا کی نعل کی وجہ سے وہ سخت مقروض ہو گیا جس کی وجہ سے وہ سخت پریشان ہوا۔ فتح علی شاہ کو جب یہ حال معلوم ہوا تب اس نے بقول "صیف باشد دل دانا کہ مشوش شد" تیس ہزار توہین دئے نشاط نے چند اشعار لکھ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ چنانچہ ابراہیم صنائی نے اپنی کتاب "تہذیب ادبی ایران در عصر قاجار" میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے۔  
"شاہ از حال ظاہری نشاط گرفتار رہا اور دریافت و وقتی بقرصنے او واقع شد دستور داد سی ہزار تومان سکوک طلا از خزانہ مخصوص بنام نشاط فرستادند . . . . . در این موقع بود کہ نشاط بہت بلند ادب پروری شاہ فرین خواندہ گفت :

زہ مگر از روی دشمن رنگ بگرفت است دام کاین سراں در پیشگاہ شاہ خوار است اینچنین"  
مظفر الدین شاہ اسی ادب نواز خاندان کا ایک فرد تھا۔ ابتداء ہی سے اسے علم ادب سے دل چسپی تھی یہی نہیں بلکہ مظفر الدین بہت بڑا مرثیہ بھی تھا۔ اس نے ایرج مرزا کی شاعرانہ استعداد کو بھانپ لیا اور اس کی قابلیت کی تعریف کی۔ چنانچہ اس نے ایرج مرزا کو صدر الشعراء کے لقب سے سرفراز کیا۔ ایرج مرزا ایک عرصہ تک شاہ کی خدمت میں رہا مظفر الدین شاہ ایرج سے کافی متاثر تھا۔ لہذا اسے اپنا منشی خاص قرار کیا اور جب حکومت کے کاروبار کے سلسلے میں مظفر الدین شاہ طہران ۱۲۱۳ھ میں واپس آیا تب ایرج کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا جب ایرج مرزا نے اپنے وطن سے باہر قدم رکھا۔ سی زانے میں شاہ نے کرمان اور یزد کے منشی کا عہدہ ایرج مرزا کو دیا۔ یہاں یہ نوٹ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں حکومت ایران آخری حکومتوں سے زیادہ ربط پیدا کرنے میں کوشاں تھی اس ضمن میں حکومت ایران نے ایک خاص پالیسی اختیار کی۔ حکومت ایران نے مغربی تعلیم

کو اپنے ملک میں علم کرنا ضروری سمجھا تا کہ ملک کی سیاسی اور اقتصادی حالت بہتر سے بہتر بن سکے۔ کچھ حد تک یہ پالیسی مفید ثابت ہوئی۔ اس پالیسی کے تحت ایران نے کئی لوگوں کو انگلستان، فرانس اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھیجا شروع کیا۔ ۱۸۵۸ء میں شاہ ایران نے ۲۲ طلبہ کو تحصیل علم کے لئے فرانس بھیجا۔ حکومت کے دیگر افراد نے بھی یورپ کا سفر کیا۔ مظفر الدین شاہ کا یورپ کا سفر بین کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ شاہ کے علاوہ جن لوگوں نے یورپ کا سفر کیا ان میں مرزا احمد خان قوام السلطنت بھی تھا۔ اسی کی ہمراہی میں ایرج مرزا نے بھی یورپ کا سفر کیا۔ یورپ سے واپس لوٹنے کے بعد حکومت کا ایک نیا شعبہ ایرج کے ذمہ کر دیا گیا یہ تجارت کا شعبہ تھا۔ ۱۳۱۸ء میں ایرج مرزا آذربائیجان سے جہاں وہ مہدہ مذکور پر فائز تھا نظام السلطنت کی معیت میں طہران آیا۔ تذکرہ نگاروں نے اس کی وجہ نہیں لکھی۔ دوسرے سال ایرج خمدانہ ہوا۔ اس نے طہران کیباں چھوڑا تھم کیوں کیا عدم معلومات کی وجہ سے ان کے جوابات نہیں ملتے۔ تاہم ایرج کی سوانح لکھتے وقت سی معلومات بھی غنیمت ہے کہ ۱۳۱۸ء میں وہ طہران میں تھا اور ۱۳۱۹ء میں وہ خمدانہ ہوا۔

دوران ملازمت میں ایرج مرزا نے حکومت کے مختلف شعبوں میں اپنی خدمتیں انجام دیں۔ ۱۳۱۹ء میں اس کی ملازمت میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ حکومت کی مشنری میں کسٹمس کا محکمہ بہت اہم مانا جاتا ہے۔ ایرج کی قابلیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت ایران نے اس محکمہ کی خدمات ایرج کے سپرد کیں۔ بقول شمس ایرج بیجم کے چند افراد کی سفارش سے ایرج کا تقرر ہوا۔ اس محکمہ میں اس نے چند سال کام کیا اس دوران میں اسے کرمان شاہ اور کردستان بھی جانا پڑا۔ اس وقت کوئلہ کی قلت کا یہاں پر ڈالے چنانچہ اس نے شاہ ایران کو ایک کثیر رقم بیورو میں دینے میں بھی درخشاں نہیں کیا۔ حتیٰ کہ روس نے ایران کے محکمہ کسٹمس پر بڑی حد تک اپنا قبضہ کر لیا۔ اس کی اس حرکت کو سمجھائے وقت نے بھی محسوس کیا بلکہ شعار لکھ کر حکومت



کی مذمت بھی کی۔ جعفر سیاح کا ایک شعر نوتا سپرد قلم ہے :

منظر ز روسہا ستانید وام      دناں وام افتاد گمرک بدام

دراصل شاہ کو قرض کی ضرورت اس لئے پڑی کہ وہ یورپ جا کر نیا علاج کرانا چاہتا تھا۔

اس نے پہلی بار یعنی سن ۱۸۹۱ء میں روس سے ۵۰۰,۰۰۰ روپے پونڈ قرض لئے اس کے عوض

میں حکومت کی کسٹمز کی کل آمدنی (سوائے فارس اور پرشین گلف) روس کو دینے کا اقرار کیا۔

اسی طرح سن ۱۹۰۲ء میں یعنی ایک ہی سال بعد شاہ نے ۵۰,۰۰۰ روپے قرض لئے۔ ایسی حالت

میں شاہ نے اگر ایرج کا تقرر اس محکمہ میں کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیوں کہ وہ اپنے لوگوں کو

محکمہ میں رکھنا پسند کرتا تھا جن پر اسے پورا بھروسہ ہو اور ایرج مرزا تو اسی خاندان کا ایک فرد

تھا۔ ایرج مرزا اس محکمہ میں چار سال تک خدمت انجام دیتا رہا۔ اس محکمہ میں مقامی لوگوں

کے علاوہ بلجیم کے لوگ بھی خدمت گزار تھے۔ چند وجوہات کی وجہ سے ایرج نے اس ملازمت

کو خیر باد کہا۔ ایرج مرزا کی زندگی میں یہ چیز نمایاں معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ایک سے زیادہ اداروں اور

شعبوں میں کام کیا۔ یہ ادارے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ دوران ملازمت میں

ایرج نے اپنی بیاہت اور قابیلیت کا سکہ حکومت کے بڑے افسروں پر جمایا تھا۔ حکومت ایران

اس کی قابیلیت کا لوہا مان چکی تھی۔ اسی وجہ سے گمرک سے نکلنے کے بعد ضلع الدولہ نے ایرج مرزا

کو محکمہ تعلیم میں نمایاں عہدہ دیا ایرج۔ نے سن ۱۳۰۵ھ تک اس محکمہ میں غلو صفتی اور ذیل جمعی سے کام کیا۔

بقول خسرو: ایرج اس محکمہ سے نکلنے کے بعد ایرج مرزا میر محکمہ گمرک میں داخل ہوا: الغرض ایرج مرزا

نے مختلف شعبوں میں خدمات انجام دی۔ دوران ملازمت میں ایرج مرزا کو ایک جانکاہ اور جگر خور

ساتھ سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۳۱۳ھ میں راجا جوان لڑکا جعفر قلی مرزا اس دنیا سے عل بسا۔ ایرج مرزا

نے ذیل کے اشعار میں اپنے محنت جگر کا موت کا تذکرہ کیا ہے۔ آخری شعر سے تاریخ وفات بھی پتی ہے:

ہر کہ آمد دریں جہاں ناچار      روز از اس جہاں چہ شد و چہ کدا

لے دیوان ایرج مرزا ص ۵      سنہ ایضاً

یک جہاں دگر خدای آراست      کہ بود نام آن جہاں بقا  
 سوی دار بقا رود ہر کس      کہ بیامد دریں سرای فنا  
 پور ایرج نوادہ خاقان      آن سب زادہ فرشتہ بقا  
 من باد صرد او بمن عم بود      نہ من او را نہ او بدید مرا  
 ز بیست پنجاہ داند سال بدہر      چوں دریں خاکداں ندید وفا  
 سوی جنت برفت بادل شاد      تا بماناد جاوداں آنجا

بہر تاریخ فوٹس ایرج گفت

رفت جعفر قلی از این دنیا

دوران ملازمت میں ایرج نے ایک آسودہ زندگی بسر کی۔ چوں کہ شاہی خون رگوں میں تھا اس لئے رہنے سہنے کا طریقہ بھی ایسا ہی تھا جس سے شاہانہ جملک نمایاں ہو چتا تھا اس کا مکان خاص رونق اور جاذبیت کا حامل تھا جس کے فرش بیش بہا قالین سے ڈھکے ہوتے جس کا صحن اس بات کا گواہ تھا کہ یہی معمولی آدمی کا مکان نہیں ہے بلکہ ایک ثروت مند کا ایک صاحب جاہ و مال کا یا ایک شہزادہ کا مکان ہے جس میں ایک اعلیٰ صحن ہی نہیں بلکہ ایک خوبصورت صحن بھی ہے جس کی خوبصورتی کے لئے بہتر سے بہتر غنیمتوں نے خون پسینہ ایک کیا تھا آرٹ کے بہترین نمونے تھے۔ اسی عالی شان اور بادقار کوٹھی میں جو چیزیں رونق بڑھانے والی تھیں ان میں طرح طرح کے موسیقی کے آلات بھی تھے تاکہ لہجہ عیش میں اپنے آقا کو محظونہ کر سکیں۔ چوں کہ بی ذوق اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اس لئے اس نے بے شمار کتابوں کا ذخیرہ فراہم کیا جس سے کسی پڑھنا یا خوبصورت کتب خانہ بن گیا تھا۔ ایرج مرزا خود اس آسودہ زندگی کا اور اس شاندار مکان کا ذکر اپنے ذیل کے اشعار میں کرتا ہے :

ہم اسباب عیش آمادہ خانہ عالی و صحن خانہ گزین

فرشہا داشتہ ہمہ زرتار      مہلبا داشتہ ہمہ زریں  
 زرد و شطرنج از صنائع ہند      قلم و کاغذ از بدائع چین  
 میز با خوب و پردہ با مرغوب      حوضم از سنگ آئینہ سنگین  
 دفت و فی بے حساب در تالار      خم می بے عدد بشیب زمیں  
 اسپہا در طویل ام بستہ      ہمہ را پای بند و رشمہ و زمین  
 در تشنگی کتا بنجانہ من      شدہ ہچو نگار خانہ من

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایرج نے حکومت کے مختلف شعبوں میں شہرت اور سربل غزیری حاصل کی لیکن ان کے باوجود اس کی زندگی میں ایک خدا سا تھا۔ اطمینان، سکون اور سچی راحت جن کا وہ خواہاں تھا اسے نصیب نہیں ہوئے، مازرت اس کی طبیعت کے مذہب تھی لیکن لات نے اسے مجبور کیا تھا اس پر طبیعت ایسی پائی تھی کہ آخر حسب خاطر روئی باقی رہی نہ کوئی جاندار، اس کا ذکر وہ خود اپنے ذیل کے اشعار میں کرتا ہے :

بعد سی سال قلم فرسائی      نوکری، کیسہ، بری، ملائی  
 گاہ حاکم شدن و گاہ دبیر      گہہ ندیم شدہ و گہہ یار و وزیر  
 گرد سرداری سلطان رفتن      بل بلہ قربان گفتن  
 باز ہم کیسہ ام از زر خالیست      کیسہ ام خالی و ہمت عیدست  
 نہ سری دارم و نہ سامانی      نہ دہی، مزرعہ و نہ دکائی  
 نہ سروکار بیک بانک مراست      نہ بیک بانک یکی دانگ مراست

چنانچہ اطمینان قلب کا ایرج آخر تک خواہاں تھا۔ اس غم میں خسرو ایرج کے یہ لفظ قابل تحریر ہیں :  
 ”ہموارہ غمگیں و مترصد استخلاص از این مشقت نہ سلوحت بود“

ایرج کی زندگی میں کئی حادثات رونما ہوئے تھے طوفان آنے لگتا تھا۔ یہ لہام و مصائب میں  
 ۱۰۹۰ - ۱۰۹۱ - ۱۰۹۲ - ۱۰۹۳ - ۱۰۹۴ - ۱۰۹۵ - ۱۰۹۶ - ۱۰۹۷ - ۱۰۹۸ - ۱۰۹۹ - ۱۱۰۰



اس نے صبرِ استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس نے زندگی کا مقابلہ ڈٹ کر کیا۔ اس نے زندگی کے اس تاریک پہلو پر کبھی زیادہ غور نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف کامیاب شاعر بنا بلکہ زندگی کے ہر مرحلہ پر مشعلِ راہ بنا جس کی روشنی سے اس نے اپنے ملک کی اپنے ہم وطنوں کی راہنمائی کی۔

ایرج مرزا کو ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ گو اس کی زندگی کا بیشتر وقت ملازمت اور بلی قربان بلی قربان کہتے گذرانا ہم ادبی ذوق ہمیشہ اس سے وابستہ رہا۔ ادب اور شاعری کا ایک غیر معمولی ذوق سلیم وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا جو اس کے کلام کے ہر لفظ سے بلکہ ہر حرف سے واضح قاطع ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ ایرج مرزا عربی اور فرانسیسی زبان اور ادب کا بڑا شائق تھا جس کا اندازہ اس کے کلام سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ ایرج مرزا کو کتب بینی کا بے حد شوق تھا بسا اوقات اس کو ملازمت تلف اور نامساعد سے سابقہ رہا۔ سرکاری ملازمت کے قیود انتظامی جہد کی ذمہ داریاں اور ان کی دعوے سے علمی مرکزوں سے بعدِ مسافت اور علمی صحبتوں کی عدم موجودگی میں کتب میں ہی اس کی بہترین غیس ہمدم ہو کر قیام پزیر رہی۔ کتب میں ہمیشہ اس کے ساتھ خلوت و جلوت میں رہتیں۔ کتب بینی کے لئے ایرج مرزا اتنا وقت ضرورت نکال بتلا کہ وہ دن کو سارا لٹریچر کے لئے کر سکے۔ مصنف کے لئے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ جدید تصانیف یا دیوان پرمختار ہے بلکہ شعرا کے متقدمین کے کلام سے بھی اسے اتنا ہی لگاؤ تھا جتنا کہ وہ اسے جدید ادب و شاعری سے تھا۔ ذیل کے شعراء سے جہاں وہ لفظی گنجوی کے شاعر و شاعرہ کرتا ہے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ شعراء متقدمین کا ہمہ تن سہ کے مضامین کا ایک جزو تھا۔ یہ شعراء ایرج کی نظم الفیت بفرزند سے ماخوذ ہیں۔

خاتم بتویتی از نظامی      آن میر سخورای نامی

بالا نگر می بغایت خود      بہتر از ذرہ دوزی بد

سہ دیوان ایرج مرزا ص ۸۸

نیز ایک قصیدے میں ایرج مرزا اپنے ممدوح کو (جو غالباً اس کا اپنا بڑا کاہی ہے) تحصیلِ علم کی طرف راغب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ درسِ تدریس سے جب تیری طبیعت اکتا جائے تب میں تجھے تواریخ اور کتبِ سیر سے خلفائے راشدین کے قصے سناؤں گا تاکہ تیری نکان دور ہو جائے اس ضمن میں ذیل کے اشعار جس سے ایرج کی کتبِ مبنی کا پتہ چلتا ہے ملاحظہ ہوں :

شب کہ از درسِ شدی خستہ و از مشقِ کسل      نقل گویم بتو از روی تواریخ و نسیر  
قصہ ہا بہر تو خاتمِ برشِ بیج بود      بعلی قصہ عثمان و ابوبکر و عمرؓ  
ذوقِ کتبِ مبنی کے ساتھ ساتھ ایرج مرزا کو کتبِ فراہمی کا بھی بڑا شوق تھا۔ اس سے ایرج کی اپنی لائبریری کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی تصدیق اس کے ایک شعر سے ہوتی ہے جہاں وہ اپنے کتب خانہ کا ذکر کرتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایرج مرزا نے کتابوں کی حفاظت اور آراستگی میں اپنی خاص توجہ دی جس کی وجہ سے اس کا یہ کتاب خانہ نگارستانِ چین کو شرمانے کے لئے کم نہ تھا۔ چنانچہ اس کا شعر حسبِ ذیل ہے :

در تشنگی کتاب خانہ من      شدہ ہجو نگار خانہ چین

ایرج مرزا کو شعر و شاعری سے بے حد لگاؤ تھا۔ زندگی کے ہنگاموں سے جب فرصت ملتی وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوتا۔ اس کی یہی دل چسپی تھی جس کی وجہ سے وہ مشاعروں اور مسابقوں میں حصہ لیتا تھا۔ طہران میں ایک مسابقہ ہوا جس میں بہت سے ادیبوں نے حصہ لیا تھا۔ مسابقہ کا مضمون ”مکن مارا فراموش“ یعنی ”ہمیں بھول نہ جا“ تھا۔ اس مضمون کو شعرا نے اپنے طور پر الگ الگ میرا یہ میں باندھا۔ اس وقت ایرج مرزا نے جو اشعار موزوں کئے وہ ”بدیہ عشق“ کے زیرِ عنوان اس کے دیوان میں موجود ہیں۔ ان اشعار میں ایرج نے ایک قصہ بیان کیا ہے جس میں وہ ایک عاشق کا ذکر کرتا ہے جس نے محبوب کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے اپنی جان تکڑے دی۔ چون کہ ان اشعار کی تعداد زیادہ ہے اس لئے چند منتخب اشعار ذیل میں سپردِ قلم ہیں :

عاشقی محنتِ بسیار کشید      تا لبِ دجلہ بمحشوقہ رسید  
 نشدہ از گلِ رویش سیراب      کہ فلک دستِ گلی داد باب  
 نازنین چشمِ بشطِ دوختہ بود      فارغ از عاشقِ دلسوختہ بود  
 دید در روی شطِ آید بشتاب      تو گلی چون گلِ رویش سیراب  
 گفت وہ وہ چو گلِ رعنائیت      لایق دستِ چو منِ زیبائیت  
 حیف از این گل کہ برد آبِ او را      کند از منظرہ نایب او را  
 زین سخن عاشقِ محشوقِ یست      حبت در آبِ چو ماہی از شست  
 باری آں عاشقِ بے چارہ چو بط      دل بدریا زد و افتاد بشط  
 دید آبیت فراوان و درست      بذبط آمد و درست ز جان شست  
 دست و پائی زد و گل را بر بود      سوی دلدارش پر تاب نمود  
 گفت کی آفتِ جاں سنبلی تو      ماکہ رفتیم بگجرِ این گل تو  
 بکنش زیبِ سرائے دلبرِ من      یاد آبی کہ گذشت از ہر من  
 جز برای دلِ من بوش ممکن      عاشقِ خویش فراموش ممکن

ایرج مرزا کو شروع ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا۔ ایسی کم عمری میں اس کی استعدادِ شاعری  
 کو دیکھ کر لوگوں نے اس کی ہمت افزائی کی ان لوگوں میں حسن علی خاں میر نظام آبادی مشہور ہے ایرج  
 مرزا نے اپنی مستی جاری رکھی اور شعر موزوں کرتا رہا۔ اس نے ہر وقت نئے موضوعات کو شاعری میں  
 داخل کیا چنانچہ اس کا دیوان اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس میں منقہ میں کارنگ بھی پایا  
 جاتا ہے اور اس لئے اپنے زمانہ کا حال بھی رونما ہے دہلی کے زمانے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جب کہ  
 شاعری بادشاہوں اور ان کے درباریوں کی بود و بس تھی۔ یہی وہ مدتِ رسمی قہیدہ اور غزل سے  
 آگے نہ بڑھ سکی۔ ت عزیں نے اپنی تمام قوتِ فطریہ کو بے جا تھکائی۔ صرف کردی  
 یہی وجہ ہے کہ فارسی اور کافیشہ قہیدہ گوئی۔ غزل سرائی اور مثنوی نگاری سے بھرپور ہے۔



اس وقت کوئی شاعر نہ تھا جو شعری کے میدان میں انقلاب پیدا کر سکتا تھا۔ کسی نے شاعری کو سیاست، اقتصادیات اور سماج کی ترقی کے لئے آکار نہیں بنایا کیوں کہ اس کے لئے موت کو پیغام دینے کے برابر تھا صفوی دور میں ایران میں عظیم انقلاب کی ابتدا ہوئی اور یہ انقلاب چار دو در میں عروج پر پہنچا آزادی اور سلاطین و وقت کے خلاف نعرے ہی زمانہ کی پکار تھی۔ نیز ملک و اس کے باشندوں کی ترقی و خوش حالی نے شعر کی توجہ مبذول کی تھی۔ آزادی کے متوالے نعرے لوگوں میں آزادی کی محبت کو ابھارا۔ عہدہ اذیں سماج کی خرابیوں کو دور کرنا یہ بھی موضوعات شاعری میں داخل تھا۔ لہذا شعرا نے وقت کے کلام ان سے برتر نہیں۔ اسی زمانہ میں ایرج نے جنم لیا تھا۔ لہذا ماحول ہ تراں کی شاعری پر لازمی و یقینی تھا۔ ایرج مرزا نے ملک و قوم کی ترقی کے لئے تعلیم کو زیادہ اہم سمجھا۔ ملک کی ترقی کا دار و مدار بڑی حد تک اس کے تعلیم یافتہ ہونے پر ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو ایرج نے مغربی ملکوں میں پایا۔ ان ملکوں کے مقابلہ میں ایران نے ایران کو بہت پیچھے پڑا۔

ایرج اس نظام تعلیم کے بھی خلاف تھا جو اس کے زمانہ میں رائج تھا۔ یہ نظام تعلیم ملک کی ترقی کے لئے زیادہ مفید نہیں تھا۔ اس قسم کی رائے ایرج مرزا نے غالباً اس وقت قائم کی جب ان مغرب نے تعلیم کے میدان میں بہت زیادہ دریافت کیں جس وقت روس و اور جان ڈیپ نے پورے تعلیمی نظام کو بدل کر رکھ دیا۔ ان لوگوں نے تعلیم میں چہ کو زیادہ اہمیت دی انھوں نے بچوں کی ذہنی و جسمانی قابلیتوں اور اس کی استعداد اور پسند کو زیادہ اہم سمجھا اور اس کے مطابق نئے طریقہ دریافت کئے لیکن ایران کا نظام تعلیم سنہ ۱۲۸۱ ہجری قمری میں قائم کیا گیا تھا جس کی نفوذیت کو نظر انداز کیا جاتا اور معصومات کا ذخیرہ سے دیوان ایرج مرزا ص ۲۱

چنانچہ امیری شاعر نے علی ناعان کا شعر ایلی و مجنوں کے قصوں کے بدلے شاعری سے وطن کی ترقی کا کام لیا۔ امیری کے شعر یہ ہیں

قصہ قیس و غنچہ یمنی	حرف محمود و سرگذشت ایاز
کنہ شد این فاساد یکسر	کن حدیث نوی نہ سر آغاز
بگذر از این نسون و این نینگ	دیگر زین سخن نسانہ مساز
گر ہوائی سخن بود سبوت	از وطن بعد ازین سخن گو باز

بچوں کے دماغ پر حیران کن سنا جاتا تھا چنانچہ ایرج کی ذہنی کی نظم اس ضمن میں قابل ذکر ہے جس میں ایرج نے شاگرد اور استاد دونوں کے نظام تعلیم سے بیزاری کا اظہار کیا ہے :

چنین میگفت شاگردی بمکتب	کہ این مکتب چہ تارکیست یارب
نباشد جز ہماں تار یک دیوار	ہماں لوح سیاہ و تیرہ و تار
ہماں درس و ہماں بحث مبتین	ہماں تکلیف و آں جائی معین
ہمیشہ این کتب و این قلمدان	ہمیں دفتر کہ در پیش است و دیوان
ن شاید خواند این را زندگانی	کسالت باشد این نہ شادمانی
معلم زر جوابش این چنین گفت	کہ باشد حال تو با حال من جفت
ہمیں سبز مرا ہموارہ در زیر	کنم ہر صبح کہ این درس تکریر
نباشد جز ہماں قیل و ہماں قال	ہماں تحویل صرف و نحو اطفال
چہ اطفالی کہ با این جملہ تدریس	نمی دانشد جز تذریر و تلبیس
چنان تنبل بوقت درس خواندن	کہ ہم خود را کسل سازند و ہم من

بشاگرد و معلم بار بسیار

نگردن ہست و باید برد تا چارہ

ایرج مرزا کے یہاں تعلیم کے متعلق اس قسم کی اور نظمیں بھی ہیں جو بچوں کی تعلیم کے لئے بہت مفید ہیں۔ اس کی ایک نظم جس کا عنوان ”شوق درس خواندن“ مشہور و معروف ہے ایرج نے آسان پیرایہ میں بچوں میں علم کا شوق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم کے ابتدائی اشعار یہ ہیں :

حمد بر کردگار کیست بود	کہ مرا شوق درس خواندن داد
آشن کرد چشم من بکتب	داد توفیق خیرم از ہر باب
در میر من ہوا ی درس نہاد	در دین من محبت استاد

۱۱۲ دیوان ایرج مرزا ص ۲۴ - ۲۵ ۱۱۳

نئے دور کے ماہرین تعلیم نے تکنیکل ایجوکیشن پر زیادہ زور دیا ہے اس میں علم طب یا معنی غیر سب سے شامل ہیں۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں ایرج نے اپنے لڑکے کو چند نصیحتیں لکھی ہیں جن میں ن پر بھی زیادہ زور دیا ہے۔ یہ نظم ایرج نے گوا اپنے لڑکے کے لئے لکھی جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے لیکن پورا ملک اس سے مستفید ہو سکتا ہے چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں :

امروزہ سال پیش ازیں نیست      بے علم دگر نمیتواں زیست  
گر صنعت و حرفت ندانی      زحمت بیبری ز زندگانی  
از طب و طبیعی و ریاضی      قلب تو برجہ ہست راضی  
یک فن پسند و خاص خود کن      تحصیل باختصاص خود کن

تعلیم کے علاوہ ایرج سماج کی ترقی کے لئے کبھی اپنی شاعرانہ استعداد کو کام میں لایا۔ عورت اور اس کی آزادی اور اس کا سوشل رتبہ شعراء کے کلام کا موضوع بن چکا تھا۔ نئے دور کے شعراء عورت کو اس کے اپنے حقوق دلانے میں بڑی مدد کی۔ انھوں نے عورت کے وجود کو نہایت اہم سمجھا۔ ان کی نظر میں عورت ملک کی ترقی میں اتنی ہی مفید ہے جتنا کہ مرد۔ لیکن عورت کی پس ماندہ حالت کو دیکھ کر شعراء وقت تے صدائے احتجاج بلند کی۔ چنانچہ عارف اور دیگر شعراء کے کلام میں اس مسئلہ پر کافی اشعار ملتے ہیں۔ ایرج مرزا بھی عورت کو احترام کی نظر سے دیکھتا تھا جیسا کہ اس کے ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔ ان اشعار میں ایرج نے عورت کو مرآت جمالِ ذوا بجاں کہا ہے اور دوسرے شعر میں آ باغِ زندگی میں ریاحین سمجھا ہے :

(۱) تو مرآتِ جمالِ ذوا بجلالی      چرا مانند شلغم در جوالی<sup>۱</sup>

(۲) باغِ جان ریاحینند نسواں      بجایِ ورد و شرفند نسواں<sup>۲</sup>

ایرج مرزا پردہ و حجاب سے متنفر تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عورت گھر کی چار دیواری میں منہ کو ڈھانکے بیٹھی رہے۔ بلکہ ایران کی تیسری ایرج چاہتا تھا کہ وہ بھی مردوں کا ہاتھ بٹائے۔ نیز وہ

۱۔ دیوان ایرج مرزا ص ۲۸      ۲۔ ایضاً ص ۴۴      ۳۔ ایضاً ص ۴۰



رقطراز ہے کہ حجاب کے متعلق نہ کوئی حدیث آدر نہ کوئی خبر ہے کہ عورت اس طرح اپنا منہ چھپائے  
دنیا سے الگ رہے اس سوشل مسند پر ایرج نے کئی اشعار لکھے۔ عارف نامہ میں ایرج نے بالخصوص  
اس مسند پر مفصل بحث بھی کی ہے۔ ذیل میں اس کے چند اشعار سپرد قلم ہیں :

- (۱) خدایا تا بجی مرداں بخوابند      زناں تا کی گرفتارِ حجابند  
(۲) بدآں خوبی در این چادر کریہی      بہر چیزی بجز انساں شبیہی  
کدامست آن حدیث دآں خبر کو      کہ باید زن کند خود را چو لولو  
(۳) پیمبر آنچه فرمودہ است آن کن      نہ زینت فاش نہ صورت نہاں کن  
حجاب دست و صورت خود یقینت      کہ عند نص قرآن مبین است  
(۴) در اقطارِ دگر زن یارِ مردست      در این محنت سر اسر بارِ مردست  
تو اے بامشک گل ہنسنگ و ہم رنگ      نیگردد در این چادر دلت تنگ  
نہ آخر غنچہ در سیر نکال      شود از پردہ بیرون تا شود گل  
تو ہم دستی زن اس پردہ بردار      کمالِ خود بعالَم کن نمودار  
تو ہم اس پردہ از رخ دور میکن      درد دیوار را یر نور میکن

ایرج مرزا کی شاعری پر سرمایہ داری اور مزدور نے بھی اثر ڈالا ہے۔ شاعر کی حساس طبیعت  
نے ان دو انسانوں میں جو فرق پایا اس کا اظہار اس نے اپنے کلام میں کیا۔ ایرج مرزا سرمایہ داری کے  
خلاف تھا اور ملک کو اس کے خراب اثرات سے بچانے کے لئے اس نے اپنی شاعری سے کام لیا یہ  
سرمایہ داروں کے بے ہنگمند کے سخت خلاف تھا۔ ایرج کی یہ رائے تھی کہ مزدور اور سرمایہ دار دونوں  
یکساں ہیں۔ بغیر مزدور کی مزدوری کے سرمایہ ارا گئے بڑھ نہیں سکتے۔ اس یکسانیت کو قائم رکھنے کے  
لئے جس پر ملک قوم کی ترقی کا بڑی حد تک اور مدار ہے ایرج نے ایک جھوٹی لیکن براثر نظم لکھی جس کا  
عنوان "کارگر" ہے اس نظم کے چند منتخب شعاریہ ہیں :

شنیدم کارِ فرہانی نظر کرد      ز روی کبر و نخوت کارِ گرا

گفت ایگجور این نخوت از چیت جو مرد رنج بخشی رنجبر را  
 تو از من زور خواهی من ز تو زور چه منت داشت باید یکدیگر را  
 زنی یک بیل اگر چوں من در این خاک بگیری باد دست خود کمر را  
 نشانم از جبین گوهر در این خاک نشانم از تو پاداش ہنر را  
 نہ باقی دارد این دفتر نہ فاضل گہر دادی و پس دادم گہر را

ملک کی ترقی میں شراب بندی کو ایک خاص فائدہ عام کا کام سمجھا جاتا ہے۔ ہر ذی ہوش آدمی اس کے نقصانات سے بخوبی واقف ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ سوشل رفاہی مزد نے شراب بندی کے واسطے بڑی جدوجہد سے کام لیا۔ ایرج نے اس موضوع کو اپنے سامنے رکھا اور اس پر شرموزوں کئے۔ اس نے نہایت دلچسپ فقہ بیان کر کے شراب کی مذمت کی ہے تاکہ لوگ اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ قصیدوں ہے : ایک شخص نے ابلیس کو خواب میں دیکھا جس کی شکل بڑی ڈراؤنی تھی اس نے اس شخص سے کہا کہ وہ موت ہے اگر تو جان کی سلامتی چاہتا ہے تو ان تینوں کاموں میں سے کوئی ایک کام کر یا تو اپنے باپ کو قتل کر یا بہن کو یا شراب پی۔ ان میں سے اس شخص نے شراب کو پسند کیا اور شراب پی لی کیوں کہ اسے باپ سے اور بہن سے محبت تھی۔ جو ہی شراب سے وہ مست ہوا اس نے باپ اور بہن دونوں کو قتل کر ڈال۔ چنانچہ ایرج نے اس فقہ کو اس انداز میں بیان کیا ہے :

ابلیس شبی رفت بہ بالین جوانی آراستہ با شکل ہیبتی سرورہ را  
 گفتم کہ منم گد اگر خواہی ز نہار باید بگریزی تو یکی زیں سر خطر را  
 یا آں پدر پیر خودت را کشی زار یا بشکنی از خرابی ہر خود سینہ دہر را  
 یا خود ز می تاب بنیشتی و نہ سہنر تا آنکہ پوشم ز ہاک تو نظر را  
 از بد ازین ہم چوں بر خود ز جاداشت کز مرگ فتد رزہ تبہن ضیغم نہ را  
 گفتم کہ منم با پدر و خواہرم این کار لیکن ہی از خویش کنم دفع ضرر را

جامی دوسری خورشید چہرہ زمستی ہم خواہر خود را زد ہم کشت پدر را  
 لے کاش شود خشک بن تاکہ خداوند زیں مایہ تر حفظ کند نوع بشر را<sup>۱</sup>  
 ایرج نے شاعری سے قوم اور ملک کی اصلاح کا کام لیا جیسا کہ مذکورہ بالا بحث سے واضح  
 ہے۔ لیکن ایرج کی شاعری کو صرف اصلاح تک محدود کرنا ایک سخت نا انصافی ہے۔ اس کا دیوان  
 گوناگوں موضوعات کا حامل ہے اس میں متعدد رنگ ہی نہیں جھلکتا ہے بلکہ یہ مانہ حال کا بھی آئینہ دار ہے۔  
 اس کے کلام میں دمی، حلقہ اور سجدی کا اثر ہی نہیں بلکہ بہار، عارف اور دیگر شعرائے وقت کا اثر  
 بھی نمایاں ہے۔ ایرج مرزا نے تصوف، فلسفہ اور سیاست تینوں کو اپنا میدان قرار دیا ہے۔ اس کی  
 نظم ”مرگ ضعیف“ ”وقا“ ”داشک شیخ“ وغیرہ میں فلسفیانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ اور اس کے ذیل  
 کے اشارے سے تصوف اور بے ثباتی عالم کا پتہ چلتا ہے :۔

ہر کہ آمد دریں جہاں ناچار رود از این جہاں چہ شہ چہ گدا  
 یک جہاں دگر خدای آراست کہ بود نام آن جہان بقا  
 سوی دار بقا رود ہر کس کہ بیامد دریں سرای فنا  
 اسی طرح یہ بھی اشعار ملاحظہ فرمائیے

چشم عبرت کش ہیں کہ چپں مسند جم بداد بر کف باد  
 ہم ناکام از زمانہ روند زانکہ کام کسی زمانہ ندارد  
 جہان مرگش آسمان دوزخ ہر کہ اندر زمین ز مادر زاد

ایسے بالکل شاعر اور مصلح قوم نے ۲۸ شعبان ۸۳۳ھ میں وقت پائی خسرو ایرج  
 کا بیان ہے کہ قلب کی حرکت یہ ایک بند ہو جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی چنانچہ اس کا  
 بیان حسب ذیل ہے :

..... روز دوشنبہ ۲۸ شعبان ۸۳۳ھ ..... یک ساعت بغروب در اثر سکتہ قلبی دار

فانی را بدرود گفت و طومار زندگانی را در ہم پیچید<sup>۲</sup>

۱۔ دیوان ایرج مرزا ص ۱۰ ۲۔ ایضاً ص ۵



## مصر ۱۸۹۸-۱۸۹۹ء میں

### ایک ہندوستانی سیاح کا سفرنامہ

(جناب ڈاکٹر عابد رضا صاحب بیدار)

ہندوستان کے مشہور عربی دان علامہ ابراہیم قرطبی نے انیسویں صدی کے آخری برس مصر شام اور ترکی کی سب جگہں گزاریں۔ اور واپسی پر ۱۹۰۵ء میں اپنے تاثرات کو کتابی شکل دے کر ایک سفرنامہ شائع کیا۔ یہ سفرنامہ اردو میں بلا واسطہ اسلامیکہ پہلا سفرنامہ ہے جو کسی ہندوستانی نے لکھا ہے۔ خواجہ غلام الثقلین کا سفرنامہ (اشاعت ۱۹۱۲ء) 'ورثہ' کا سفرنامہ روم و مصر شام۔ (اشاعت ۱۹۱۴ء) اس کے بعد کی چیزیں ہیں۔ اس سفرنامہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علمی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے اور کسی تفصیل کو نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے۔ لیکن اس سے ایک خرابی بھی راہ پاگئی ہے کہ بعض بالکل فضول تفصیل داخل ہو گئی ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کو عرصہ گزر گیا ہے اور اب اس کی حیثیت نایاب جیسی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے بہت کم شمار کو اس کا علم ہو گا۔ اس کی افادیت کے پیش نظر میں نے سفرنامہ کے اس حصہ کو جو مصر سے متعلق ہے، ایزت کیے سفریادیں جو سو صفحہ پر محیط ہے، غیر ضروری تفصیل کو چھوڑ کے مصنف ہی کی زبان میں، ضروری محنتوں کو ترتیب دے دیا ہے اور اس طرح آخر انیسویں صدی کے مصر کی ایک واضح تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

مصر کی تاریخ میں یہ زمانہ کئی اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، ۱۸۹۸-۱۸۹۹ء تک مسٹر برطانوی تسلط، جس کی ابتداء ۱۸۸۲ء میں ہوئی تھی اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔ سیران سپر محمد حامد لہدی کی قیادت میں جو اتحادی تحریک شروع ہوئی تھی اور جس نے ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ سال تک برطانیہ کو پریشان کئے رکھا، آخر اس میں شکست کھا گئی۔ سودان پر برطانیہ کا قبضہ ہو گیا اور ۱۸۹۹ء کے

معاہدہ کی رو سے سودا ان مصری، برطانوی مشترکہ مقبوضہ قرار دے دیا گیا۔

یہی وہ زمانہ ہے جب مصر میں قومی تحریک کی چنگاری از سر نو بجھنے لگتی ہے۔ نئے خدیو مصر عباس حلمی کے انگریز دشمن رویہ سے شہ پاکر قوم پرست کافی دلیر ہونے لگے تھے۔ پھر نیا تعلیم یافتہ نوجوان گروپ تھا جو قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار اپنے ملک کو غیر کے قبضہ میں دیکھ کر جھنجھلا اٹھتا تھا۔ انگریزی عہد میں اقتصادی و انتظامی استحکام نے مصریوں میں ایک نئے درمیانی طبقہ کو جنم دیا تھا جو ملک کی باگ ڈور انگریز کے بجائے اپنے ہاتھ میں یکمنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ پریس کی آزادی و اخبار رسائل کی فراوانی نے قومی شعور کو بیدار کرنے میں خاصا حصہ لیا تھا۔ نئی قومی تحریک کی قیادت انھیں اخبار نویس قلم کاروں کے ہاتھ میں تھی۔ مصطفیٰ کامل اس تحریک کا قیادہ علی تھا۔ اعتدل پسند گروپ کی قیادت المودی کے اڈیٹر علی یوسف کے ہاتھ میں تھی۔ اور خود خدیو بھی انگریزوں سے نفرت کرتا تھا۔

ان قوم پرستوں کی منطق سیدھی سادی تھی۔ انگریزوں نے ابھی تک مصر پر باقاعدہ قبضہ کا اعلان نہیں کیا تھا (اور یہ اعلان وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ چھڑنے تک نہیں کر پائے) سلطنت عثمانیہ ابھی تک قانونی طور سے مصر کی حاکم علی تسلیم کی جاتی تھی اور خدیو مصر کا نمائندہ۔ مصر بھی تلک کی کو مفقرہ خراج ادا کرتا تھا۔ مصر کا سارا اندر دنی انتظامی ڈھانچہ جوں کا توں تھا اور برائے نام خدیو اور اس کے دربار حکومت کرتے تھے۔ انگریزوں نے صرف اتنا کیا تھا کہ ہر عرصہ میں ایک انگریز مشیر لگا دیا تھا جو بظاہر مشورہ دینے پر آمور تھا لیکن اس مشورہ شکن حیثیت رکھتا تھا، سب سے اوپر انگریزی بحیثیت درقونصل جنرل لارڈ کرڈمر تھا، جو خدیو کے لئے مشیر علی کی حیثیت رکھتا تھا، اس کا مشورہ ماننا خدیو کے لئے ناگزیر تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود بین الاقوامی حالات کے سبب انگریز کھل کر اپنے قبضہ کا اعلان کرنے کی سکت نہیں پاتے تھے اور اسی کو بنیاد بنا کر قوم پرست اپنی تحریک شروع کر رہے تھے۔

اس زمانہ کے سیاسی مصر کی تو کافی تصویریں مل جاتی ہیں۔ مصر کے ملک انگریزوں نے اس موضوع پر تصانیف کا ڈھیر لگا دیا ہے لیکن عوامی مصر کا ذکر مشکل سے ملتا ہے۔ یورپین سیاح بھی

اپنی سیاست میں مگن، اسی کے گن گاتے گاتے سفر نامے ختم کر دیتے ہیں۔ ایک ہندوستانی سیاح نے اس مصر کو قلم درسیاہی کے رشتہ میں برد کر محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے ۱۸۹۰-۱۸۹۹ء کا مصر، جب انیسویں صدی م توڑ رہی تھی اور بیسویں صدی جنم لینے کے لئے بے چین تھی :-

” ۲۹ اپریل ۱۸۹۸ء کو میں جہاز پر سوار ہوا۔ چھ دن کے عرصہ میں عدن پہنچا جو بمبئی سے ۱۶۶۴ میل ہے۔ عدن سے روانہ ہو کر ۹ مئی کو سوئز پہنچا، یہ سفر ۱۳۱ میل کا تھا جو غالباً چار دن کے عرصہ میں طے ہوا۔ بمبئی سے سوئز تک ہر درجہ کی تفصیل یہ ہے :-

مسافر درجہ اول کے واسطے ۳۶ روپے، درجہ دوم کے واسطے ۲۲ روپے، درجہ سوم کے واسطے ۵ روپے۔

شہر سوئز مصر کا مشرقی بندرگاہ ہے۔ زمانہ قدیم سے اس کو قلم رسم کہتے تھے، چنانچہ بحیرہ قلمر اسی کے نام سے مشہور ہے اس وقت تقریباً بارہ ہزار آدمی اس میں سکونت رکھتے ہیں۔ سوئز پہنچنے کے بعد مقامی خصوصیات میں سے جو چیزیں ایک مسافر کو حیرانی میں ڈال دیتی ہیں ان کا مختصر سا اندازہ ان حالات سے ہو سکتا ہے :

(۱) سکہ کی حالت : اس جگہ بیشتر رواج مصری سکہ کا ہے جو تین علیحدہ علیحدہ دھاتوں سے بنایا جاتا ہے۔ سب سے ادنیٰ سکہ ’ملیم‘ ہے جو تانبے سے بنایا جاتا اور تین پائی کے برابر ہوتا ہے۔ اس سے اوپر چاندی کا سکہ ’قرش‘ ہے جو شکل میں دوئی کے برابر اور ۲ آنے ۶ پائی کے مساوی ہوتا ہے اس سے اعلیٰ ’ریال‘ ہے جو زریہ سے شکل و حجم میں بڑا اور قیمت میں تین روپے دو آنے کا ہوتا ہے سب سے انتہائی قیمت کا سکہ ’جنی‘ ہے جس کو مصری شہر نی کہنا چاہیے، اس کی قیمت پندرہ روپے سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ان تمام سکوں میں ایک طرف کو ضرب مصر اور سنہ ہجری منقش ہوتا ہے اور دوسری جانب کو سلطان روم کا طغرا۔

لے اب کارگو کا بھی اس سے زیادہ کرایہ لگتا ہے جو اس وقت میں رجا دل کا تھا اچھے بحری جہازوں کا کرایہ ۲۰۰ سٹو کم نہیں رہتا۔ کارگو میں ۵۰۰ میں کام چل جاتا ہے اور معمولی جہازوں کا تقریباً ۲۵۰ سے ۳۰۰ تک ہوتا ہے اس میں کھانے اور ناشتے کے اخراجات شامل ہیں لے سکے کے نام اب بھی میں صرف بیچ کا ریال ختم ہو گیا ہے اور سلطان روم کے طغرا کا اب بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں سیم کا ایک قرش ہوتا ہے اور سو قرش کی ایک جنی (گنی) قرش ہمارے نو بیسوں کے



(۲) اختلاف زبان : سوتراور تمام بلاد مصر میں عربی زبان بولی جاتی ہے مگر اس کا تلفظ

اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ان لوگوں سے بات چیت کرنے میں پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کی بات سمجھنے میں نہ ان کو اپنا مطلب سمجھا سکتے ہیں۔ مثلاً ما اسٹ کی جگہ اسٹ ایہ (تمہارا کیا نام ہے)۔ الی آیت تروح کی جگہ تروح فست (تم کہاں جاتے ہو)

(۳) وقت کا اندازہ : مصریوں میں شام سے طلوع آفتاب اور پھر صبح سے غروب آفتاب

تک گھنٹے شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی مصری یہ کہے کہ ہم سے دو بجے دن کے ملاقات کرنا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ آٹھ بجے صبح کے۔

سوترا سے صبح و شام دو مرتبہ ریل قاہرہ جاتی ہے۔ میں ریل پر سوار ہو کر قاہرہ چلا اور سات گھنٹے میں وہاں پہنچا۔

میں ۱۰ مئی ۱۸۹۸ء کو قاہرہ پہنچا اور برابر ایک برس تک یہاں مقیم رہا۔ جب ہندوستان سے

سفر کرنے کو تھا تو میرے بعض دوست مصر کی سخت گرمی سے مجھ کو ڈراتے تھے، لیکن یہاں پہنچنے اور کچھ

عرصہ قاہرہ میں مسلسل قیام کرنے سے معلوم ہوا کہ ان کی یہ رائے کلیطہ۔ صحیح نہ تھی۔ اگرچہ یہ ملک

منطقہ حارہ کے قریب ہے مگر بحیرہ قلزم اور بحیرہ شام جو اس کے مشرق و شمال میں واقع ہیں اور نیز دریا

نیل جو مصر کی زمین کو جنوباً و شمالاً سیراب کرتا ہوا گزرتا ہے، ان کے باعث سے یہاں کی حرارت

ناگوار نہیں ہوتی، باوجودیکہ جون، جولائی اور اگست میں اس جگہ بارش نہیں ہوتی اور دن کو آفتاب

کی حرارت بھی تیز ہوتی ہے مگر رات کو شمال مغربی ہواؤں کے چلنے سے خشکی ہو جاتی ہے۔ یہاں کے

لوگ اسی خشکی کے باعث کثرت اوقات موسم گرما میں رات کے وقت مکانوں کے اندر سوتے ہیں۔ قاہرہ سے

شمالی شہروں کی ہوا موسم گرما میں بہت زیادہ صفت ہوتی ہے اور اس آب و ہوا کی عمدگی کا نتیجہ ہے

کہ پیداوار ارضی بہت عمدہ اور لوگ خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیکن جو شہر جنوب میں ہیں ان میں گرمی کے

آثار زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔

۱۔ وقت کا اندازہ اب بالکل ہندوستان جیسا ہے، کوئی اختلاف نہیں سوائے جغرافیائی فرق کے۔

مصر کا موسم سرما یورپ اور امریکا کے دولت مندوں کے واسطے بڑی نعمت ہے۔ ہر سال صد ہا سیاح اپنے ملک کی سخت سردی کے باعث اور مصر کی عمدہ آب و ہوا کے باعث یہاں چلے آتے ہیں۔

سب سے آخری مردم شماری جو ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں ۹۷ لاکھ ۳۴ ہزار باشندے آباد ہیں، جن میں ۸۹ لاکھ ۷ ہزار مسلمان، ۷ لاکھ ۳۰ ہزار عیسائی اور ۲۵ ہزار یہودی ہیں۔ اس مجموعی تعداد میں سے ایک لاکھ بارہ ہزار اجنبی، جن کی تعداد لاٹوویا، کرومیا، رومانیہ، یوگوسلاویہ، آسٹریا، ہنگری، پولینڈ، یونان، ۳۸ ہزار ایک سو پچیس، اٹلی، ۲۴ ہزار ۴ سو ۷۷، انگلستان ۱۹ ہزار ۵ سو ۷۷، فرانس، ۴ ہزار ایک سو ۵۵، آسٹریا، ۷ ہزار ایک سو ۲۳، روس، ۳ ہزار ایک سو ۹۳، جرمنی، ایک ہزار ۲ سو ۷۷، دیگر ممالک کے لوگ، ۴ ہزار ۵ سو ۵۵۔

شہر قاہرہ، دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر سوئز سے پتھر میل مغرب کو اور اسکندریہ سے ۱۱۲ میل جنوب مشرق کو واقع ہے۔ بنیادی پتھر کسی ایسی ساعت سید میں رکھا گیا کہ ساڑھے نو سو برس گزرنے پر بھی اس کی عظمت و شوکت بدستور قائم ہے۔ سال گزشتہ کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی مع مصافحات کوئی ۵ لاکھ ستر ہزار دویسٹ ہوئی ہے جس میں سے ۳۵ ہزار کے قریب ممالک غیر کے باشندے ہیں۔ قاہرہ کا کچھ حصہ میدان میں آباد ہے اور کچھ ایک پہاڑ کی سطح پر۔ سب سے پر فضا مقام ازکیہ ہے جو پہلے ایک دیوان جگہ تھی مگر اب وہاں ایک بہت خوبصورت باغ شہر کو رونق دے رہا ہے اس کے اندر تالاب دریا ہر چاروں طرف سوداگروں کی بہت بارونق اور اعلیٰ درجہ کی دکانیں، ہوٹل، بینک، سرکاری دفاتر ہیں۔ شہر میں جس قدر عمدہ قہوہ خانے ہیں ان کا ممتاز مقام، ناگیا ہے۔ یورپین درمچین سیاحوں کے ٹھہرنے کے لئے علی درجہ کے نفیس اور شاندار ہوٹل اسی موقع پر ہیں۔ شہر کوں پر گیس کی روٹنی ہوتی ہے، آب سانی کا انتظام سکوں سے موجودہ آبادی ۲۰ لاکھ کے کچھ زیادہ سی ہے۔ لے لے ازکیہ درخان خیل کی بکھی ہوئی پوزیشن ہے۔

کے ذریعہ سے ہے۔ شہر کے بڑے بڑے حصوں میں برقی ٹریموے جاری ہے۔ باوجود ان ترقیات کے شہر کی تنگ گلیوں اور غریبوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی صلاحات کی گنجائش ہے۔

عمار اب اندرون شہر میں ایک مشرقی بازار خاں خلیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ہندستان، ایران، شام، استنبول اور اور ملکوں کے سوداگرا اپنے اپنے ملکوں کی بے نظیر دستکاریاں اور ایشیا کے عجائبات قدیمہ کی تجارت کرتے ہیں۔ اس بازار کے اندرون حصہ پر چھت پٹی ہوئی ہے، اس وجہ سے سورج کی تپش ان دکانوں میں بھی داخل نہیں ہوتی۔

مضافات قاہرہ میں، بولاق دریا نیل کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ بیشتر یہ جزیرہ تھا گراب خشکی سے پیوند ہو کر نیل کا بندرگاہ بن گیا ہے۔ مصر (عقیدۃ مصر قدیم) بھی نیل کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ خلفائے فاطمیین کی فتوحات سے پہلے اس کو فسطاط کہتے تھے۔ قبراۃ مقام ہے جہاں خلیفہ مظلم کے محلات شاہی بنے ہوئے ہیں۔ یہ شہر سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ عباسی کی آبادی خلیل شہر کے متصل اور دوسری لمبائی میں چلی گئی ہے۔ یہ دونوں آبادیاں آب ہوا کی عمدگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔

یہاں کی مسجدیں بہت قدیم اور عمدہ بنی ہوئی ہیں۔ اس وقت پرانی مسجدوں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ مسجدوں میں امام، مؤذن اور خادم جس قدر ہیں، ان سب کو محکمۂ اوقاف سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ قبراۃ میں اب بیت اور بزرگان دین کے چند مزار ہیں، ان میں سب سے مقدس زیارت گاہ شہداء امام حسینؑ کی ہے۔ مصر کے پہلے فاطمی خلیفہ کو جب ملک مصر اور شام پر تسلط ہوا تو وہ امام صاحب کا مہر مبارک شام سے قبراۃ لایا اور اس جگہ بزرگ عظیم نشان مقبرہ تعمیر کیا۔ منجملہ مزارات مقدسہ سے حضرت سیدہ ثقیف بنت زید بن علی بن امام حسینؑ کی قبر ہے۔ مصر کے فاتح عمرو بن العاصؓ کا مقبرہ بھی یہی جگہ ہے حضرت امام شافعی کے مقبرہ کا فخر اس سرزمین کو حاصل ہے جن کا مذہب امام مالک مصر میں پھیلا ہوا ہے۔

سہ گلیوں کا سسٹم اب بھی جاری ہے



جو مسافر بے مرد سامان اس ملک میں جلتے ہیں ان کے قیام کے واسطے متعدد تکیے موجود ہیں۔ تکیہ کا لفظ غالباً مسافر خانہ کے مرادف ہے۔ جہاں مسافر بے کرایہ اور بغیر کسی قسم کے اعتبار کے رہ سکتا ہے۔ ہر ملک کے واسطے علیحدہ علیحدہ تکیے موجود ہیں اور ترکیب میں اسی ملک کا ایک شخص منتظم تکیہ ہوتا ہے جس کو مصروفی کی اصطلاح میں شیخ التکیہ کہتے ہیں۔ مجھے صرف ہندی تکیے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

اس وقت دس بارہ مسافر اس میں موجود ہیں، دو تین ہنگالی اور پوری میں بیس بیس برس سے بڑے ہوئے ہیں۔ شیخ التکیہ کو ہر سال ضروری مصارف محکمہ اوقاف سے ملتے ہیں۔ پہلے دن ان مسافروں کو دوٹی بطور مہمان مفت ملتی ہے کچھ تہوہ کا خرچ روزانہ ملتا ہے مگر دوٹی پھر نہیں ملتی ہے۔

عام (مصریوں) کے مزاجوں میں غموں، دروں، حرفہ کی طبیعتوں میں خصوصاً طبع، دروغ گوئی اور خود غرضی از حد ہے۔ متوسطین کی طبع میں یوں تو ظاہر داری بہت ہے اور بات بات میں خوش کن اتفاق استعمل کرتے ہیں مگر کچھ سرد مہری اور سبوتاہی کی ہوا میں پائی جاتی ہے۔ امراء اور تعلیم یافتہ لوگوں کے اخلاق بہت جھمبے ہیں۔ خاص خوبی ان میں یہ ہے کہ قومی معاشیات میں مدد کرتے ہیں چنانچہ مصنفین کی محنت کی داد دینے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے خیال سے ان کی تصانیف کی کچھ جلدیں خرید کر لوگوں میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں۔ لائق اخبار نویسوں کی امداد ضروری سمجھتے ہیں۔

مصری کھانوں میں سب سے عمدہ و لذیذ مین ہو گوشت ہوتا ہے۔ بد ذہیم بخت اور صرف مصریوں کے مذاق کے موافق۔ روٹی نمبر کی تیزی عموماً دو تین دن کی یا سی ہوس تک کی آب و ہوا کے لحاظ سے زرد بھنم سمجھی جاسکتی ہے مگر کہ کے اچار کا اس تک میں بہت رواج ہے۔

مصری عورتیں پردہ ریزی میں مگر کاروبار کے لعرم کے واسطے گدگدے یا ہاتھی جاتی ہیں، سودا سلف کے واسطے بازاروں میں بھڑی میں۔ دہائیوں کے مدرسیوں پر مٹی کی تینیں پسند کرتی ہیں۔

منگنی و ریب کے توجہ دینے میں سب سے دلچسپی ان میں در بند دستنی رسم و رواج میں بہت کچھ

لے تکیوں کا یہ سسٹم اب بھی جاری ہے سہ مصری عورتیں پردہ کرتی ہیں مگر..... اب یہ لکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔

تفادلت ہے۔ منگنی کے بعد نئی مراتب کو لڑکی کی ماں خود طے کرتی ہے اور چند قریبی رشتہ در عورتوں کو  
 ہمراہ لے کر لڑکی کے گھر جاتی ہے۔ گفتگو کے بعد اگر فریقین باہم متفق ہو جائیں تو جو عورتیں باہر سے آئی  
 تھیں خوشی کے نغمے گاتی ہوئی نکلتی ہیں جن کو 'زعرط' کہتے ہیں۔ اس زعرط سے محلہ والوں کو معلوم  
 ہو جاتا ہے کہ شادی قرار پاگئی۔ اور اگر لڑکی کی ماں کو شادی کرنے میں عذر ہوتا ہے تو وہ کہہ دیتی ہے  
 کہ مردوں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا جائے گا اور اس حالت میں یہ عورتیں جیسے چپ چاپ آئی  
 تھیں ویسے ہی خاموش واپس چلی جاتی ہیں۔ منگنی کی بات چیت جب عورتوں میں ہو جائے تو پھر یہ  
 سوال مردوں کے رد و صرف نچنگی کی غرض سے پیش ہوتا ہے۔ اس وقت سب اہم معاملہ تعین  
 مہر کا ہوتا ہے۔ مہر جو کچھ قرار پائے اس کا نصف لڑکی کے یا پکے حوالے ضرور کر دینا پڑتا ہے، اور یہ  
 رقم اس قدر ہوتی ہے کہ جس کا نصف آسانی سے پیشگی ادا ہو سکے۔

شادی کے دن دولہا اپنے والدین اور رشتہ داروں اور دستوں کے ہمراہ شام کے وقت دلہن  
 کے گھر جاتا ہے آگے آگے باہا ہوتا ہے، پیچھے چند نوجوان براتیوں کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذی فانوس  
 موم بتی سے روشن، جو رات کے دوسرے روشنی کا کام دیتا ہے۔ براتی زرد دلہا شب کا کھانا کھا کر اپنے  
 اپنے گھر دے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے دن دلہن کے والدین عروس کو نگھی میں سوار کر کے دولہا کے  
 گھر پہنچ دیتے ہیں اور ہمیر کا سامان بھی ساتھ کر دیتے ہیں۔

یہاں کی عورتیں محبت لڑھکی ہوتی ہیں، غیر ملک میں جانا پسند نہیں کرتیں۔ طلاق کی رسم مصریوں  
 میں کچھ معیوب نہیں سمجھی جاتی، اور نہ کسی مرد کو طلاق شدہ عورت سے نکاح کرنے میں تامل ہوتا  
 ہے۔ بہت تھوڑے اشیاء میں عورت سے جن کو ایک ہی عورت سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہو،  
 در کثرت سے ایسی عورتیں ہوں گی جنہیں ایک سے زیادہ مرتبہ نکاح کا اتفاق ہوا ہو۔ البتہ مرد و عورت  
 میں طلاق دینے کا دستور کم ہے۔

مصریوں کو زندگی بسر کرنے اور دستوں سے میل ملاقات کے واسطے قہرہ خانہ سب سے عمدہ  
 جگہ ہے۔ ایک دست کی موجودگی میں جتنے حساب آئیں ان سب کے مصارف وہی ادا کرتا ہے جو پہلے

سے قہوہ خانہ میں بیٹھا ہوتا ہے۔ دوستوں کی ملاقات اور باہمی تبادلہ خیالات کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ان قہوہ خانوں میں صبح سے شام تک چل پھل رہتی ہے۔ کچھ مدت پیشتر شرفا قہوہ خانوں میں جانا معیوب سمجھتے تھے، مگر اب یہاں کی نشست زندگی کی روزانہ ضروریات میں اہل ہو گئی ہے۔ مصر میں گدھے بڑے قیمتی ہوتے ہیں اور پاں پاں سو روپے کو بکتے ہیں ان پر نہایت ترکلف زمین کسے جاتے ہیں اور ہر چوک میں صبح سے دس بجے رات تک موجود رہتے ہیں۔ جب کوئی شخص گدھے پر سوار ہوتا ہے تو گدھے والا ایک چابک گدھے کی پیٹھ پر لگاتا ہے اور گدھا دوڑنے لگتا ہے گدھے والا بھی ساتھ ساتھ دوڑتا جاتا ہے۔ یہ سواری مصر میں اس قدر مروج ہے کہ سوداگر اور شرفا گدھے پر پڑھنا کچھ عیوب نہیں سمجھتے، بلکہ عورتیں بھی بے تکلف سوار ہوتی ہیں۔ قاہرہ کے اکثر اہل علم و دانش کے ہاں سواری کے واسطے گدھے موجود رہتے ہیں۔ میں نے دو تین شخصوں سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بیان کیا کہ گھوڑے کے واسطے دانہ لگھا س اور ایک آدمی ملنے دینے کو درکار ہے جس کے مصارف کی میزان ساٹھ روپے۔ ہوار سے کم نہیں ہوتی لیکن گدھے کے واسطے ساٹیس کی کچھ ضرورت نہیں، گھوڑے سے جو اور تھوڑی سی لگھا س اس کی گزران کے واسطے کافی ہے۔

قاہرہ میں علوم قدیمہ و جدیدہ کی تعلیم ہندوستان کی طرح اب تک علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ ازہر میں اس وقت دس ہزار طالب علم درتین سو مدرس موجود ہیں، مدرسوں میں جو شیخ الازہر کہلاتے ہیں، پرنسپل کا درجہ رکھتے ہیں، ان کا مشاہدہ اس وقت ہوا، یونٹیا ایک ہزار آٹھ سو روپے ماہوار ہے۔ اس وقت اس بگڑے پر شیخ حکومت مصر میں

ہندوستان میں عبادت کے لئے، آج ازہر میں فقہ مذکورے ہیں، ایک میں شیخ الرقاق (مذہب) رہتا ہے اور دوسرے میں طلباء اس وقت تین ہندوستانی طلبہ علم رواق ہندی میں رہتے ہیں۔ سرکاری ملازمت میں اگرچہ (جدید) مدرس کے پاس شعروں کو ترجیح دی جاتی ہے، در ہندوستان کی طرح یہاں بھی لوگ روزگار کی خاطر عیسائی مصلحت سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن عموماً باشندگان مصر کا میلان طبع



قدیم تعلیم کی جانب اب تک بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مدارس ابتدائی (کے) کل امیدواروں کی تعداد (۹۸ - ۱۸۹۷) ۱۳۸۱ تھی جن میں ۴۲۷ پاس ہوئے۔ مصری اب تک اعلیٰ تعلیم کے واسطے کوئی کالج قائم نہیں ہوا۔

مصلوہوں نے علمی امور میں جہاں درتقیات کی ہیں وہاں فن اخبار نویسی کو بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ عامہ خلایق میں اخبار بینی کا مذاق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی خبر کا مطالعہ ضرور سمجھتے ہیں۔ قریباً سب دکاندار اخبار خریدتے ہیں۔ درر کی قدر دنی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کسی گھر میں جتنے زیادہ آدمی سمجھے پڑھے ہوں اتنے ہی زیادہ پرچے وہاں آتے ہیں اس وقت خاص قاہرہ میں پچاس کے قریب پرچے نکلتے ہیں گھر میں ذیل میں صفات اخباروں درر سبوں کا ذکر دوں گا جن کے مطالعہ کا ثبوت ملا اور جن کے اڈیسٹروں سے ملاقات کا اتفاق ہوتا رہا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) المومنین: یہ اخبار مصری روزانہ اخباروں میں سب سے بڑا شاندار، باوقعت اور آزاد نگار مانا گیا ہے اور شیخ علی یوسف صاحب کے زیر مہتمم شائع ہوتا ہے اس میں ملک مصر اور مسلمانوں کی ضروریات پر نہایت پر زور اور مدبرانہ آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ اور پھیل مضافین تو اکثر شیخ موصوف کے قلم سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن فرانسیسی اخباروں کے ترجمہ کے واسطے مسعود آفندی اور انگریزی اخباروں کے ترجمہ کے واسطے حافظ آفندی ان کے ذرائع مددگار ہیں۔ یہ حافظ آفندی ہی کی توجہ و قابلیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہندوستان کے توفی و مذہبی کوائف اور مختلف جاسیہ کے حالات مصریوں کے مطالعہ میں آتے رہتے ہیں۔ یوں تو قدرت نے شیخ علی یوسف کے دماغ کو اخبار نویسی کے ساتھ پہلے ہی سے ایک خاص مناسبت رکھی تھی مگر شام، استنبول، ذوالنس و لندن کے سفروں سے ان کے خیالات میں بہت کچھ وسعت و روشنی پیدا ہو گئی ہے، اگر شخص یورپ کی کسی زبان میں یدِ مدوی رکھتے تو ضرور اسے شہ فی زمانہ میں یورپ کے مشہور اخبار نویسوں کے مساوی درجہ ملتا اس اخبار کی آزادی رفتار سے ایک زبان میں سلطان معظم کسی قدر بیدار خاطر ہو گئے تھے اور بلا در ٹکی میں اس کا دخل ہوتا سب در دیا تھا۔ مگر آخر کار اس کی صداقت و راستی کے لئے ۱۸۹۸ء میں برٹش میں نے مصری صحافت پر ایک مسموم کتاب لکھی جس میں خبروں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ

سب قاہرہ میں ہی نکلتے ہیں۔ ان درر میں سے پھر ان کے ذرائع مددگار ہیں۔ یہ حافظ آفندی ہی کی توجہ و قابلیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہندوستان کے توفی و مذہبی کوائف اور مختلف جاسیہ کے حالات مصریوں کے مطالعہ میں آتے رہتے ہیں۔ یوں تو قدرت نے شیخ علی یوسف کے دماغ کو اخبار نویسی کے ساتھ پہلے ہی سے ایک خاص مناسبت رکھی تھی مگر شام، استنبول، ذوالنس و لندن کے سفروں سے ان کے خیالات میں بہت کچھ وسعت و روشنی پیدا ہو گئی ہے، اگر شخص یورپ کی کسی زبان میں یدِ مدوی رکھتے تو ضرور اسے شہ فی زمانہ میں یورپ کے مشہور اخبار نویسوں کے مساوی درجہ ملتا اس اخبار کی آزادی رفتار سے ایک زبان میں سلطان معظم کسی قدر بیدار خاطر ہو گئے تھے اور بلا در ٹکی میں اس کا دخل ہوتا سب در دیا تھا۔ مگر آخر کار اس کی صداقت و راستی کے لئے ۱۸۹۸ء میں برٹش میں نے مصری صحافت پر ایک مسموم کتاب لکھی جس میں خبروں کی تعداد دو سو کے لگ بھگ

اور وقت احترام کو دیکھ کر پھر داخلہ کی اجازت دے دی اور شیخ کو سلطانی تختہ بھی عطا کیا۔ اس اخبار کی روزانہ اشاعت آٹھ ہزار ہے اور سالانہ قیمت دو پونڈ یا تیس روپے ہے۔  
 (۲) اللواء : اس کے مالک اور ایڈیٹر مصطفیٰ بک کامل ہیں جو کچھ عرصہ پیشتر مصریوں کے حقوق کی تائید کے واسطے ہر سال موسم گرام میں داکٹر، لیکن اور پیرس جاتے رہتے تھے اور فرانسیسی زبان میں دھواں دھار لکھ دیا کرتے تھے۔ جنوری ۱۹۰۰ء سے انھوں نے اپنا روزانہ پرچہ اللواء کے نام سے جاری کر دیا۔ اس کی سالانہ قیمت دو پونڈ یا تیس روپے ہے۔

(۳) المقطم : اس اخبار کے ایڈیٹر اور مالک دو شخص یعقوب آفندی اور ڈاکٹر صروت ہیں جو شام کے رہنے والے ہیں اور قدما نے نصاریٰ کی نسل سے ہیں۔ عربی ان کی مادری زبان ہے انگریزی اور فرانسیسی بیروت کے مدرسہ کلیہ (کالج) سے حاصل کی ہیں۔ اخبار نویسی میں ان کی قابلیت مسلم ہے مگر المقطم کی پالیسی انگریزی قبضہ کی تائید کے لحاظ سے اہل مصر کے نزدیک عموماً مسلمانوں کے خلاف اور خصوصاً مصریوں کے سبکی حقوق سے متجاوز ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مصری مسلمان اس اخبار سے متنفر ہیں۔ اس کی قیمت تقریباً ۱۲ پونڈ یا ساڑھے بائیس روپے ہے۔

۱۔ الموید، جو ۱۸۸۹ء میں جاری ہوا، اس وقت کا چوٹی کا روزنامہ تھا۔ جس کے گرد آہستہ آہستہ ایک سیاسی گروپ بن گیا جو ۱۹۰۰ء میں منظم سیاسی رٹنی کی شکل اختیار کر گیا، ”حزب الاصلاح علی النہادی للاثوریہ“ اس کا نام تھا ۱۹۱۳ء میں علی یوسف کا انتقال ہو گیا (علی یوسف اور الموید کے بارے میں ’النار‘ اکتوبر، نومبر ۱۹۱۳ء)۔ انصاف دالادب فی مصر ہرٹمین ”مصر کی عربی صحافت“ ص ۱۸۹ (I : ”آج کا مصر“) کہ مصطفیٰ کامل کا اللواء شروع ہونے کے بعد سارا انجیمیشن کا مرکز ’اللواء‘ اذکار بن گئے۔ اللواء بیسویں صدی کے ابتدائی چند سالوں کی پوری قومی تحریک کا نشان تھا اس سال بعد جب ختم ہوا تو دم پرستوں نے ایک دوسرا اخبار ’العلم‘ نکال دالا اور پھر ’الشعب‘ ۱۹۰۷ء میں اللواء کے گرد جو گروپ جمع ہو گیا، اتحادہ مصطفیٰ کامل کی قیادت میں منظم ہو گیا اس سیاسی پارٹی کا نام ’الحزب الوطنی‘ قرار پایا اور اللواء اس سرکاری پارٹی کا ترجمان۔

اللواء اور کامل کے بارے میں مزید تفصیلات ہرٹمین ”مصر کی عربی صحافت“، ”عبد الرحمن الرافعی“، مصطفیٰ کامل : ”حاجی عبداللہ براؤن“، ”بونا پارٹ مصر میں“ اور موجودہ مصری ”عبد اللہ صلیب تہذہ“ انصاف دالادب فی مصر، I : ”آج کا مصر“

علمی رسالوں میں سب سے زیادہ مشہور المنار، الہدال، المقتطف ہیں۔

مصر میں مفسد اور دریدہ دہن اخبار نویسوں کی موجودگی مندرجہ بالا اخباروں کی عظمت بڑھاتی ہے۔ چنانچہ مصر کی ایک مفسد پارٹی نے ایک اخبار صرف اسی غرض سے جاری کر رکھا ہے کہ اس میں سلطان المعظم اور خدیو مصر کے برخلاف مضمون شائع کئے جائیں۔ عدالت کی جواب دہی کے واسطے ایک نوجوان احمد فواد کو بھپالس رکھا ہے جو اس کا ایڈیٹر کہلاتا ہے۔

اس وقت مصر کے حکمران خدیو عباس صہی پاشا ہیں جو توفیق پاشا مرحوم کے ضعف الرشید اور خاندان محمد علی کے ساتویں فرمانروا ہیں۔ یہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۹۲ء میں تخت نشین ہوئے۔ آپ وقتاً فوقتاً ملک میں دورہ بھی کرتے ہیں جو رعایا کے اصلی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا اچھا ذریعہ ہے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ جمعہ کی نماز مع حشم و قدم باری باری سے مختلف مسجدوں میں ادا کرتے ہیں۔ چوں کہ اس کا اعلان کئی روز پہلے ہو جاتا ہے اس لئے لوگ جوش عقیدت و انقیاد سے سی مسجد میں جمع ہو جاتے ہیں۔ آپ کے مصروف کے واسطے ایک لاکھ پونڈ لاشیاء سوالا کھروپے ماہوار ہے جس کے مصروف زیادہ تر خیرات و خاندانہ رسائی خلائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ خورد و نوش، لباس و دیگر اسباب راحت کے بارہ میں آپ سازگی پسند ہیں اور تکلفات و آرائش سے بالطبع متنفر اکثر سادہ کپڑے زیب تن فرماتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۳۔ المقتطف کھلم کھلا مصر میں نگرانی قبضہ کا حکم تھا، ایڈیٹر شامی عیسائی تھے جو پہلے بیروت سے المقتطف نکالتے تھے۔ جب لبنان کی سرزمین زلزلہ ہو گئی تو مصر چلے گئے اور المقتطف، یہاں سے شروع کئے۔ المعظم، الموتیہ سے چند ماہ پیشتر ۱۸۸۹ء میں نکلتا شروع ہوا اور ۲۰، ۲۵ سال تک قوم پرستوں کے بدترین مخالفوں کا ساتھ دیتا رہا۔ آج کا مصر ”دعوتہ“، ”العصافیر الادب“، ”المنار“، عبدہ کے لاس مت گرد و رشید رہنا ۱۸۹۹ء سے ماہانہ نکالتے تھے، الہدال، جرجی زیدان کا مشہور اخبار نما رسالہ ہے اور المقتطف بغیر نزار و مردوت کا علمی رسالہ۔ ۲۵ مصر کے اس علم سلسلہ کا آغاز، جس کا خاتمہ فائق یزدانی محمد علی سے ہوتا ہے جو یونین کے حملہ مصر کے زمانہ میں عثمانی فوج کے اسانوی سیالار کی حیثیت سے فرانس میں جوں سے جوں کے لئے بھیجا گیا تھا اور وہاں سے سلازہ پہنچ کر وہیں ۵ مارچ ۱۸۰۵ء بروز جمعہ ۱۱ عثمانی مورخ زید کیا۔ ۱۸۹۹ء میں سے انتقال ہوا۔ اس کے بعد عباس سے اس سلسلہ کی تکمیل اور ترمیم کا کام سر کے لئے جاسمین مواتے رہے۔ توفیق کے عہد میں رعایا نے مصر پر قبضہ کیا۔ ۱۸۹۲ء میں توفیق کے انتقال پر عباس علی ۱۸۰۱ء سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔



کارکنان سلطنت کی یہ رائے ہے کہ ہر بالغ نوجوان کا اصلی فرض اپنے ملک کی حفاظت ہے۔  
 بولٹ کا بیس برس کی عمر کو پہنچ جاتے اور تندرست صحیح المزاج ہوا سے فوج میں بھرتی کر لیتے ہیں۔  
 جس شخص کو فوجی خدمت نا پسند ہو وہ بیس پونڈ یا تین سو روپے معاوضہ دے کر بری ہو جاتا ہے۔  
 بعض مذہبی پیشواؤں کی اولاد اعزازی طور پر اس خدمت سے مستثنیٰ کی گئی ہے۔ جو لڑکا تعلیم میں  
 مشغول ہو وہ ہیڈ ماسٹر کی تصدیق پر ایک زمانہ معین تک مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے اور جس نے کسی  
 دینی یا دنیاوی صیغہ کا اعلیٰ امتحان پاس کر لیا ہو وہ مدتِ عمر کے لئے الگ کر دیا جاتا ہے۔ بعض  
 اہل الرائے کا خیال ہے کہ جامع ازہر میں جو طلباء کی اتنی کثرت نظر آتی ہے اس کی وجہ کسی قدر  
 فوجی خدمت کی سختی سے بھی عداوت رکھتی ہے۔

فوجی خدمت سے مفروضہ ہے جو بے اعتنائی برتتے ہیں وہ ان واقعات سے بخوبی ظاہر  
 ہو سکتی ہے کہ بعض لڑکے نتخاب کے زمانہ میں طرح طرح کی دوائیں استعمال کرتے ہیں جو انھیں کمزور  
 و ناتواں بنا دیں بعض لڑکے اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کر لیتے ہیں تاکہ ڈاکٹر انھیں فوجی خدمات کے  
 نا قابل قرار دے سکے۔

جس قدر لڑکے فوجی خدمت کے لئے منتخب ہوتے ہیں ان میں سے ہر شخص کو ایک مقررہ  
 تنخواہ ملتی رہتی ہے۔ چار برس کے بعد ان کو غتب رزیا جاتا ہے کہ خواہ فوجی ملازمت جاری رکھیں  
 خواہ اپنے گھر واپس جا کر کسی دھرم میں مصروف ہو جائیں۔

اس وقت مصری فوج میں ۷۶ ہنگریز فیسر ہیں، اور سپاہیوں کی تعداد ۱۵۱۵۳۲ ہے علاوہ  
 ازیں تین ہزار آدمیوں کی ایک خاص فوج اور، مصر میں قایم کی گئی ہے جس کے تمام مصارف  
 مصری گورنمنٹ کے ذمہ ہیں۔ اس کو عباشا سٹول یعنی فوج قابض کہتے ہیں۔ یہ فوج گویا انگریزی

کے یہ عجیب بات ہے کہ آدمی عدویٰ پہنچے، جب بحر علی میں بی باعلی ہی حار ت ملے ہیں۔ محمد علی کو اپنی سلطنت  
 وسیع تر کرنے کے لئے ہر روز نئی فوج کی ضرورت پڑتی تھی اس عہد کے سیاست کا بیان ہے کہ فوجی ملازمت سے بچنے کے  
 لئے غریب مصری اپنی انگلیاں کاٹتے تھے، اور بعض بعض تو شکرے بولے تک ہو جاتے تھے۔ مائیں اپنے بچوں کو  
 اندھا کر دیتی تھیں یا ہاتھ پیر کاٹ دیتی تھیں۔ لہگ مردم شکاری کرنے والوں کو رشوت دے دے کر اپنے نام مردم  
 شکاری سے شتم کر لیتے تھے (جیمس آگسٹس سیدٹ بن سن ۲۰-۲۱-۲۲-۲۳-۲۴-۲۵-۲۶-۲۷-۲۸-۲۹-۳۰-۳۱-۳۲-۳۳-۳۴-۳۵-۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱-۵۲-۵۳-۵۴-۵۵-۵۶-۵۷-۵۸-۵۹-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۴-۶۵-۶۶-۶۷-۶۸-۶۹-۷۰-۷۱-۷۲-۷۳-۷۴-۷۵-۷۶-۷۷-۷۸-۷۹-۸۰-۸۱-۸۲-۸۳-۸۴-۸۵-۸۶-۸۷-۸۸-۸۹-۹۰-۹۱-۹۲-۹۳-۹۴-۹۵-۹۶-۹۷-۹۸-۹۹-۱۰۰)

قبضہ مصر کی تائید کے لئے متعین اور صرف انگریزی نوادہ کی محافظ ہے۔

انگریزی نگرانی کہنے کو تو صرف مالی نگرانی ہے، مگر عملی طور پر ہر محکمہ کے انتظام میں انگریز داخل ہیں۔ برنجوز میں یہ شریک ہوتے ہیں، ہر کارروائی کی نگرانی کرتے ہیں، فوجی معاملات ان کے زیر اثر ہیں، خزانہ شاہی پران کا اقتدار ہے یہ

مصریوں کے انگریزی قبضہ کی نسبت خواہ کیسے ہی خیالات ہوں، لیکن انگریزوں کے آنے سے ملک کی حالت میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کا اثر ایک سیاح کی طبیعت پر اس اعتبار سے بہت مستر انگیز پڑتا ہے کہ انتظام کے ہر عہدہ دار ہر حصہ میں ترقی دکھائی دیتی ہے۔ اس حسن انتظام کا بڑا حصہ لارڈ کرومر ٹیش ایجنٹ کی عملی لیاقت کا ممنون ہے۔ ان کا اس وقت مصر میں یہ رعب اثر ہے کہ کبھی کسی غیر کو نصیب نہیں ہوا۔

اس وقت مصر میں بس قنصل موجود ہیں۔ اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کی طرف سے بھی ایک مقرر ہمیشہ مصر میں مقیم رہتا ہے۔ با فعل اس منصب جلیل پر غازی احمد مختار پاشا مقرر ہیں، درجی شان و تمکنت سے ترکی اثر و اقتدار کو متحسٹ ہوتے ہیں۔

۱۸۸۲ء میں اعرابی پاشا کی قیادت میں مصریوں نے آزادی کے لئے جنگ لڑی اور ہار گئے، برطانوی قبضہ مکمل ہو گیا اس کے باوجود برطانیہ کھلے طور پر اس کا اعلان نہ کر سکا۔ برائے نام حاکمیت عثمانی خلیفہ ہی کی جلتی رہی جس کا قانونی نشانہ خدیو مصر تھا۔ لیکن انتظامی امور میں سارا عمل دخل انگریزوں کا تھا۔ سارے اہم کلیدی عہدے انگریزوں کے سپرد تھے۔ ہر مصری وزیر کی نگرانی کے لئے ایک انگریز مشیر تھا اور وزیر چل کر خدیو کے لئے خود برطانوی ایجنٹ مشیر خاص کی حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نبطہ سربا کل لگتے تھے لیکن وہ حکومت کرنے والوں پر براہ راست حکومت کرتے تھے۔ توجہ سیدی سادی قلی اس طرح وہ مصریوں کو ٹرننگ سر جے تھے۔ (کردم: مصر جدید حصہ دوم) : کالون ص ۴۹۔ ۵۰۔ سنڈنی لو ص ۲۰۰۔ ۲۰۱ : (کوہن ص ۱۸۶) لارڈ کرومر ۱۸۸۳ء سے ۱۹۰۷ء تک برطانوی ایجنٹ کے فرائض انجام دیتے رہے رعب و دبہ کا دائمی یہ عالم تھا کہ عام مصری کرومری کو مصر کا بادشاہ کہا کرتے تھے۔ تہ مختار پاشا مصر کی تاریخ میں اس وقت نمودار ہوئے جب حکومت عثمانیہ اور برطانیہ کے درمیان مصر سے برطانوی فوجوں کے انخلا کی بات چیت چلی اور ایک مرحلہ میں اگر کافی سید ہو گئی کہ معاملات طے ہو گئے، یہ ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۸ء کے درمیان عرصہ کی بات ہے۔ مختار پاشا عثمانی نائندہ تھے۔ آخر میں سکے انگلستان نے تو معاہدہ پر دستخط کر دئے سلطان عبدالحمید کچھ دوسری طاقتوں کے ہدائے میں آئے در بات ختم ہو گئی۔ لیکن ختم ہو کر بھی مختار پاشا کو اپنی یادگار تصویر کسی جو اسی زمانہ سے مصر میں ترکی کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے قیام پذیر رہے۔ (ڈانسی: خدیویت کی کہانی)

## مغربی علوم و فنون پر اسلام کا اثر

موسیٰ فضیل الرحمن عثمانی (فاضل دیوبند)

ضروری تو نہیں ہے کہ جو قوم سیاسی اعتبار سے غلام ہو اس کو ذہنی و فکری لحاظ سے بھی غلام کہا جائے لیکن عموماً ہوتا ہی ہے کہ کسی قوم کی، ذہنی مغلوبیت اس کے ذہنی و فکری انحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

مسلمان بائبل کل کچھ قسم کے حالات سے دوچار ہیں اگر ہمیں سیاسی و مادی اعتبار سے آزاد بھی ہیں تو ذہنی اعتبار سے وہی غلامی ان کے ہر گوشہ حیات میں کارفرما نظر آتی ہے وہ مغرب کی متعین کردہ راہوں پر چلتے، مغرب کے دماغ سے سوچتے اور مغرب ہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اپنی تہذیب، ثقافت، ترقیات کو بھول کر مغرب ہی کو اصل معیار زندگی مان بیٹھے ہیں، سلامی عمل و عمل و قرآنی معیار کو چھوڑ کر مغرب کی تقلید کر رہے ہیں اور غیر شعوری طور پر یہ مفروضہ بن میں جا گزیں ہو چکا ہے کہ جو مغرب کہتا ہے وہی حق اور وہی صحت و درستگی کا اصل معیار ہے لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ مغرب کی یہ قابل رشک ترقی خود مسلمانوں ہی کی مہموں منت ہے، یہ موجودہ روشنی اسی چراغ کی ہے جو کبھی خود مسلمانوں نے روشن کیا تھا۔

آسمان چوہا قنابِ سلام کے طلوع ہونے سے پہلے جہاں ست کی تاریکی میں رہا ہوا تھا اور گویا منتظر تھا کہ سلام کا درخشاں آفتابِ حق مشرق سے طلوع ہو اور تمام ظلمت و تاریکی کو نور سے بدل دے، وہاں کی سیاسی زمین اس بات کی محتاج تھی کہ اسلام کا ابر کر م اٹھے اور اپنے فیض و عطی کی بارش برسائے۔ ہل چورپے جہاں عربوں کے یا کینہ تمدن سے بہت کچھ حاصل کیا وہیں غلوں نے ان کے بے پایاں علم و فن سے بھی خوشہ حبشی کی ویران کی موجودہ ترقی کی بنیادیں بوں ہی کے علوم و فنون پر استوار رہیں چنانچہ ایک مغربی مصنف ”گسٹیوڈیو کوٹری“ اپنی کتاب ”تاریخ تمدن“ میں لکھتے ہیں۔



”عدیوں تک عربوں نے ترقی کی تاریخ میں ہم بالشان خدوات انجام دیں وہ نہ صرف ایشیا کے دور دراز ملکوں میں علم کی اشاعت کرتے رہے بلکہ یورپ کو بھی ایسے علوم سکھاتے جن سے مغربی اقوام نے بڑا فسخ حاصل کیا۔

اسی سلسلہ میں مسٹر اسٹینلی لین پول“ Stanley Lane Poole - کی رائے بھی پیش کرتا ہوں۔

”مختلف علوم و فنون میں جیسی ترقی اسپین کے مسلمانوں نے کی تھی کسی دوسرے ملک یا قوم نے نہیں کی۔ انگلینڈ، فرانس، جرمنی سے طلباء اس چشمہ سے سیراب ہونے کے لئے آتے تھے جو صرف اسپین کے شہروں میں بہتا تھا۔ اندلس کے طبیب و جراح تمام دنیا سے لگے تھے۔ علم ریاضی، ہیڈرت، نباتات، فلسفہ اور فقہ کی تکمیل صرف اسپین میں ہو سکتی تھی۔ زراعت، آب پاشی، قلعہ بندی، جہاز سازی وغیرہ میں بھی وہاں کے مسلمان اعلیٰ درجہ پر تھے۔

کیا تاریخ بھول سکتی ہے؟ کہ گھڑی سب سے پہلے ”ڈنکس“ کے شہنشاہ ”شارلین“ کو ایک مسلمان بادشاہ کی طرف سے بھیجی گئی تھی اس سے ظاہر ہے کہ گھڑی کی ایجاد مسلمانوں سے ہوئی۔ لیکن دسویں صدی میں حالات نے کروٹ لی اور ایک نیا انقلاب رونما ہو ”پاپائے روم“ کی ترغیب پر یورپ بیت المقدس کو فتح کرنے کے لئے جنگ میں مصروف ہو گیا جس جنگ کے دوران اہل یورپ نے عربوں کے اخلاق اور تمدن کا بخیر اور ذریعہ مطالعہ کیا اور اپنی بارائیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں عربوں کی برتری کا اندازہ ہو چکا ہے۔ یورپ کے علمی و فکری تقدیم کا آغاز ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن وسطیٰ میں یورپ نہ صرف علمی و فکری حیثیت سے تہی دامن تھا بلکہ مذہبی حاف سے بھی پوری طرح دیو یہ ہو چکا تھا، مذہبی رہنماؤں نے باغیوں دین عیسوی کی اصلاح قدریں مسخ ہو چکی تھیں۔۔۔

”پاپائے روم“ غیر محدود راجت کا مالک ہو کر تھا اس نے نہ خیرات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیک شہر قلعہ کے عوض ”معافی نامہ“ تقسیم کیا۔ قدرتی طور پر حافی نامہ دوزخ سے نجات اور جنت میں اقلہ کا ایک پرواغیا نہ ٹھیکٹ تھا۔ لیکن اہل یورپ نے ”جنت“ اس کی تعیبات اور

”قرآن مجید“ کی خوبیوں کا مطالعہ کیا تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، پایائے روم کے جابرانہ اختیارات ان کے لئے باعث نفرت بن گئے آخر کار کافی جدوجہد کے بعد یہ لوگ ایک ”آزاد مذہبی فرقہ“ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے جہاں تک میرے علم میں ہے سب سے پہلے اس مذہبی انقلاب کا تصور ”لوٹر“

Author (پروٹسٹنٹ) Protestant فرقہ کا بنی اور ”کالون“ (جینیوا کا

مشہور خطیب کا لوترزم کا بنی) کے ذہن میں پیدا ہوا۔ ”لوٹر“ نے اطالوی درس گاہوں میں جہاں عربی فلسفہ کا درس دیا جاپا کرنا تھا تعصیم پائی اور اسے قرطبہ غرناطہ کے علمی حلقوں سے بھی استفادہ کی نسبت آئی جو اس زمانہ میں عربی فلسفہ کی تعصیم کے مرکز تھے ہر حال لوٹر اور کالون کا یہ ذہنی انقلاب سلامی تعلیم ہی کا مہم جو منت تھا۔

علوم و فنون عربوں کے تمدن سے مل پڑے مذہبی تصورات ہی میں ایک خوش گوار انقلاب نہیں پیدا ہوا بلکہ ان کے تعصیم اور فنی ذہن میں بھی ایک نئی فخر تہذیبی رزنا ہوئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب روم و یونان کی شاندار ترقی معدوم ہو چکی تھی ان کی علمی تصنیفات اور فنی کاوشیں نسبتاً بن چکی تھیں تو دوبارہ عربوں ہی نے ”افس جات تو بخش“ یونگسن کالج لندن کے بی کے پروفیسر مسٹر ”اچ۔ اے۔ سلیمین۔ سی آئی ایم“ ”سلطنت عرب کا راج و زوال میں سمجھتے ہیں۔

”اس مادہ میں نئی روح پھونکنے کا ذمہ منہ لوں کو حاصل ہے یہ عرب ہی تھے جنہوں نے گم شدہ یونانی مصنفین کو دنیا سے روشناس کرایا، ان کے علمی و شمع روشن کی جس نے تاریخ کے سیاہ صفحات کو چمکادیا، درحقیقت اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تاریخ اتنی شاندار نہ ہوتی۔

مثلاً یہ ہے کہ قوموں کی علمی ترقی کی ابتدا تصنیفات کے بجائے عموماً راجح و تالیفات سے ہوتی ہے عربوں نے اس میں بھی گہری دلچسپی لی اور ترجموں کی بدولت سہولت و سہولت درونانی مصنفین کو زندہ جاوید بنایا۔

”پختال“ لکھتا ہے۔

”حقیقۃ الامون کے دور میں روم و یونان کے تاریخی تراجم زمانہ ترمہوئے جن کی اصل تصنیفیں سے قبضہ کر کے

بغداد لائی گئی۔

الجبر | چنانچہ یہاں تھوں نے ”یزدانی فلسفہ“ کو ترقی دی وہاں الجبرے میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے مغربی  
عصفیہ نے اس کا عتراد کیا ہے۔

”لجوارزمی کی تصنیفات نے اہل یورپ کے لئے الجبرے کے نکات حل کرنے میں رہبر کا کام دیا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۶ صفحہ ۵۹۷)

پکھتال لکھتا ہے ”الجبر مسلمانوں کی ایجاد ہے“ ————— موجودہ علم کیمیا ”ابو موسیٰ جعفر  
کوئی“ کی وسیع تحقیقات کا نتیجہ ہے۔

ہدایت | علم الجبر، ریاضی، اور کیمیائی وح سلم ہیئت بھی عربوں کا زریہ احسان ہے اس سلسلہ  
میں احمد بن محمد ————— حسن بن سینہ در محمد بن زوسی کے نام خاص طور پر لئے جاتے ہیں علم ہیئت  
عرب اپنے ساتھ اسپین میں لائے درخشہ میں ”ابو اسحق زردانی“ نے اس میں کچھ جدوں دانشکالی  
اختراع کیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۲ ص ۸۰ مطبوعہ ۱۹۷۱ء)

نور دین کا موجد غموہ ”گلیلیو“ کو سمجھا جاتا ہے نہیں حقیقت یہ ہے کہ اس کا موجد ابو الحسن تھا۔  
کلام یورپ میں یہ ایک عام خیال ہے کہ علم کلام کا موجد لارڈ بکن (Lord Bacon) ہے  
چنانچہ ”ہسٹری آف دی انگلش“ میں ٹامسن (Thompson) نے بھی لارڈ بکن ہی کو  
علم کلام کا موجد قرار دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ علم کلام کی بنیاد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ڈالی ہے اور  
یہ بات یقین کی حد تک سب سے کہی جاسکتی ہے کہ امام غزالی کی وفات کا زمانہ بکن کی پیدائش سے  
تقریباً سو برس پہلے ہے بہت ممکن ہے کہ لارڈ بکن نے آٹا اس علم کو امام غزالی سے لیا ہو اور بعد میں اس  
کو موجد بنا لیا ہو چوں کہ بکن اپنی زبان جانتا تھا اور امام غزالی کی تصانیف اس وقت تک  
میں منتقل ہو چکی تھیں۔

تاریخ | ابتداً تاریخ صرف واقعات کی فہرست نوی نوعیت کا نام تھا اس کے سب سے پہلے موضوع  
بحث نہ تھے ”تاریخ“ اس عیون میں باقی رہی اور اب اس کو ایک فن کی حیثیت ہے۔  
دی در واقعات کے سبب اس سے بحث کرنے لگے ”مقری“ کی تصانیف میں فن تاریخ سے



نقوش نظر آتے ہیں عرب مؤرخین کی یہی پوشیدہ دلیل یورپ کے لئے چراغِ راہ نہیں۔۔۔ علمِ سیاست کی بنیاد عرب مؤرخین کے ان ہی خیالات پر رکھی گئی ہے۔ دنیا کا مشہور ترین مؤرخ ابن خلدون اس کا اہم ہے جس کی تصانیف سے مل یورپ کے بہت کچھ خوشہ چینی کی ہے۔

جغرافیہ تجارت نے عرب سیاحوں میں "جغرافیہ دیسی" کا شوق پیدا کیا اور وہ اپنے سفر کے واقعات قلمبند کرنے لگے یہ واقعات اگرچہ ذاتی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان کی دوسری نوعیت جغرافیائی ہے یہ کہتے کہ یہ سفر نامے ہی علم جغرافیہ کی بنیاد بنے۔ مثال کے طور پر ابن بطوطہ کا سفر نامہ بہت سے شہروں اور ملکوں کا جغرافیہ ہے اور اس کے پڑھنے سے ہم متغیر مقامات کی جغرافیائی پوزیشن جان سکتے ہیں۔ ہوں کے قدم اندس پہنچے تو یہ نہ نہ ہم جیزی کا بندہ زار بن گیا اور سیسی میں کارہنہ زارا تھا جس کا جغرافیہ فنی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے مل یورپ ایک زمانہ تک ادرسی کے جغرافیہ سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں ادرسی نے ۱۱۵۵ء میں جغرافیہ لکھی۔ ادرسی کا جغرافیہ تقلیدی نہیں تحقیقی تھا عوامانہ تحقیق و انکشاف کے بہت سے نقشے بھی تفصیل کے ساتھ درج کئے جس نے ادرسی کے جغرافیہ کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ "کیمفٹن"۔ ہوں کی جغرافیہ انی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "عرب اپنے دور کے عظیم ترین سیاح، ماہر، ناویا، مشرک، شہسوار، سفر لکھنے کے حامی تھے جس سے سفر کرتے تھے وہاں کا نقشہ تیار کرتے تھے، نیز اس خطہ کے سیاسی، سماجی اور اور داری حالات لکھتے تھے اور اسکولوں میں تعلیم پسندانہ سے ہوتی تھی۔"

(مذکورہ - The Cultural Legacy of Islam)

امام ابو جبرائیل نے اس زمانہ میں ترقی پزیر دنیا کا ہر گوشہ سیر کیا اور ہر جگہ پر سفر کیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے اس نے اسی زمانہ میں ترقی پزیر دنیا کا ہر گوشہ سیر کیا اور ہر جگہ پر سفر کیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے اس نے اسی زمانہ میں ترقی پزیر دنیا کا ہر گوشہ سیر کیا اور ہر جگہ پر سفر کیا۔

یہ سائنس فنِ جہانت کے نام سے تھے اس زمانہ میں جن نے بہت سے آلات جراحی ایجاد کئے تھے جراحی میں اس کی مدد سے انہیں آج بھی کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شہادت ہے، اور ان کے کتبے

کون بھول سکتا ہے جس نے اس فن میں پتہ جو ہر کمال دکھایا۔

آپریشن سے پہلے سُن کرنے کی دردِ عربوں کی ایسا ہے۔ زخم کو بستی مانگوں سے سینے کا رواج عربوں نے دیا۔ موتیا بند، پتھری اور فتن جیسے امراض کا علاج آج سے بہت پہلے عرب اطباء دریا کر چکے تھے۔

مسلمانوں نے ایسے شفا خانے قائم کیے جس میں امراض کے اعتبار سے طبقہ دار مریضوں کو رکھا جاتا تھا اور عسائی ستمی کا مکمل انتظام ہوتا تھا۔ (اسلام کہ ثقافتی پہلو (از کچھ سال) ص ۱۱)

یہ چند عبرت آموز تاریخی حقائق اُس مدتِ خواہدہ کی دعوتِ بیداری دیتے ہیں جو کبھی تشنگانِ علوم کے لئے سیرانی کا سرچشمہ تھی اور اب خود تشنگانِ تہذیب، وہ قوم جس سے غریبوں نے اندازِ جہان بینی سیکھا تھا آج اپنی بے عملی و جمہور کی بنا پر اسیرِ غلامی ہے۔

”عمرہ آباد اور ارباب“

۹

• خالق کائنات کا فرمان کیا ہے ؟

• قرآن کا پیغام کیا ہے ؟

• احادیثِ رسولؐ میں کیا جواہرِ ریزے چھپے ہیں ؟

• زندگی کے معاشی، سیاسی و معاشرتی مسائل کا صحیح حل کیا ہے ؟

• امن و فلاح کس نظامِ سیاست میں مضمر ہے ؟

• دنیا کو کس شتم کے گردِ زنجیرِ ضرورت ہے ؟

• عالمی فساد و انتشار کے اسباب کیا ہیں ؟

• اگر آبن سونوں کا جو بے مروت گناہ جہنم میں تو آج ی

ماہنامہ

ہفت روزہ

رام پور، یو۔ پی

(دہلی زبان میں)

کے مستقل خریدارین اس کی اشاعت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی

اکتوبر ۱۹۵۸ء کا پہلا شمارہ اشاعت ۲۵۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۵۸ء کو ہو گا۔

بجائے دیگر نمبر کے بارے میں تفصیلات دہلی سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

سابقہ چندہ

نیو کپی

۲۰۰ پیسے

(۱۰ روپے)

کاشت

رام پور، یو۔ پی

# فارسی و اردو کی چند کم یاب کتابیں

## کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں

(جناب نثار احمد صاحب فارسی)

(۲)

۲۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو مولانا الطاف حسین حالیؒ کی سوانح نگارش میں بہت کم اس حقیقت سے الطاف حسین حالیؒ کے والد کا نام خواجہ ایزد بخش سے ان کا سلسلہ نسب شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری (۸۹۵ھ - ۹۰۶ھ) سے ملتا ہے۔ حالیؒ کی پیدائش بقول خود تقریباً ۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔ پانی پت ضلع کرنال کے محلانصاریان میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ ”سادات شہد پور“ کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ حالیؒ نے بے منابطہ طور پر تعلیم حاصل کی لیکن وہ اردو، فارسی اور عربی میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں یادگار غائب، حیات سعدی، حیات جاوید، مقدمہ شعر و شاعری اور مسدس تدویر اسلام از مدہ جاوید ہیں۔ حالیؒ نے بیک وقت اردو میں تنقید کی روایت منسکھ کی، شاعری کے فرسودہ ساچوں کو توڑا، مسلمانوں میں تعلیمی سررمیوں کا احساس پیدا کیا، اردو میں سائنسی اور سلاست کو رائج دیا، اور شاعری میں حب الوطنی اور قوم پروری کے جذبات پیش کئے۔ اس طرح وہ گویا اردو ادب کا ایک انقلابی دور میں ان کی ذات سے کسی عہد شروع ہوتے میں کئی روایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ شاعری میں انھوں نے غائب اور سیفیت سے استفادہ کیا۔ جدید اردو شاعری ہانیؒ کی حالیؒ کو سمجھا جاتا ہے سب سے پہلے ہی اور فید حسین آزاد نے موضوعاتی نظمیں کہیں۔ ۱۸۷۰ء میں وہ پنجاب کے نگر تعلیم سے وابستہ تھے ۱۸۷۵ء میں اننگلو عربک کالج دہلی میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۱ء میں ملازمت سے استعفا دے دیا۔ ۱۹۰۴ء میں کس احکا کا خطاب بھی ملا۔ تنویر پور ماہوار جہد آباد سے وظیفہ خدمات علمی کے صوبے میں ملتا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں ملازمت کیے رہے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۱ء کو ۷۷ برس کی عمر میں انتقال فرمایا (مطابق ۱۳۱۳ھ) انا بیتہ وان ابیہ راجون۔ پانی پت میں مدفون ہوئے۔ حالیؒ پر مزید مطالعے کے لئے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ رسالہ اردو جلد ۳ و ۳۳ - ۲۔ حیدر جمہور - ۳۔ کمرہ عالی : علامہ عبدالحسین

۴۔ داستان تاریخ اردو : علامہ حسن قادری - ۵۔ تذکرہ غائب : ملک رام

۶۔ زمانہ کاپور : حالی نمبر ۷۔ مقدمہ شعر و شاعری : تہذیب و فکر و حیدر قریشی

۸۔ - Jamil Ahmad - ۹۔ مطالعہ حالی : شجاعت علی سندیلوی - ۱۰۔



سے واقف ہیں کہ مولانا نے حکیم نامہ خسرو کے سفر نامہ کو مرتب کر کے شائع کرایا تھا صاحبہ عابد حسین کی کتاب ”یادگار حالی“ کا دیباچہ لکھتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی طرف توجہ دلائی تھی انہوں نے خود بھی یہ کتاب نہیں اس کا اشتہار دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :

”خواجہ صاحب کی علمی خدمات کے سلسلے میں ایک کتاب کا ذکر رہ گیا ہے یعنی حکیم نامہ خسرو کے سفر نامہ کی تصحیح اور اشاعت۔ حیات سعدی کا پہلا ایڈیشن جو دہلی میں چھپا تھا میرے کتب خانے میں ہو گا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے ٹائٹل پیج پر اس سفر نامے کا اشتہار چھپا تھا اس سے معلوم ہوا کہ حیات سعدی سے پہلے یہ کتاب چھپ چکی تھی۔“

دل تو کسی نے حالی کے علمی کارناموں کی فہرست بتاتے ہوئے اس کتاب کا نام ہی نہیں لکھا اور جنہوں نے لکھا وہ بھی اس کتاب کو دیکھنے کے مدعی نہیں۔ یوسف فیصلہ حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں حالی کی ”تصانیف نشریہ ترتیب تصنیف“ درج کی ہیں (ص ۵۴۶-۵۴۷) لیکن ”سوانح عمری حکیم نامہ خسرو“ کے اجد لکھا ہے کہ ”اب نایاب ہے۔“

دوسری بار یہ اصل سفر نامہ ۱۹۱۱ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے ترجمہ ہو کر مرحلہ شش و ثقیفات کے شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ مولانا عبد الرزاق کابینوری مصنف ”البرکۃ“ و ”نظام المسطورسی“ نے کیا تھا۔ اس میں ۱۷ صفحات کی فہرست مضامین (ص الف تا س ۱۱۸) صفحات پر مقدمہ و خاتمہ اور ۱۵۶ صفحات میں متن کا ترجمہ پھر صفحہ ۱۵۷ سے صفحہ ۲۲۳ تک ”حواشی سفر نامہ متعلق مصادر و روایات ہر حکماء و علماء وغیرہ ہیں۔ سائز وہی ہے جو انجمن کی کتابوں کا ہوتا ہے۔“

یہ سفر نامہ سب سے پہلے تصانیف حسین حالی نے ۱۳۳۱ھ میں ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا جو ۱۰۶۷

لے حکیم نامہ خسرو کے سفر نامہ پر چونکہ مقدمہ بہت جامع ہے : ہر باب تک اردو خواں حلقہ کے سامنے ہیں : اس کی جامعیت و وفاداریت کے پیش نظر ہم اس کا اردو ترجمہ آئندہ قسط میں پیش کریں گے شاء اللہ۔ مرتب

سید یادگار حالی : صاحبہ عابد حسین ع

سائز پر دو قسم کے کاغذ پر چھپایا گیا تھا۔ "قسم اول کی فی جلد ایک روپیہ اور قسم دوم کی فی جلد بارہ آنہ قیمت" تھی۔ سرورق کے آخری صفحے پر "The travels of Nasir Khwerau" کا اشتہار یا تعارف انگریزی میں بھی تھا۔

اس سفرنامے کا ایک نسخہ کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں محفوظ ہے۔ جس کے سرورق کی عبارت ہے:

## هوالمستحق

سفرنامہ حکیم ناصر خسرو معلوی، المتضمن حالات سفر ایران و ارمینہ و شام و فلسطین و عراق

و عرب و مصر واقع ۱۲۳۷ھ

مع

سوانح عمری مصنف

رقم زدہ جناب مولانا خواجہ محمد سلطان حسین صاحب، حالی مدرس اول سنہ مشرق ۱۲۸۶ھ

عربک اسکول دہلی۔ حسب فرمائش جناب منشی محمد یعقوب علی صاحب

۱۸۸۲ء

در مطبع اخبار خیر خواہ ہندوستان، تمام ہا زائن طبع گردید

حسب ضابطہ رجسٹری نمودہ شد

"س ۱" سے اس کا مقدمہ، عنوان، سیرت حکیم ناصر خسرو، صاحب سفرنامہ، رقم

زدہ کلک گہ سلک جناب مولوی نذیر محمد الطاف حسین صاحب، انیسویں پانی پتی مقیم دہلی تخلص

بہ حالی سلمہ، زبان فارسی میں سے اور عبارت تک پھیلا ہوا ہے۔ ص ۳۳ سے "سفرنامہ

ناصر خسرو معلوی ۱۲۹۹ھ" شروع ہوتا ہے جو ص ۳۳ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ص ۱۳۵ سے "خاتمہ"

ہے جس میں محمد یعقوب علی نے لکھا ہے کہ۔

"اگرچہ مسلمان تباہوں نے عربی زبان کا اثر سفرنامے لکھے ہیں، لیکن اندلس کے ہاں جو

سیاح اپنے سفر کے حالات لکھتے تھے ان کی کمال تندر دانی کی جانی تھی مگر فارسی زبان میں قدیم

زمانے کا کوئی سفر نامہ اس کے سوا نہیں دیکھا گیا۔ یہ سفر نامہ بھی نہایت نامور الوجود تھا صرف  
حالی جناب متطابق نے ابصار الدین احمد خاں صاحب بہادر کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا وہاں سے  
لے کر فرانس کے ایک نامی مصنف چارلس شیفر صاحب نے اس کا ترجمہ اپنی زبان میں شائع کیا ہم  
نے بھی یہ چاہا تھا کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے مگر چون کہ آٹھ سو برس کی تصنیف اور اس کی طرز  
تحریر خود ایک ایسی یادگار چیز تھی جس کا ہل و طن کو دکھانا ضرور تھا اس لئے مناسب معلوم ہوا  
کہ مصنف کی اصل زبان ہی میں اس قدیم سفر نامے کی اشاعت کی جائے۔ نامہ خسرو نے نام سے ہمارے  
ہم وطن بہت کم واقف ہیں لیکن تمام ممالک ایران اور ترکستان وغیرہ میں وہ علی درجہ ہا حکیم اور اعلیٰ درجے

۱۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں شیرخشاں، نواب احمد بخش خاں رستم جنگلی لوہارو، وزیر دربار پورچمبر کے صاحبزادے تھے۔ مغل تاسم جان دہلی میں مستقل قیام رہتا تھا جو ان کے جد امجد علی کے نام سے منسوب ہے۔  
نواب صاحب کی نشست گاہ وہ تھی جس میں سراج کل روزنامہ المجبوتہ دہلی کا دفتر ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے چار فرزند اپنی یادگار چھوڑے تھے ایک بیوی سے نواب مرزا خاں داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں تھے جو ولیم فریر ریڈنٹ دہلی کو قتل کرانے کے الزام میں پھانسی یا گئے تھے (۱۸۳۵ء) دوسری بیوی سے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔ احمد بخش خاں نے جب ریاست اپنے فرزندوں میں تقسیم کی تو فیروزپور چمبر کے نواب شمس الدین احمد خاں کے حصے میں آیا اور لوہارو موخر الذکر دونوں بھائیوں کو ملا۔ لوہارو کی ریاست میں حصہ کے عوض اُن میں ۸ ہزار سالانہ سرکار انگریزی کے خزانے سے ملتے رہے۔ نواب ضیاء الدین خاں کی تعلیم تربیت میں غالب بھی دل چسپی لی تھی انھوں نے مولانا افضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین خاں زردہ اور مولوی کریم اللہ علیہ السلام سے کسب علوم کیا۔ فارسی میں غالب اور اردو میں غالباً مومن سے اصلاح پتے تھے بقہ نفسہ، منطق اور ادب کے علاوہ نجوم، حدیث، تاریخ اور خرافات میں کافی دست کستے تھے۔ ان کا کتب خانہ بڑا دار تھا سیکس سو غلامیں راج ہوگا غدر کے بعد جو کتابیں جمع کیں ان کا کچھ حقد بن ندوة اعلیٰ لکھنؤ میں محفوظ ہے۔ رخشاں کا کلام "جلوۃ صحیفہ زیریں" کے نام سے ن کے فرزند نواب محمد الدین احمد خاں نے جمع کر کے ۱۹۱۵ء میں طبع کر دیا تھا اس میں اس سے حالات زندگی بھی شامل ہیں۔ اس کا بھی ایک نسخہ کتابخانہ النش کاہ ۲۰۵ ملی میں محفوظ ہے نواب ضیاء الدین سے ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۴۷ مطابق ۲۷ جون ۱۹۲۹ء بروز شنبہ نقشبندہ اور یکاہ عشرت شوال بدھ صوبہ سندھ اختیار کاکی رحمت علیہ میرا اپنے ویدماجد کے ہیومی مدون ہوئے از مستحب ۱۰۰۰ ضیاء الدین ۱۰۰۰ و تاریخ ہے جس سے ۱۳۰۲ھ برآمد ہوا ہے۔ تفصیلی حالات کے لئے مدح خطہ مولانا عبدالباقی صاحب ملک رام ص ۲۸۵ تا ۲۹۰ - جلوۃ صحیفہ زیریں، اردو کرغاب خزائن



کا شاعر اور صوفی، ناجائز ہے اور میادت کے سبب اس کی اور بھی زیادہ تعظیم کی جاتی ہے۔ اگرچہ کتب  
تواریخ و سیر میں اس کے اکثر حالات افسانے کے طور پر لکھے گئے ہیں مگر شہسوار عرصہ سخن دانی فارس رضائے  
نکتہ پروری حضرت مولوی محمد الطاف حسین صاحب حالی نے تمام حالات خود اس کے کلام سے  
اخذ کر کے لکھے ہیں اور کوئی بات بغیر کافی ثبوت کے تحریر نہیں فرمائی سب سے زیادہ حکیم صاحب کا حال تذکرہ  
آتش کدہ اور تذکرہ دولت شاهی میں لکھا گیا ہے مگر حضرت ممدوح کی تحقیقات سے ناظرین کو واضح ہوگا  
کہ ان تذکروں میں کس قدر کم بیان تشنگی اور اطمینان کے قابل تھا حق یہ ہے کہ جناب موصوف نے آٹھ سو  
برس بعد حکیم مغفور کو از سر نو زندہ کیا اور اس کی لائف پر جو بے شمار پردے پڑے ہوئے تھے وہ بالکل  
اشعادیت میں۔ امید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس عزیز الوجود کتاب کی جو مولوی صاحب ممدوح کی  
تصحیح سے طبع ہوئی دل سے قدر کریں گے۔ خاکسار محمد یعقوب علی " (صفحہ ۱۳۱)

اس تعارف کے بعد اسی صفحہ ۱۳۱ پر "قطعہ تاریخ از تنبیح فکر سبذ نواب ضیاء الدین احمد خاں بہار  
رئیس لوہارو متخلص بہ نیتہ" درج ہے وہو ہذا ہے

سفر نامہ ناصر خسرو است کہ گردید طبع اندرین روزگار  
بہ تصحیح و تحریر دیباچہ اش پیرداخت حالی حکمت شعار  
بود سال اتم طبع کتاب "سفر نامہ ناصر ہوشیار" ۱۲۹۹ھ  
ناصر خسرو کے حالات میں خانی نے جو ۲۲ عنفوں کا مقدمہ فارسی میں لکھا ہے وہ اب تک اُن کے کسی مجموعہ مضامین  
میں شامل نہیں ہوا ہے۔ اُن کی فارسی نویسی کا مختصر نمونہ اور اس عمل کا اردو ترجمہ "حالیات" سے  
دیکھیں رکھنے والوں کے لئے آئندہ پیش کیا جائے گا۔

تذوین حدیث از مولانا سید مناظر حسن سیلانی۔ حدیث کی کتابت و تدوین اس کی شرعی  
حیثیت و ہمیت اور اس کے متعلق تمام مباحث پر نہایت تحقیق و تفصیل سے لکھا

دینی معنویات کا خزانہ  
صفحات ۲۸۴  
قیمت ہے  
مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی  
۵۸

# لَا رِبَّكَ

## غزل

(جنابِ آلم منظرِ نگرہی)

زمانہ زندگی سے بڑھ کے بے تابانہ ملتا ہے  
جسے فیضِ نعل سے ذوقِ دردِ ایشان ملتا ہے  
پے تسکینِ شہتِ جہیں کیوں صحر کو دیوانے  
نہ سمجھو رانگاں بربادیوں کو محفلِ غم کی  
دکھا دیتا ہے ہر پردے سے چشمِ شوق کو جلوہ  
مجھے کیوں زندگی اس منزلِ ہستی میں لے آئی  
یہ ہے اک جرأتِ بے ضابطہ ساقی سے کیا پوچھوں  
جسے ہر سینے والا جانتا ہے دستوں اپنی  
بتا دے بادہ نوشوں کو یہ تیرا فعلِ بھسائی  
خودی پر در بھٹیں جس کی مستیِ درِ اناغی میں  
نان ٹوٹے ہوئے محرابِ زرد کو رنگاں بکھو  
نگاہِ غور سے دیکھا جو میں نے بزمِ مہستی کو  
بہاریں تھا پنے لے گئیں داغِ محبت کو  
نتیجہ سجدہ بے ضابطہ کا اور کیا ہوتا

بڑی مدت میں دیوانے سے جب دیوانہ ملتا ہے  
اسی کو دو جہاں میں منصبِ شہانہ ملتا ہے  
انہیں نگاشن کے ہر ذرے میں اک دیوانہ ملتا ہے  
یہاں اب بھی نشانِ منزلِ پرانہ ملتا ہے  
وہ ملتا ہے تو ہر عالم میں آزادانہ ملتا ہے  
یہاں تو ہر نگاہِ صورتِ بیکانہ ملتا ہے  
بھری محفل میں خاکیوں مجھ پیہ نہ ملتا ہے  
لبِ ہستی پہ ایک سیاح بھی تو فنا نہ ملتا ہے  
یہاں آنے پہ ہر دمِ داؤدِ مینا نہ ملتا ہے  
وہ بادہ آج بھی پیہ نہ در پیہ نہ ملتا ہے  
انہیں سے تو توبتِ سمیتِ درد نہ ملتا ہے  
ہر اک عشرت کدے کے ساتھ تم خازنتا ہے  
کہاں بے حریفِ نصرتِ غم خانہ ملتا ہے  
حرم کو ڈھونڈتا ہوں دردِ رختِ ملتا ہے

جو ملتا ہے آلم سے شہتِ دشتِ ناک میں ملے

اسی جنگل میں وہ پیغمبرِ ویرانہ ملتا ہے

## تبصرے

۱۔ میری آف دی فریڈم موومنٹ جلد اول | تقطیع کلاں نثر مت ۶۳۰ صفحہ ۱۰  
 ٹائپ بھی اور روشن قیمت جلد ۳۹ روپیہ تہ :- دی بورڈ آف ڈسٹریس منسٹریز کراچی ہاؤس  
 سوسائٹی کراچی ۔

حکومت پاکستان نے ۱۹۵۲ء میں ایک بورڈ اس غرض سے قائم کیا تھا کہ ہندو پاک  
 برصغیر میں درنگ زیم گیری کی ذمہ داریاں سے ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان تک  
 سلسلہ خزانہ آر دی کے جوہر جہد کی جس کی تاریخ مرتب کی جائے۔ بورڈ آف ڈسٹریس  
 کے خاکہ کے مطابق تاریخ پانچویں میں مرتب ہوئی۔ زیر تبصرہ کتاب سی سلسلہ کی پہلی جلد  
 ہے جو ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک جاری ہوئی۔ اس میں حضرت سید احمد شہید کی شہادت تک کے  
 واقعات پر مشتمل ہے۔ اس جلد میں ہیں بواب ہیں جن کو ہندو پاک کے مستند اور مشہور اساتذہ  
 تاریخ ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر اشفاق حسین، ڈاکٹر شیخ عبد الرشید، مولوی خلیق احمد نظامی،  
 ڈاکٹر عبد الجبار، ڈاکٹر معین الحق، ڈاکٹر ریاض ماسد، ڈاکٹر احمد بشیر، جناب رشید اختر ندوی،  
 ایم تقی فضل داؤد، مرزا علی احمد، ڈاکٹر عبد الباقی، مرزا رفیع صاحب نے لکھا ہے جیسا کہ اصل  
 صدر بورڈ نے اپنے مقدمہ میں کہا ہے۔ چوں کہ اس جلد کی ترتیب و تدوین سے اصل مقصد مسلمانوں  
 کی جدوجہد آزادی و سرس کے محرکات کو واضح اور نمایاں کرنا ہے اس بنا پر اس میں اگرچہ ترتیب  
 وار وہ تمام سبب سی و سبب واقعات بیان کر دئے گئے ہیں جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک پیش  
 آئے رہے لیکن زیادہ تفصیل سے تحریکات و تحریکات کے بانیوں کے حالات و سوانح  
 کو بیان کیا گیا ہے جن کا تعلق برہ راست جدوجہد آزادی سے ہے۔ چنانچہ شاہ دی اللہ  
 اندھلوی، حمد شاہ آبدانی، ٹیپو سلطان، اور حضرت سید احمد شہید کے سوانح بیان اور



ن کے کارناموں پر مستقل مستقل دو درباب ہیں ان کے علاوہ مفید سلطنت کے زوال کے علامات - اورنگ زیب عالم گیر کے جانشین - سکھ، مرہٹے، نوابان اودھ، رومیلیہ - اصف جاہ - اور ایسٹ انڈیا کمپنی پر ایک ایک مستقل باب ہے شروع میں ڈاکٹر ڈیشی نے ایک طویل مقالہ میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر قیام پاکستان کی تاریخ - ہندو مسلمانوں کے تعلقات، تہذیبی اور سماجی حالات - مختلف تحریکات سیاسی و مذہبی پر ایک تبصہ ہے۔ یہ ذرا اپنے نقطہ نظر سے اس دور کے تاریخی واقعات و حوادث کی تفسیر کی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں سب سے پہلی کوشش ہے جس میں تاریخ ہند کے ایک خاص و بڑی جامعیت اور تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا و جس میں ۱۰۰ قوت کے ساتھ ان کے تہذیبی و سماجی موثرات و عوارض کو دیدہ وری اور بصیرت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے اس کا مباحثہ کوشش پر بورڈ آف انٹرنیشنل لائٹس بارک باد ہے امید ہے اس سلسلہ کی باقی جلدیں بھی جلد شائع ہوں گی۔

**احکام سلطانیہ** | تقطیع متوسط ضمیمہ ۵۳۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر - قلم - مجلد چھ درپے پتہ :- محمد سعید انڈسٹریز ناشران کتب - قرن محل - مقابل مولوی مدد خانہ کراچی۔  
 علامہ ابوالحسن مودودی کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" اہل علم میں کافی مشہور و مقبول ہے جس میں اسلامی نظام حکومت یعنی حکومت کی تشکیل، اس کے اغراض و مقاصد، اس کے مختلف شعبے، ان کے حدود و عرصے، ذرائع و مصارف آمدنی، حدود و تعزیرات، وغیرہ ان سب امور کو واضح و صریح بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ اصل کتاب عربی میں تھی اس لئے اہل علم ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اب اردو کے مشہور اہل قلم مفتی انجم الدین صاحب سہابی نے اس کو سلیس، و خوشفہ اردو میں منتقل کر دیا ہے تو اردو خواں حضرات بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔  
 موجودہ زمانہ میں کتب کے موضوعات بحث کی جہاں اہمیت ہے اور جہاں پاکستان میں وہ نمایاں ہے اس سے امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

از پروفیسر رشید احمد صدیقی - تقطیع متوسط صفحات ۱۹۲ صفحات -  
آشفہ بیانی مری کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سے غیر مجلد عمارتہ سرسید بک ڈپو  
 شمشاد بلڈنگ - علی گڑھ۔

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے خود علی گڑھ کے تعلق سے اپنی جو سرگزشت علی گڑھ  
 میگزین کے خاص نمبروں میں مختلف مضامین کی شکل میں شائع کی تھی وہ اس کتاب میں یک جا  
 جمع کر دی گئی ہے۔ علی گڑھ رشید صاحب میں اس طرح رہا اور بسا ہوا ہے کہ جب کبھی وہ علی گڑھ  
 کی زندگی کے کسی ایک پہلو پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تحریر میں ایک خاص قسم کی توانائی اور طرنگی پیدا  
 ہو جاتی ہے چنانچہ یہ کتاب بھی رشید صاحب کے چند خاص شاہکاروں میں شامل ہونے کے لائق  
 ہے اس میں علی گڑھ کی اجتماعی، تہذیبی، اور تمدنی زندگی کے بہت سے رخ اور اس زندگی کے جو  
 حضرات عناصر ترکیبی تھے ان کے خصائص اور حالات زندگی بڑی خوبی سے بیان ہو گئے ہیں اگرچہ اس  
 کتاب کو علی گڑھ کی تاریخ نہیں کہا جاسکتا تاہم ادبی حیثیت سے اور بعض خاص تاریخی معلومات کی  
 وجہ سے یہ کتاب علی گڑھ کی دیباچہ میں ایک قیمتی اضافہ ہے میرے کہ ارباب ذوق اس  
 کی قدر کریں گے۔

سہل قواعد تجوید تقطیع خرد، فنی مرت ۵۹ صفحات، کاغذ و طباعت معمولی

قیمت ۸، پتہ منبند قذافیہ معتمد ہی، رکیٹ حیدر آباد دکن۔

چوں کو تجویہ کے قواعد سے سادہ من سبت پیدا کر دینی ضروری ہے کہ صحیح طور پر قرآن پاک  
 کی تلاوت کے قبل ہوج میں اس مقصد کے پیش نظر مذکورہ بار کتاب بھی لگی ہے۔ اس میں تجوید کے  
 عام و ضروری مسائل کو آسان زبان میں مناسب ترتیب سے بیان کیا گیا ہے کہ بچے بہ سہولت ان  
 قواعد کو یاد کر سکیں۔

کتاب کے مؤلف سید حکیم اللہ حسینی پروفیسر فنیہ معتمد ہیہ ہیں جن کو تجوید و قرآن سے بھی د  
 عمی بہت شغف ہے۔ فنیہ معتمد ہیہ سرچ سرتیس کے نام سے چھپی تھی دوبارہ س فنیہ

کی ترویج کے خیال سے انھوں نے اپنی کتاب کا ایک ضمیمہ شائع کیا تھا اب اسی ضمیمہ کو ضروری ترمیم اور مفید اضافہ کے بعد سہل قواعد تجوید کے نام سے شائع کیا ہے۔

کتاب صرف دو باب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں قرآن پاک کی تعلیم و تعلم کی فضیلت اور فن تجوید کی تعریف و تعارف کے بعد دس فصوں میں مخارج حروف، صفات حروف، لام جلالہ وغیرہ، قواعد راء، نون ساکن و تنوین، میم ساکن و میم نون مشدد، ہائے ضمیر، مد و قصر، وقف و ابتداء کے مسائل بیان کئے ہیں اور ہر فصل کے اخیر میں مشقی سوالات بھی درج ہیں۔ باب دوم متفرق فوائد و مسائل پر مشتمل ہے۔ تجوید کے ابتدائی درجوں میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

علماء ہند کا شاندار ماضی | تقطیع خورد - ضخامت ۴۰۴ صفحے، طباعت و تالیف دیدہ  
ہندوستان جلد ۱۲ | زیب قیمت مجلد ہے، پتہ :- الجمعۃ بک ڈپو تاسم جان  
ہندوستان مسلمان و تحریک آزادی | سٹریٹ دہلی - مسلمانہ مولانا سید محمد میاں صاحب ناظم  
جمعیتہ علماء ہند۔

اس سلسلہ کی پہلی جلد ۱۹۳۹ء میں شائع ہو کر نکلی تھی۔ یہ کتابوں کا مجموعہ جس کو چلی ہے اس کا شمار انیس سہل کے بعد دوسری جلد ۱۹۵۴ء کے وسط میں شائع ہوئی ہے جس میں مسند فقہ علامہ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دوران کے خانوادہ عالیہ کے تجوید سے سب سے زیادہ مہارت و تنقید کے حیدر تاریخی بیرونی کو بڑی جامعیت سے واضح فرمایا ہے۔ یہ کتاب کو عملی جامہ پہنانے میں جن عظیم شخصیتوں نے اپنے پیار و فرعن شائستہ میں انھوں نے حقیقتاً تاریخ تجوید کے میں ان کے مجاہدانہ کارناموں اور انقدانی اقدامات کے سلسلہ میں تاریخی حقائق کو متبذیر کرنا کر محترم مصنف نے ملک و قوم کو اپنا مرہون منت بنالیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید مولانا اسی علی شہید دوران حضرات کے اعوان و نصرت کی تقدیر نیگزینوں کے علاوہ انھوں نے صدی عبسوی کے سب سے بڑے حوالے سے متعلق بہت سے جزئیات اس مقدس شخصیت میں ایک جامع نظر نے دی ہے۔

لکھنؤ اور جنگ آزادی | تقطیع خورد - ضخامت ۶۶ صفحے، کاغذ و طباعت بہتر قیمت پر  
پتہ - ادبی اکیڈمی نیو گاؤں لکھنؤ

۱۹۵۴ء کی تحریک آزادی کی صد سال یادگار کے موقع پر مختلف زبانوں میں چھوٹی بڑی کتابوں اور مقالات کی شاعت ہو چکی ہے۔ زینب جگر کتاب سی سلسلہ کی بک بڑی ہے جو دراصل خود ہے



چند ایسے مقالات کا جن کا مقصد تحریک آزادی میں لکھنؤ کے حصہ کو واضح کرنا ہے۔ مقالات سنجیدہ، ور پر از معلومات ہیں لکھنے والوں میں ڈاکٹر نور الحسن، شیخ تصدق حسین، عبداللہ مدخل، جمیل، ور خان مجیب برزی کی شخصیتیں ہیں۔ یہ مجموعہ آزادی وشن کی اس تاریخ کو ایک کتب کے سلسلہ میں مفید اضافہ اور ادبی اکیڈمی کی ذیل قدر پیش ہے۔

## ماہنامہ ”فاران“

کا

## معرکہ اعظم الشان ”خلافت نمبر“

فاران کے دو خاص شمارے (سیرت نمبر اور توحید نمبر) ادبی انشاء اور دین و اخلاق کی تاریخ میں ایک مثال قائم کر چکے ہیں۔ اب فاران کا تیسرا شمارہ خاص خلافت نمبر، بھی اسی آن بان اور اہتمام کے ساتھ دسمبر ۱۹۵۷ء میں آ رہا ہے۔

خلافت نمبر میں انجمن اور نازک مسائل پر بڑے جاندار بلکہ فیصلہ کن مقالے ہوں گے خلفائے راشدین کی مقدس سیرت کی درخشانی سے ایک ایک درق تابناک بحلافت نمبر کے مقالے پڑھ کر ہر صاحب انصاف اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ صحابہ کرام کی محبت ایمان کا تقاضا اور صفائے قلب کی دلیل ہے۔ اسلامی تاریخ کے ہزاروں صفحات کا دل نشین خلاصہ :-

لکھنے والے :-

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد اسحق سندیلوی، حافظ مجیب ت ندوی، ڈاکٹر تمیم الدین (پیرس)، مولانا عامر عثمانی (مدیر تجلی)، امتیاز علی خاں عرشی رام پوری، ڈاکٹر زبید احمد، غیمہ صدیقی، ڈاکٹر محمد احمد صدیقی، پروغیسر عنیار احمد بدایونی، ابو محمد، ام الدین رام برزی، مولانا نجم الدین احیائی، مداح احمدی، سید حسن ریاض، ضیاء الدین احمد برنی، پروغیسر عبدالرشید فضل، ایوب قادری ریلی، (اے) پروغیسر سردار احمد میٹھ ناتھ رام راجہ،

### ان کے علاوہ :-

مدیر فرین رہبر انشائی کا معرکہ آراء نقش اول، شہزادی یاس، اور نظریوں کا نمبر تھی، شہزادہ یاس، شہزادہ یاس، قیمت چار روپیہ اور وصول ڈاک، مستقل خریہ ارض جیا کون مجاہد (چھ روپیہ) تھیں ان میں خلافت نمبر ہے گا۔

رہبر مد فرین یاس، رچی میا، کست

مدیریت کے زیر نگرین، دفتر محنت، رام پور، (یو پی)

# بُرْہَانُ

جلد ۴م

شمارہ ۵

نمبر ۵۸۹ مطابِق ربيع الثانی ۱۳۷۸ھ

## فہرست مَصنایِ مین

نظرات  
علیؒ

۲۵۸ سعید احمد اکبر آبادی

جناب ڈاکٹر طہ حسین صاحب

۲۶۱ مہرجن مولا تاج محمد صاحب تھانی

جناب ڈاکٹر خورشید احمد فارق صاحب

۲۷۷ ات داد بیات عربی دہلی یونیورسٹی

جناب پروفیسر ڈاکٹر ڈبلو، سی، اسمتھ

۲۸۵ مترجم ضیاء الحسن صاحب فاروقی ایم۔ اے

۳۰۱ جناب عابد رضا صاحب بیدار

۳۱۱ جناب شاعر احمد صاحب فاروقی

۳۱۸ جناب آتم منظر نگری

۳۱۹ (سب) (م)

صرف تاریخ کی روشنی میں  
عربی کی ایک قلمی کتاب ہے

تاریخ ہند پر نئی روشنی

اسلام ان موڈرن ہسٹری

ایک باب کا ترجمہ

مصر سے انیس سو میں

ایک اور معاہدہ و تائید

فارسی دُرد کی چند کم یاب کتابیں

(کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں)

ادبیات غزل

تبصرے

# ظلمت

گذشتہ مہینہ پاکستان میں بوسیا سی انقلاب ہوا ہے۔ وہ اگرچہ ایک عظیم انقلاب ہے جس کے اثرات و نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں۔ لیکن حیرت انگیز ذرا نہیں۔ کیوں کہ ملک کی سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی خود غرضی و نفس پرستی کے باعث پاکستان کو کبھی کوئی مضبوط حکومت میسر آ سکی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کے تمام شعبوں میں نظم و اختلال کا دور دورہ ہو گیا۔ رشوت ستانی اور فرض شناسی عام ہو گئی اور ملک پر اس صورت حال کا یا اثر ہوا کہ لوگوں کے اخلاق بگڑ گئے۔ بددیانتی اور خیانت روزمرہ کا مشغلہ ہو گیا۔ اور ہوائے نفس کا اتباع و طیفہ حیات بن گیا۔ ان حالات کے پیش نظر باب بصیرت پہلے سے سمجھتے تھے کہ کسی نہ کسی قسم کا کوئی فوجی انقلاب ضرور ہوگا۔ جیسا کہ آئین کے دوسرے ملکوں میں ہو چکا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور راکٹور کو اس اندیشہ کی تصدیق ہوئی لیکن انقلاب جس پر اس طریقہ پر ہوا ہے اور اس سے عوام کی زندگی پر جو فوری طور پر خوش گوار اثر پڑا ہے اس کی وجہ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ انقلاب اسی نوع کے ان دوسرے انقلابات سے یکسر مختلف ہے۔

پاکستان میں فوجی حکومت کے قیام کے بعد سے اب تک لاکھوں کی تعداد میں جو ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی چیزیں برآمد ہو رہی ہیں ان کے اعداد و شمار انتہائی حیرت انگیز اور ایک مسلمان سائنسی کے لئے بے حد افسوسناک ہے۔ نتیجتاً ان رشتم میں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ فساد کس طرح معاشرہ کی رگت میں سرایت کر گیا تھا، اور اس پر آپریشن کرنے کی کس قدر سخت ضرورت تھی لیکن یہ ظاہر ہے کہ آپریشن سے صرف مادی فساد کا خراج ہو جاتا ہے لیکن زخم کو مندرجہ کرنے اور آپریشن کی وجہ سے جسم میں توجھن پیدا ہوتا ہے اس کی تلافی کرنے کے لئے مختلف قسم کی تدبیروں اور دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ پاکستان میں فوجی حکومت یہ دور ابتدائی اور بالکل عبوری دور ہے



جس کے پیش نظر مستقبل کے لئے ابھی کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی۔ اس سے گزرنے کے بعد پاکستان کو اپنے مستقل نظام حکومت کے مسئلہ پر غور کرنا ہوگا اور اُس وقت ہی دنیا فیصلہ کر سکے گی کہ موجودہ فوجی انقلاب پاکستان کے حق میں کس حد تک سیاسی استحکام اور اندرونی امن عافیت کا باعث ثابت ہو سکا اور اُس نے بین الاقوامی سیاست کے دربار میں ملک کو کون سا مقام اور مرتبہ دیا ہے۔

بہر حال ایشیا کے رباب فکر و نظر کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیے کہ آج آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس خطہ ارضی کے اکثر ملکوں نے عہدِ حاضر کی مروجہ جمہوریت کے راستہ کو چھوڑ کر ڈکٹیٹر شپ یا اسی قسم کے دوسرے نظام حکومت کو پسند کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایشیائی ملکوں نے آزاد ہوتے ہی امریکہ اور برطانیہ کی نقالی میں اپنے لئے بھی وہی نظام حکومت پسند کیا جو ان ملکوں میں رائج تھا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ کوئی پھل خواہ کتنا ہی لذیذ اور خوش ذائقہ ہو ہر ملک کی بے ہوا میں پھل نہیں سکتا۔ ایک ایسا نظام حکومت جس میں فیصلے دوٹوں کی اکثریت پر مبنی ہوں صرف اسی ملک میں امن و امان اور خوش حالی کا باعث ہو سکتا ہے جس کے عوام تعلیم یافتہ ہوں اپنے مسائل کا صحیح شعور رکھتے ہوں۔ اور جو ملک قوم کے مفاد پر ذاتی اغراض کو ترجیح نہ دیتے ہوں۔ چنانچہ آج برطانیہ اور امریکہ میں یہ نظام جمہوریت کامیاب ہے تو اُس کی وجہ یہی ہے کہ ان ملکوں میں تعلیم عام ہے۔ یہاں کے عوام بھی بیدار و مغرور و روشن خیال ہیں اور ان کو قومی زندگی کے ساتھ پوری دلچسپی ہے۔

لیکن اس کے برخلاف ایشیائی ملکوں کے عوام کا حال کیا ہے؟ ان میں تعلیم کا کیا تناسب ہے؟ انہیں ملکی اور قومی مسائل کے ساتھ کتنی دلچسپی ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جیند خود غرض قسم کے لوگ عوام کے جذبات کو غلط طریقہ پر اپنے ساتھ لے کر ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو جاتے ہیں اور اپنے شخصی اغراض اہوا کی خاطر ان لوگوں کے راستہ میں ہتھکنڈاں در دشواریاں پیدا کرتے ہیں جو ایمان داری و خلوص سے ملک اور قوم کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر جمہوریت عوام کے حق میں رحمت ہونے کے بجائے زحمت ثابت ہوتی ہے۔ اور ملک میں پراگندگی عام ہوتی ہے۔

اس لئے کسی ملک میں نظم جمہوری کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کو تسلیم کر کے اُتار کر کے اُن میں ایسی خود داری۔ خود اعتمادی پیدا کی جائے کہ وہ اربابِ عرض کا آلہ کار نہ بنیں۔ اُن میں ایسا دیدہ، متیا ز پیدا ہو کہ وہ بے عرض خادمانِ ملک اور عرض مند لیڈروں میں ملک کے نفع و نقصان میں، حق اور باطل میں تمیز کر سکیں اور ان قومی کیرکڑ اس درجہ بلند ہو کہ بددیانتی اور خیانت کو کسی حالت میں بھی گوارا نہ کر سکیں۔

ماہِ ربیع الاول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یومِ ولادت کی تقریب یوں تو ملک کے طول و عرض میں سیکڑوں ہزاروں جلسے اور کانفرنسیں ہوتے ہیں۔ لیکن اس مرتبہ گزشتہ مہینہ ادارہ اسلامی پانی پت کے زیرِ اہتمام خاص ہمارا جہ پٹیا کے محل میں سیرت النبی کا جو عظیم الشان جلسہ ہوا وہ اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے خاص طور پر لائقِ ذکر ہے۔ یہ جلسہ تین روز تک رہا۔ اور ہر جلسہ میں ساٹھ ستر ہزار سامعین شریک ہونے رہے جن میں مسلمان مشکل سے چار سو پانچ سو ہوں گے۔ باقی سب ہندو اور سکھ ہی ہوتے تھے جسوں میں مسلمان علما اور زعماء کے علاوہ ذریعہ عظیم پنجاب اور ہمارا جہ پٹیا کے بھی تھے۔ یہ ہوئیں اور بعض اہل علم مسلمان جو اس کانفرنس میں شریک تھے اُن کا بیان ہے کہ یہ دنوں تقریریں محض رسمی نہیں تھیں، بلکہ سرورِ عالم کے لئے قلمی و تحریمی کی آئینہ دار تھیں۔ کانفرنس کے ختام پر ہمارا جہ پٹیا نے پُر زور الفاظ میں کہا کہ ”اس قسم کی کانفرنس ہر سال ہونی چاہیے۔ اور ہوتی رہے گی، کانفرنس کے اخراجات بھی تقریباً سب کے سب برادرانِ وطن نے ہی برداشت کئے۔“

## تدوینِ حدیث

از مولانا سید منائر الحسن گیلانی۔ حدیث کی کتابت تدوین اس کی شرعی حیثیت و اہمیت اور اس کے متعلق تمام مباحث پر ہدایت تحقیق و تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ دینی معلومات کا خزانہ۔ صفحات ۸۸ قیمت پچیس۔ - - - - - مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

علیؑ

## صرف تاریخ کی روشنی میں

ڈاکٹر طہ حسین کے قلم سے

مترجم

(مولانا عبدالحیہ رحمان خان)

مصر کے شہرہ آفاق ادیب، محقق ڈاکٹر طہ حسین نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؑ کے عہد خلافت پر دو مبسوط اور محققانہ کتابیں لکھی تھیں، ان کتابوں میں تاریخی واقعات کا تجزیہ جس خاص انداز سے کیا گیا ہے اس اثر بھی ہونا چاہیے تھا کہ دنیا کے سدرم میں ان کی دھوم مچ گئی اور ناقدین نے اپنے اپنے مذقے میں ان پر خوب، خوب ظہار رائے کیا، یہ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر طہ حسین ہمارے دور کے ایک ایسے مورخ ہیں جن کے قلم میں شوخی و سفاقت، درز و در بیان کے ساتھ جرأت، آزادی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس قدر فی تصور پران کے سلوب و تدبیر میں وہ احتیاط باقی نہیں رہ سکتی تھی جو خلافت راشدہ اور عہدِ خلفائے راشدین کے بیان میں مولوی چاہیے، اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں اپنے رنگ میں بکتا ہیں اور ان میں بہت سے نازک درپاز۔ مرآ اہل کما غیبیہ، اب دارانہ اور مورخہ زبائر لیا گیا ہے۔ مولانا عبدالحیہ رحمان خان جو جدید عربی زبان کے استاد ہیں اور عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی عہدہ سنبھال رہے ہیں، ان میں ”عثمانؓ صرف تاریخ و متن ہیں“، ”زبیرؓ تھا جس کے بہت سے ابواب“ ”برہان“ میں بھی شائع ہوئے تھے، مولوی رحمان نے یہ کتاب



”علیٰ صرف تاریخ کی روشنی میں“ کا ترجمہ بھی مکمل کر لیا ہے اور قدیم روایات کے مطابق اس کے بعض خاص اور اہم ابواب کا ترجمہ سب سے پہلے ”برہان“ کے لئے مرحمت فرمایا ہے، مید لھنی چاہیے کہ پہلی کتاب کی طرح دوسری کتاب بھی جلد شائع ہوگی۔ ”برہان“

## مسلمان، حضرت عثمانؓ کے بعد

حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد مسلمانوں کو وہ ایسی شہنائت ملیں درپیش آئیں جن کی صدیق اکبرؓ کے عہد سے کر اب تک کی مشکلات میں کوئی مثال نہیں ملتی، ایک مشکل کا تعلق خود منصب خلافت سے ہے اور دوسری نظام کے برقرار رکھنے اور قاتلوں و فسادیوں کو اللہ کے حکم کے مطابق سزا دینے سے متعلق ہے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد کے دن شام ہو چکی تھی اور مسلمانوں کا کوئی امام نہ تھا جو ان کے معاملات کا منتظم، ان کے نظام کا نگران و ان کے اقتدار کا کامیاب، اللہ کے احکام ان میں جاری کرنا، اور ان سب کاموں کے بعد وہ اس عظیم الشان حکومت کے معاملات پر نظر رکھتا جس کو صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے قائم کیا تھا اور عثمانؓ نے جس کے حدود مغرب و مشرق تک پھیلا دیئے، اس لئے کہ یہ مفتوحہ مقامات اور علاقے جہاں بھی مسلمانوں کا اقتدار پوری طرح قائم نہ سکا تھا اس کے محتاج تھے کہ کوئی انھیں سنبھالے، وہاں کے نظام میں تبدیلی اور مصیبتیں پیدا کرے، اور ان کی سرحدوں کو بہت دور کر دے جو متعین ہونے نہیں پائی تھیں اور نہ رات بوجہ کرے۔ یہ عہد سے مسلسل فتوحات کی بنا پر تخریب پھیلی کہ اتنے میں فتنہ و فساد کا دور آگیا اور مسلمان دھرم توجہ ہو گئے، یہاں کہنے لگے مسلمانوں کی ایک جماعت فتوحات سے ہٹ کر فتنوں میں مشغول ہو گئی۔ اسلامی فوجوں کا پورا دسرحدوں پر اس طرح رہا کرتا کہ آج بھی کل گئے بڑھیں، ان فوجوں کا کام صرف یہ نہ تھا کہ فتوحات حاصل کریں بلکہ مفتوحہ سرزمین میں امن کا اجرا بھی انھیں کام تھا وہ پہلا پرانا اقتدار ختم کر کے اس کی جگہ نیا اقتدار قائم کرتی تھیں، پھر نظام میں ایک طرف فاتحین کے

مذاج کے مطابق کچھ اعتنائے کرتیں، دوسری طرف مفتوحین کی طبیعت اور افتاد کی رعایت سے پہلے نظام کی کچھ باتیں باقی رکھتیں، ان اسلامی فوجوں کو اس کی ضرورت تھی کہ مزید فوج اور ساز و سامان سے کوئی ان کی امداد کرتا رہے، پلان بتائے اور ضرورت کی ہر چیز ان کے لئے فراہم کئے۔ ظاہر ہے کہ جن ہاجرا اور انصار نے صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ اور شہید حضرت عثمانؓ کی میت کی تھی ان کے دامن پر حضرت عثمانؓ کے خون کا کوئی دھبہ نہیں تھا تو لبصرہ، کوفاورہ کی سرحدوں پر مقیم فوجوں میں سے بعض ٹولیوں کا کام تھا اور بعض ان دیہاتیوں کا جو ان ٹولیوں کے ساتھ ہو گئے اور کچھ ہاجرا وادے بھی اس کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے اس سلسلہ میں عانت کی۔

بڑے بڑے ہاجرا اور انصار صحابہ اس حادثے میں تین مختلف خیال کے تھے، زیادہ تر تو ایسے تھے جو صورت حال دیکھتے، رنجیدہ ہوتے، اصلاح کا ارادہ کرتے لیکن کچھ نہیں نہڑتی اور کھڑے یا بے نیازی سے نہیں بلکہ مجبوری اور بے چارگی سے خاموشی اختیار کر لیتے، کچھ صحابہ ایسے تھے جن پر معاملات اچھی طرح کھل نہ سکے انہوں نے خیریت اسی میں دیکھی کہ فتنے سے دور گوشہ عافیت میں جا بیٹھیں اور غیر جانبدار رہیں ان تک اللہ کے رسول کی رہنمائی پہنچے تھیں جن میں فتنوں سے ڈرایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے، چنانچہ کچھ تو خانہ نشین ہوئے اور بعضوں نے مدینہ کی سکونت چھوڑ دی کہ اپنا دین اپنے ساتھ لئے لوگوں سے دور رہیں کچھ صحابہ ایسے تھے جنہوں نے نہ گوشہ عافیت میں جانا پسند کیا اور نہ اپنے کو بے چارگی کے حوالے کرنا بلکہ وہ حضرت عثمانؓ اور ان کے مخالفین کے درمیان میں کھڑے ہو گئے، بعضوں نے خلیفہ کی خیر خواہی کرتے ہوئے کوشش کی کہ باغیوں اور خلیفہ میں مصالحت کرادی اور بعضوں نے حضرت عثمانؓ سے شدید اختلاف کیا اور ان سے اپنی انتہائی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ان کے خلاف لوگوں کو ابھارا، ان سے دشمنی پر آمادہ کیا اور بعضوں نے ایسا طرز عمل اختیار کیا جس کا مطلب کم سے کم یہ نکلتا ہے کہ انہوں نے نہ باغیوں کو برا سمجھا اور نہ ان کو مقابلہ کرنے سے روکا۔

پھر جب حضرت عثمان قتل ہو گئے تو اکثر صحابہ بری طرح متاثر ہوئے کہ وہ خلیفہ کی کچھ مدد نہ کر سکے، اب انہوں نے مستقبل پر غور کیا اور تہیہ کر لیا کہ اپنے معاملات اور آئے والے واقعات کا مقابلہ کریں گے، گوشہ عافیت میں چلے جانے والوں نے کنارہ کشی میں اور شدت پیدا کر لی، اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اپنی روش پر قائم رہے گناہ میں شرکت نہیں کی اور فتنے سے بچائے گئے، اب رہے دوسرے حضرات تو وہ انتظار کرنے لگے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اپنے اوپر اعتماد کرتے ہیں یا کسی لیڈر کی پناہ لیتے ہیں اور مسلمانوں کا کوئی مقررہ نظام محفوظ شکل میں یا تحریر کی صورت میں تو تھا نہیں جس کے مطابق منصب خلافت جب وہ خالی ہو، پُر کر لیا کریں وہ تو ایسے مواقع پر جس طرح بن پڑتی اس خلا کو پُر کر لیا کرتے تھے۔

آپ کو معلوم ہے کہ صدیق اکبرؓ کی بیعت کس طرح ہوئی آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ فاروق اعظمؓ کس طرح اپنی بیعت کو ایک تفریق معاملہ ذیل نے میں جس کے ذریعے اللہ نے مسلمانوں کو فتنے سے بچایا، آپ کے بھائی مخفی نہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے اور مسلمانوں سے ایک بات کہی اور مسلمانوں نے اس کو مان لیا، نہ کسی کو ناگوار ہوئی نہ کسی نے جھگڑا کیا، ہاجرین میں سے بعضوں نے خود صدیق اکبرؓ سے کچھ دے دے کر ناچا ہی نہیں آپ نے ان کو یہ جواب دیا جس سے وہ مطمئن ہو گئے، اس کا بھی آپ کو پتہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں کی بلکہ اس کے لئے چھ ہاجرین کی ایک مجلس شوریٰ بنادی جن سے اللہ کے رسولؐ زندگی بھر راضی رہے، ان میں سے حضرت عثمانؓ کا انتخاب ہوا جس سے کسی نے اختلاف نہیں کیا، پھر حضرت عثمانؓ نے بھی کسی کے لئے کوئی ہدایت نہیں کی اور اگر وہ فرماتے بھی تو لوگ ان کی بات نہیں مانتے اس لئے کہ وہ ان سے، ان سے دسیہ ستیوں سے وزن کے گورنروں سے واقعات کی بنا پر راضی تھے۔ پھر یہی سب نظر رہے کہ حضرت عمرؓ نے جن چھ عیہ کو یہ بھی مشورہ کی بدست کی تھی حضرت عثمانؓ کے بعد وہ چار ہی رہ گئے تھے اس لئے کہ عبدالرحمن بن عوفؓ کا عثمانی خلافت کے دوران ہی میں انتقال ہو چکا تھا پس سعد بن ابی وقاصؓ، زبیر ابن العوامؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ اور علیؓ



ابن ابی طالبؑ باقی رہ گئے تھے، ان چاروں میں بھی سعد بن ابی وقاصؓ نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لہذا کل تین ہی رہ گئے تھے، مزید برآں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سابق خلفاء کی بیعت کرنے والے بہت سے صحابہ اب مدینہ منورہ میں معلطے کے وقت موجود نہ تھے کچھ لوگ تو ارتداد کی لڑائیوں، اور روم و فارس کی فتوحات میں شہید ہو چکے تھے اور کچھ سبوروں پر اللہ کی رحمت کو پہنچ گئے تھے ایک جماعت جس میں جہاد کی طاقت تھی سرحدوں پر خیمہ زن تھی درجن میں جہاد کی طاقت نہ تھی وہ نئے نئے شہروں میں بس گئے تھے پس حضرت عثمانؓ کے حادثے کے موقع پر مہاجر اور انصار ملی جو جماعت موجود تھی وہ مدینہ کی اس جماعت جیسی نہ تھی جو یقینوں خلفاء کی بیعت کے موقع پر حاضر تھی۔ پھر علیؓ، طلحہؓ اور زبیرؓ میں بھی باہم تو دشمنیاں نہ تھیں، مظلوم خلیفہ کے ساتھ ہر ایک کا طرز عمل الگ تھا، اور اسباب تشدد پر ہر ایک کی رائے سے سے جدا تھی۔

حضرت علیؓ نے لوگوں کو بنائے ورف سے روکنے کی امکانی کوشش کی جیسا کہ اس کتاب کے پہلے حصہ میں گذرا انھوں نے باغیوں اور حضرت عثمانؓ کے درمیان گفت و شنید کا فرض انجام دیا، باغیوں کو مدینہ سے واپس کیا بعد میں ایک مدت تک مدینہ میں رہے اور حضرت عثمانؓ کو راضی کر لیا۔ پھر جب باغی بلا اطلاع مدینہ میں گھس آئے اور حضرت علیؓ ان کو نکال باہر کرنے سے باز ہو گئے تو چاہا کہ حضرت عثمانؓ کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں لیکن یہاں کر سکے، پھر سخت محاصرے کے زمانے میں جب حضرت عثمانؓ بہت پیاسے تھے آپسے کوشش کی کہ میٹھا پانی آپ تک پہنچا دیں۔

زبیرؓ نے نہ تو باغیوں کو روکنے میں نمایاں حصہ لیا اور نہ مخالفوں کو ابھارنے اور آمادہ کرنے میں قابل ذکر سرگرمی دکھائی البتہ نہ موقع کا انتظار کرتے رہے، طبیعت ان کی باغیوں کے ساتھ تھی، شاید وہ یہ خیال کرتے تھے کہ نوبت یہاں تک نہیں پہنچے گی۔

اب رہے طلحہؓ تو وہ کھلم کھلا باغیوں کی طرف جھکے ہوئے تھے باغیوں کو علانیہ بھڑکاتے تھے ان کی ایک جماعت کو اپنا رویدہ بنا رہے تھے حضرت عثمانؓ نے اس کی تسکایت کھنڈ طور

پر بھی کی اور بصیغہ راز بھی بار بار اظہار کیا، راویوں کا بیان ہے کہ اس سلسلے میں حضرت عثمانؓ نے حضرت علیؓ سے امداد چاہی، چنانچہ آپؓ کے پاس آئے اور نہ بکھا کہ باغیوں کا ایک بڑا گروہ وہاں جمع ہے، حضرت علیؓ نے پوشش کی کہ طلحہ اپنی یہ روش چھوڑ دیں لیکن وہ باز نہ آئے، تب حضرت علیؓ ان کے پاس سے لوٹ کر بیت المال آئے اور جو کچھ اس میں تھا نکال کر لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر طلحہ کے ساتھی ان کے پاس سے اُٹھ کھڑے ہوئے، حضرت علیؓ کی اس کارروائی سے حضرت عثمانؓ خوش تھے۔

راویوں کا خیال ہے کہ یہ دیکھ کر طلحہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے اور معذرت کرنے لگے، حضرت عثمانؓ نے اب دیکھ کر یہ جانتی معذرت اور مذمت کی نہیں بلکہ ناکامی اور شکست کی ہے طلحہ تجھ سے خدا حساب لے گا۔

بات جو کچھ بھی رہی ہو بہر حال حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد مدینے میں یہ تینوں منتظر تھے کہ لوگ کیا کرتے ہیں اور حالت یہ تھی کہ پوری آبادی پر باغیوں نے خوت و ہراس کا وہ عالم طاری کر دیا تھا کہ مظلوم خلیفہ کی لاش رات کی تاریکی میں لوگوں سے بہت چھپا کر دفن کی جاسکی۔ حضرت عثمانؓ کے جدام کی بیعت کے بارے میں راویوں کا اختلاف ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ قتل کے بعد ہی حضرت علیؓ کے لئے بیعت لی گئی لیکن یہ واقعہ نہیں ہے، اس مہبوت کردینے والی شورش و رباوت کے پیش نظر واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں کئی دن تک لوگوں نے اس طرح گزر آ کر ان کا کوئی امام نہ تھا ان دنوں ان کے معاملات کی نگاہم بغاوت کے ایک میڈرڈانقی کے ہاتھ میں تھی۔

خلیفہ سے فرصت پا لینے کے بعد باغی حیران تھے، وہ جانتے تھے کہ لوگوں کے لئے ایک امام کی ضرورت ہے ورنہ اس مکی بیعت جس قدر جلد ممکن ہو کر رہنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ نہ عثمانؓ کے گورنران پر قابض ہو جائیں ورنہ ان سے جس طاقت و رباوت سے معاویہؓ نے کہیں اپنی فوج بکھج کر مدینہ اپنے اقتدار میں کر لیں اور پھر باغیوں کو ان کے کئے کی سزا دے دیں، باغی یہ بھی

جانتے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کا امام نہیں بن سکتا، اس لئے کہ امامت کا معاملہ تھا اور انصار کے ہاتھ میں ہے وہی قریش کے کسی فرد کو چن کر بیعت کرتے ہیں۔

پھر ان کی خواہشیں بھی مختلف تھیں، مصری حضرت علیؓ کو چاہتے تھے کہ وہ لوگ زبیرؓ کے ساتھی تھے، بصرہ کے باشندے طلحہؓ کے طرفدار تھے ان میں سے ہر ٹولی اپنے اپنے لیڈروں کے ہاں آتی جاتی تھی یا تنوع یا ہر اپنے جماعت کی طرف سے پیش کردہ امتیازات قبول کرنے سے انکار کرتے تھے، بالآخر باغیہ، کونینہ، یونانہ، کوفہ، اکیسے امام مقرر تھے اور ان کے درمیان سلسلہ میر، ان لئے ضروری ہے کہ وہ ہر ایک اور انصار کا تعاون حاصل کریں جو ان میں سے کسی کو پسند کریں اور اس سے اس منہدب کے قبول کرنے پر اصرار کریں تب یہ ان کے اصرار کی تائید کریں یہاں تک کہ وہ راعی ہو جائے۔ چنانچہ یہ باغی صحابہ کے گھروں، پلر، کائنات، لگاؤ اور ان سے اصرار کے ساتھ درخواست کرنے لگے کہ امت کے لئے ایک امام چن دیجئے، ہر ہر وہ انصار نے دیکھا کہ یہ کام تو بہر حال کرنا ہے، پس انھوں نے خود سوچا اور اپنے بیٹے اور اپنے تبادلات خیالات کیا اندازہ یہ ہوا کہ عام رجحان حضرت علیؓ کی طرف سے اور لوگ ان کو والدہ ام زبیرؓ دونوں پر قدم خیال کرتے ہیں۔

اس طرح انصار اور ہاجرین نے حضرت علیؓ کو خلافت کا منصب پیش کیا اور ان سے قبول کر لینے پر اصرار بھی کیا، پھر باغیوں نے اس اصرار کی تائید کر دی، حضرت علیؓ نے انصار اور ہاجرین کو دیکھا، لیکن انھیں انکار کی توجہ صورت نظر نہیں آئی، باغیوں کے پیش کرنے پر اپنے منہ پر انکار کیا تھا لیکن سب سب نے ہر ایک اور انصار بھی پیش کر رہے تھے اور سابقہ خفا کا ماحول پر چھڑا چھڑا رہے تھے تو ان کا کہنا تھا کہ ہم نہیں رہی چننا چھڑا چھڑا، خود ان کے قبول کرنے اور سابقہ روایت کے مطابق منبر نبویؐ پر جا بیٹھنا اور لوگ اگر یہ کہتے ہیں کہ انہیں چند آدمیوں سے انکار کیا اور حضرت علیؓ نے ان سے اصرار بھی نہیں کیا، نہ باغیوں کو اور نہ ہاجرین کو کہ ان کو مجبور کریں، ان چند آدمیوں نے ایک سجدہ کیا اور ان کے ہاتھ میں بیٹھ کر ان کے



ایک رکن تھے انھوں نے انکار کرتے ہوئے حضرت علیؑ سے کہا: ”میری طنت سے آپ مطمئن رہیں“ حضرت علیؑ نے ان کو اس کی آزادن دے دی، انکار کرنے والوں میں دوسرے عبداللہ بن عمرؓ ہیں۔ حضرت علیؑ نے ان سے امن پسندی اور لوگوں کے معاملات میں خل درمخلولات نہ کرنے کی ضمانت طلب کی عبداللہ بن عمرؓ نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا، حضرت علیؑ نے کہا چھوٹے سے بڑے ہو گئے لیکن میں نے ہمیشہ تم کو ناشائستہ پایا اس کے بعد نہ پایا، سے جانے دو میں خود اس کا ضامن ہوں، گوشہ نشینیوں کی ایک جماعت نے بھی بیعت سے انکار کیا تھا حضرت علیؑ نے ان کو بھی مجبور کیا نہیں چاہا ورنہ ان پر کسی زیادتی کے روادار ہوئے طلحہؓ اور زبیرؓ نے بھی بیعت نہیں کی تھی لیکن باغیوں نے ان کو مجبور کیا اور حضرت علیؑ نے بھی ان دونوں کو سعد ابن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ کی طرح معاف نہیں کر دیا اس لئے کہ باغیوں کی طرح ان کو حضرت علیؑ بھی خوب جانتے تھے، ان کو احلوم تھا کہ طلحہؓ حضرت عثمانؓ کے کمرے نما لہو میں سے بیٹا ورنہ خود خلیفہ بننے کا بھی حوصلہ رکھتے ہیں اُدھر جانتے تھے کہ زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ کی مخالفت پر کسی کو اکسایا نہیں لیکن کسی باغی کو روکا بھی نہیں اور پھر خلافت کی تنہا میں طلحہؓ سے کم نہیں اس لئے ان کو بیعت سے معاف نہیں کیا کہ جس قدر بھی ہو سکے ان کو پابند کر لیں، بعض روایات کے مطابق حضرت علیؑ کی بیعت حضرت عثمانؓ کے قتل کے پانچ دن بعد ہوئی اور بعض روایات میں آٹھ دن ہے، اس کے بعد یہ بات عام ہو گئی کہ بصرہ، کوفہ اور مصر کی سرحدوں اور حجاز پر حضرت علیؑ کی سیادت قائم ہو گئی۔

حضرت علیؑ کے یہ ایک غور طلب معاملہ ہے یہ مسئلہ شام کا تھا، صورت حال یہ تھی کہ ایک نو شام بغاوت سے لرز رہا، دوسرے اس کی زمام سکو مست حضرت عثمانؓ نے حجاز اور بھائی معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی، آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ شام اور معاویہؓ کے ساتھ حضرت علیؑ کا طرز عمل کیسا رہا۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ حضرت علیؑ مسلمانوں کے امام ہو گئے دینے میں جو رہنما ہر اہل انصار موجود تھے انھوں نے آپؑ کی بیعت کر لی، سرحدوں کی طرف سے ان

باغیوں نے آپ کی بیعت کی جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے خطرناک مشکلوں میں سے ایک یعنی خلافت اور خلیفہ کی شکل کا خاتمہ ہو گیا دوسرے لفظوں میں یوں کہتے کہ حضرت علیؑ اور عام لوگوں پر یہ نسخ ہو گیا کہ مصیبت دور ہو گئی اور اب اس کے بعد تمام معاملات میں امن، خوش گواری اور استقلال پیدا ہو جاتے گا۔

نئے امام کے لئے ضروری تھا کہ اپنے دوسری خطرناک مشکل کی طرف متوجہ ہو، یہ دوسری مشکل مقتول امام کا مسئلہ ہے، نئے امام کا فرض ہے کہ وہ مقتول امام کے خون اور اس کے قاتلوں کے بارے میں اللہ کے فرمان اور دین کے حکم کا اعلان کرے، اگر مقتول امام ظالم تھا تب تو بدلے کی اور قاتلوں سے قصاص کی کوئی بات نہیں، لیکن اگر مظلوم تھا تو جدید امام کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا بدلے اور قاتلوں پر قصاص کا حکم جاری کرے جو اللہ کا فرمان ہے، ہاجر اور انصار صحابہ کی رائے تھی کہ حضرت عثمانؓ مظلوم تھے اور امام کے لئے اس کے سوا پارہ کار نہیں کہ وہ اس خون کا بدلے اور اگر حقوق کی پامالی کی جاتی رہی، خون ریزی ہوتی رہی اور حدود کا اجرا عمل میں نہیں آیا تو دین کے قیام کی کوئی سورت نہ ہوگی مقتول اگر کوئی معمولی انسان ہوتا تب بھی یہ سب کچھ ہونا غریزی ہے چہ جائیکہ امام اور مسلمانوں کا خلیفہ ہو، ہاجر اور انصار کہا کرتے تھے۔ عثمانؓ کے قاتلوں سے اگر ہم قصاص نہ لیں تو لوگ کس طرح اس بات سے رک سکیں گے کہ جس امام پر غصہ آیا اس کے خلاف بغاوت کریں اور پھر اس کو قتل کر دیا، یہی بات لوگوں نے حضرت علیؑ سے کہی، آپ نے سن اور ان کے خیال کی تصدیق کی اس کے بعد ان کے سامنے حقیقت کی یہ تصویر پیش کی کہ جہاں تک اقتدار کا سوال ہے بلا شک وہ بیعت کے ذریعے میری طرف منتقل ہو چکا ہے، لیکن عملاً تو وہ اب تک باغیوں کے ہاتھ میں ہے، آج شہرِ رافضی کا فوجی قبضہ ہے خلیفہ اور صحابہ بے بس ہیں وہ شہر اور شہریوں کے بارے میں جیسے بھی چاہیں فیصلہ کر سکتے ہیں ایسی حالت میں چھاپا ہے کہ کچھ دنوں جہد و جدت اور معقولیت کا سہارا لیا جائے تاکہ معاملات سیدھے ہو جائیں اور خلیفہ

حکومت کے تحت ہو جائے اس کے بعد اس مسئلے پر نظر ڈالی جائے گی اور کتاب و سنت کی روشنی میں اللہ عز و جل کے احکام کا ابراہان کیا جائے گا۔

صحابہ تو حضرت علیؓ کے نقطہ نظر سے مطمئن ہو گئے لیکن باغیوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انھوں نے خلیفہ کا خون اس لئے کیا۔۔۔ کہ وہ تھا نہ تھا جس لئے۔۔۔ بدے کا کوئی حوالہ ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ امام کو اس کے عوض دیں جہاں اپنی چاہیے۔

مگر اس کے باوجود حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کے خون کی تحقیق کا ارادہ کیا لیکن کارروائی کی تکمیل کی صورت نہ مل سکی ایک جوعت بغداد تھی کہ حضرت عثمانؓ کے خون میں محمد بن ابوبکر کا بھی ہاتھ ہے یہ محمد بن ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کے صاحبزادے ہیں ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے بھائی اور نوہ حضرت علیؓ کے سوتیلے بیٹے ہیں حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے ان کی والدہ سے نکاح کر لیا تھا۔ حضرت علیؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم عثمانؓ کے قاتل ہو، انھوں نے انکار کیا اور حضرت عثمانؓ کی بیوی نے کہہ دیا، قاتل نہ ہوں کی تصدیق ردی لیکن جیتے ہی باغیوں کو بھٹکائی، حضرت علیؓ تحقیقات کر رہے ہیں انھوں نے اپنے اتحاد اور غصے کا اظہار کیا، جس کے بعد حضرت علیؓ نے وہ روش اختیار کی جس کا ہم بھی ذکر کر چکے ہیں اور موقع کا انتظار کرنے لگے آپ کے ساتھ مدینہ کے ہم صحابہ بھی منتظر رہے۔

شاید ناظرین کو یاد ہو گا کہ تخت خلافت پر بیٹھتے ہی حضرت عثمانؓ کو جس قسم کا الجھاؤ پیش آیا تھا حضرت علیؓ کو بھی اپنی خلافت کے آغاز میں اسی قسم کی ایک پچھیر لگی کا سامنا ہوا، حضرت عثمانؓ کو سب سے پہلی شکل عبید اللہ بن عمرؓ پیش آئی جنہوں نے عثمانؓ کو اس تہمت پر قتل کر دیا تھا کہ اس نے ان کے بچے قتل پر آمادہ کیا تھا لیکن عبید اللہ نے یہ خون بلا ثبوت اور بلا دلیل کیا تھا ان کے پاس اس کے لئے قاضی کا کوئی فیصلہ نہ تھا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کا خیال تھا جس میں حضرت علیؓ بھی شامل ہیں کہ عبید اللہ



پر قتل کی حد جاری ہوئی چاہیئے اور ایک دوسری جماعت پر یہ بات فری گراں تھی کہ حضرت  
 عثمانؓ اپنے خلافت کا آغاز ناردق اعظمؓ کے صاحبزادے کے قتل سے کریں، حضرت عثمانؓ  
 نے عید اللہ کو معاف کر دیا اس لئے کہ ہر حران کا کوئی دلی نہ تھا جو خون کا دعوہ کرتا ایسی ہی امت  
 میں خلیفہ دلی ہوتا ہے جسے معاف کر دینے کا بھی حق ہے اس وقت حضرت علیؓ اور بہت  
 سے مسلمانوں نے حضرت عثمانؓ کے اس فیصلے کو تسلیم نہیں کیا، اس کو ایک ظلم، ایک  
 خون ناحق اور اللہ کے حدود میں ایک تجاوز خیال کیا، حضرت علیؓ عثمانؓ عہد کے اید فرمایا  
 کرتے تھے کہ اگر میں اس فاسق کو پاباؤں کا تو ہر مزان کے قتل کے بدلے اس کو ختم کر دوں گا۔  
 حضرت عثمانؓ کے سامنے مسلمانوں کے ایک خلیفہ کا لڑکا ناحق خون کے الزام میں پیش ہوتا  
 ہے حضرت عثمانؓ اس کو معاف کر دیتے ہیں اور اس معافی پر مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے  
 حضرت علیؓ کے سامنے مسلمانوں کے ایک دوسرے خلیفہ کا لڑکا قتل کے الزام میں پیش ہوتا  
 ہے اور قتل بھی کس کا، رعایا میں سے کسی پناہ گزیں غیر ملکی کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک امام ہائین  
 علیؓ محمد بن ابوبکر کو معاف نہیں کرتے اس کی تحقیقات کرتے ہیں پس راضی ہو جاتا ہے کہ وہ  
 قاتل نہیں ہے اس کے بعد واقعات اور عداوت مزید تحقیقات کی راہ میں جائے ہو جاتے ہیں اور  
 قاتلوں کے حق میں دین کا حکم جاری نہیں ہونے پاتا۔

اور واقعہ تو یہ ہے کہ محمد بن ابوبکر نے اپنے ہاتھ سے حضرت عثمانؓ کا خون نہیں کیا بلکہ وہ  
 اوروں کی طرح دیوار پر چڑھ کر گھر میں اترے اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے قتل سے محمد بن ابوبکرؓ  
 کا گہرا تعلق ضرور تھا لیکن اس خون کی بارش سے جن اوروں کا پورا پورا تعلق تھا وہ استغناء  
 اور اتنے قوی اور اتنے خوفناک تھے جن پر قبو نہیں پایا جاسکتا تھا یا جدید امام ان سے قصاص نہیں  
 لے سکتا تھا، اس کے بعد تو جو واقعات پیش آئے آپ آئے پڑھیں گے کہ ان کی وجہ سے مقتول  
 خلیفہ کا قصہ مشکل پر پیچیدہ ہی ہوتا گیا۔



بلکے رنج کی آمیزش ضرور ہو گئی تھی اور وہ مغموم سے تھے کہ یہ نیک و متقی امام دھوکہ دے کر ان سے اچک لیا گیا، یہ حادثہ ہاجر اور انصار کی موجودگی میں نہیں ہوا اور نہ یہ شہروں اور سرحدوں کے باشندوں اور فوجیوں کی سازش کا نتیجہ تھا، پس یہ سازش بیک وقت شدید تھا اور آسان بھی، جس کی بلیغ ترین تعبیر حضرت عمرؓ نے خیر کا مہلک زخم لگ جانے پر فرمائی، آپ نے مڑتے ہوئے قرآن مجید کی آیت پڑھی۔ **وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَقْدُودًا**۔ یعنی، اللہ کا حکم پہلے سے تجویز کیا ہوا ہوتا ہے۔ پس حضرت عمرؓ کی وفات مقدرات میں سے ایک بات تھی نہ کوئی ٹولی حملہ آور ہو کر آپ پر ٹوٹ پڑی اور نہ مسلمانوں کی کسی جماعت نے آپ کے خلاف کوئی سازش کی ایک معمولی مٹکا نے دھوکا دیا جس میں موت کے سوا چارہ کار نہ تھا۔

مگر حضرت عثمانؓ کا خون، تو ایک بے لگام بندت اور ایک ایسے فتنے کا نتیجہ تھا جس میں لوگ اپنی تیز کھوپکے تھے انھیں یہ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ آگے بڑھ رہے ہیں یا پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ حضرت عثمانؓ کا خون اس خوف و ہراس کا نتیجہ تھا جو ایک عرصہ تک پورے مدینہ پر چھایا رہا اور بعد میں دور دور تک پہنچا۔ جس سے لوگ گھبرا اٹھے، والیان ریاست یعنی صوبے کے حاکموں نے فوجیں تارکین سرحدوں پر بھیجنے کے لئے نہیں بہاں بھیجنے کی ضرورت تھی بلکہ دار الحکومت مدینہ منورہ کے لئے تاکہ وہاں امن بجاں کہ جائے اور خوف و ہراس کا فتنہ ہو اور خلیفہ کو محاصرے سے نکالا جائے لیکن ابھی یہ فوجیں دار الحکومت تک پہنچنے بھی نہ پائی تھیں کہ خلیفہ کو قتل کر دیا گیا۔ فوجیں اپنے اپنے مقامات پر واپس ہو گئیں اور مدینہ میں بدستور خوف و ہشتاد و بے چینی کا دور دورہ رہا۔

حج کے زمانے میں بغاوت کی خبریں حلیوں تک پہنچ چکی تھیں جبکہ اللہ بن عباسؓ نے ان کو حضرت عثمانؓ کا وہ اعلان سنایا تھا جس میں آپ نے ظلم و زیادتی سے اپنے کو بری بتایا تھا اور باغیوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ، اللہ کے حکم کی خدمت و ریزی کرتے ہوئے عبیدہ سے بغاوت کر رہے ہیں، لوگوں نے خوف و ہراس کی حالت میں حج کے لئے نہ سہارا دیا۔



کے عالم میں واپس آکر ہم وطنوں سے مدینہ کے پرخطر حالات کا بیان کیا۔

ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کا استقبال مسلمانوں نے اُدا اس چہروں اور بے عینیت بھرے دلوں سے کیا، جب ان کی پریشانی اور بے اطمینانی یہ دیکھ کر بڑھتی جا رہی تھی کہ قاتل باغی ابھی مدینہ ہی میں ہیں اور قبضہ حملے بیٹھے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جدید خلیفہ اور اس کی بیعت کرنے والے ہا جرادہ انصار، باغیوں کے ہاتھوں میں قیدی ہیں، چنانچہ حضرت علیؓ نے جب معلوم کرنا چاہا کہ خلیفہ رقت پر شورش کے سبب کیا گزری اور کس طرح گزری تو وہ اس کی تحقیقات کرنے پر قدرت نہ پاسکے، علاوہ ازیں مدینہ کے لوگ حضرت عثمانؓ کے گورزروں کو خوب جانتے تھے، اُن کا اندازہ تھا کہ سب نہیں تو بعض گورزروں پر اس نئی خلافت سے اپنی ناگواری کا اظہار کر کے خلیفہ سے جھگڑا کریں گے، خاص طور پر ان کو معاویہ بن ابی سفیان سے ڈرتھا کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ مقتول خلیفہ سے معاویہ کی رشتہ داری ہے اُن کو اس بات کا بھی علم تھا کہ شامی معاویہ کے فرماں بردار ہیں کیوں کہ وہ ایک عرصہ دراز فاروق اعظمؓ کے زمانے سے ان کے حاکم ہیں۔ مدینہ واسے جانتے تھے کہ بنی اُمیہ میں معاویہ کا پوزیشن کتنا اونچا ہے اور یہ کہ بنی اُمیہ ورنہ ہاشم میں نہ ہو ورنہ سدا سے بھی پہلے کی قدیم عداوت ہے، نئی دوران کے اسی بہرہ پس پنا نیا دین لے کر مدینہ کی طرف نکلے تو قریش کی قیادت ابو سفیان نے کی، جب بدر کے معرکے میں قریشی سرداروں کا خاتمہ ہو چکا تھا تو احد کے معرکے میں قریش کے ساتھ ابو سفیان ہی آئے اور بدر کے مشرک مقتولوں کا بدلہ لیا، ابو سفیان کی بیوی ہند نے جو معاویہ کی بیوی تھی اس کو اس خوشی میں آزاد کر دیا کہ اس نے حمزہؓ کو قتل کر دیا، ہند حمزہؓ کے قتل کے بعد میدانِ حشر میں جاتی ہے۔ پٹری ہوئی لاشوں میں حمزہؓ کو تلاش کرتی ہے جب ان کی لاش پا جاتی ہے تو میٹ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکالتی ہے۔ در اس کو چپاتی ہے۔ خندق کے معرکے میں ابو سفیان ہی قریش کے قائد تھے، انھوں نے ہی عربوں کو نبی کریمؐ کی مخالفت میں پکا کیا، یہودیوں کو اس طرح

نے ایک مبینی علامہ ہمام جس سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر حمزہؓ کو قتل کر دے گا تو آزاد کر دیا جائے گا۔

اکسایا کہ انھوں نے وہ معاہدہ توڑ دیا جو نبیؐ اور صحابہ کے ساتھ کیا تھا یہ ابوسفیان ہی تھے جو قریش کو نبیؐ کے مد مقابل بنائے رکھنے کی تدبیریں اور آنحضرتؐ کے خلاف مکاریاں اور چال بازی کرتے رہے یہی تک کہ فتح مکہ کے دن آگئے اور اس وقت اسلام قبول کیا جب مسلمان ہوئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

لوگ معاویہؓ کے متعلق جو کچھ چاہتے ہیں کہ وہ اسلام لانے کے بعد نبیؐ کے مقرب بن چکے تھے ان کا شمار وحی کے کاتبوں میں ہے، وہ مسلمان اور مخلص مسلمان تھے۔ وہ نبیؐ کے اور تینوں خلفاء کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے ان تمام باتوں کے باوجود معاویہؓ بہر حال حد اور خندق کے معرکوں میں مشرکین کے قائد ابوسفیان کے بیٹے تھے وہ ہند کے لڑکے تھے جس کی عمر سے دشمنی کا یہ عالم کہ قس کے بعد ان کی لاش کی تلاش کرے ان کا پیٹ چاک کر کے ان کا کھج چبائے اور نبیؐ کو اپنے معزز چچا کے غم میں تقریباً بے ضبط کر دے۔

مسلمان، معاویہؓ اور ان کے جیسے آخر میں اسلام لانے والوں کو "امان یافتہ" کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا۔ جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو، تم سے کوئی باز پرس نہیں۔

صلی اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن جریر طبری لکھتے ہیں کہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی علیٰ ابن ابی طالب اور عثمان بن عفان لکھا کرتے تھے اگر یہ غیر حاضر ہوتے تو وحی کی کتابت ابی ابن کعب اور زید بن ثابت کیا کرتے تھے، اور خالد بن سعید بن عاص اور معاویہ بن ابی سفیان آپ کی ذاتی ضروریات کے معاملات تحریر کرتے اور عبداللہ بن ارقم بن عبدغوث اور عمار بن عقبہ لوگوں کی ضروریات کے لئے کتابت کیا کرتے تھے اور زیادہ تر عبداللہ بن ارقم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بادشاہوں کو خط لکھے۔

اسی طرح ابن ابی حدید پنج البلاغہ کی شرح میں لکھتے ہیں کہ معاویہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت میں سے ایک تھے لیکن ان کی کتابت کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کیا تھے؟ ارباب سیر محققین کا مسلک یہ ہے کہ۔ وحی کی کتابت تو علیؓ اور زید بن ثابت اور زید بن ارقم کیا کرتے تھے اور حنظلہ بن ربیعہ اور معاویہ بن ابی سفیان بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کے نام آنحضرتؐ کی طرف سے خطوط لکھتے تھے اسی طرح یہ دونوں آپ کی ضروریات اور عداوت کے بارے میں آمد اور تقسیم بھی لکھتے تھے، انھیں مصنف علی جلال حسینی ص ۶۱ مطبوعہ قاہرہ۔

لوگ ان تمام باتوں کو جانتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ ہاشمی خلیفہ اور اموی امیر کے درمیان معاملات کا تصفیہ آسانی اور نرمی سے نہیں طے پاسکتا۔ لوگ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ نبی کی وفات کے بعد قریش نے خلافت کا رخ نبی ہاشم کی طرف سے اس لئے پھیر دیا کہ نبوت اور خلافت قریش کے اس خاندان میں جمع کرنا امن و عافیت کے خلاف ہے اور نامناسب سمجھا، لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ اللہ نے نبی ہاشم کو نبوت سے نوازا کہ بہت کچھ خیر و برکت کا مالک بنا دیا ہے، اب ان کو اسی فتنل و کرم پر قناعت کرنی چاہیئے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو صرف یہی خطرہ نہ تھا کہ حضرت علیؑ اور امیر معاویہؓ میں جھگڑا ہوگا بلکہ وہ ڈرتے تھے کہ ایک طرف تو علیؑ اور نبی ہاشم کے تعلقات میں خرابی پیدا ہوگی دوسری طرف کل خاندان قریش باہم دست و گریباں ہوگا، ان حالات میں وہ اپنے سامنے ایک ایسی زندگی دیکھ رہے تھے جس کی بے صحتی و امن و عافیت ہے اور نہ فراخی اور خوش حالی، البتہ خوف ہے اور بے چینی، ان کو خواہ تھا کہ انہیں یہ زندگی لگ جلتی نہ تھی مصیبت کے کسی بڑے دلدل میں نہ پھنسا دئے وہ جب غور کرتے انہیں نظر آتا کہ بڑے بڑے بہادر اور انصار عجاہ کی ایک جماعت معاملات سے دور در رہنا پسند کرتی ہے اور لوگوں کا ساتھ دینا نہیں چاہتی، چنانچہ وہ حضرت عثمانؓ کے معاملات سے الگ رہی، حضرت علیؑ کی بیعت میں حصہ نہیں لیا اور انتظار میں وقت گزارتی رہی، اس جماعت میں اچھی خاصی تعداد ایسے افراد کی تھی جو خوبی اور نیکی میں انتخاب تھے اور اس قابل کہ سب سے زیادہ ان کا احترام کیا جائے جیسے سعد بن ابی وقاصؓ، شد کی راہ میں سب سے پہلے تیروانے والے، فارس کے قاتل، نبی جن لوگوں سے خوش ہو کر دنیا سے گئے ان میں کے ایک، فاروق اعظمؓ کی مقرر کردہ مجلس شوریٰ کے رکن، اور جیسے عبداللہ بن عمرؓ وہ مرد نیک جو مسلمانوں میں اختلاف خیال کے باوجود اپنے دینی تعلق کی وجہ سے قبل ہیں، محاسن کے دلدادہ، حرص و طمع سے دور اور مسلمانوں کے بلا و

رعایت خیر خواہ۔

(باقی)



# عربی کی ایک قلمی کتاب سے

## تاریخ ہند پر نئی روشنی

(جناب ڈاکٹر مخدوم شید احمد فاروقی صاحب استاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۵)

ہندی رطل کو سیر کہتے ہیں، سیر ستر مثقال لگتا ہوتا ہے اور ستر مثقال مصر میں ایک سو دو اور دو تہائی درہم کے برابر ہیں۔ چالیس سیر کا ایک من ہوتا ہے، ہند کے لوگ (ناپنے کے) پیمانوں سے نا آشنا ہیں، نرخی میں درمیانی نرخ گیہوں کا ہے، یعنی بارہ آنے کے ایک من، ر یعنی لگ بھگ بیس سیر) جو آٹھ آنے کے ایک من، چاول چودہ آنے کے ایک من، چاول کی اعلیٰ قسموں کا نرخ اور زیادہ ہے، چنے آٹھ آنے کے دو من، گائے اور بھیڑ کے گوشت کا نرخ ایک ہے، دو آنے کا چھ سیر، بکری کا گوشت دو آنے کا چار سیر۔ بطخ یا مرغابی بارہ آنے کی ایک (فوٹو نسخہ - روپیہ کی ایک)، مرغی چھ آنے کی چار (فوٹو نسخہ - آٹھ آنے کی چار)، شکر آٹھ آنے کی پانچ سیر، مصری آٹھ آنے کی چار سیر، موٹی بکری کی عمدہ سری آٹھ آنے یا تنک میں، (۲۴/۵) گائے یا بھینس کی اچھی سری، روپیہ میں اور کبھی اس سے بھی سستی۔ ہند میں

لے اس حساب سے سیر لگ بھگ موجودہ ۱۰ ادھ سیر کے بقدر ہوا، رطل کا وزن بھی اسی قدر ہوتا ہے۔

لوگ گائے اور بھیڑ کا گوشت زیادہ کھاتے ہیں۔

میں نے شیخ مبارک سے پوچھا کیا اس کی وجہ بکریوں کی کمی ہے؟  
 بولے: نہیں، بس عادت ہی ان دو جانوروں کا گوشت کھانے کی پڑ گئی  
 ہے، بکریاں تو ہر گاؤں میں ہزاروں کے حساب سے ہیں۔ اہل قسم  
 کی چار مرغیاں آٹھ آنے میں آتی ہیں۔ کبوتر، چڑیاں، اور مختلف قسم کے  
 پرند کوڑیوں کے مول ہیں۔ ہر قسم کے چرند پرند کے شکار کی بہتات  
 ہے۔ فنک نامی بومرہ (جس کا فر بہت عمدہ ہوتا ہے) اور گینڈا  
 پایا جاتا ہے، گو افریقی ہاتھی گینڈے سے زیادہ بڑا اور شاندار ہوتا ہے  
 اہل ہند عادتاً سفید کپڑے پہنتے ہیں۔ پوری آستینوں کے  
 ڈھیلے لمبے اونٹنی کوٹ (جو خ) اور اونٹنی کپڑے جب باہر سے آتے ہیں  
 تو خوب نفع سے کہتے ہیں۔ صرف عالم اور فقیر اونٹن پوش ہوتے  
 ہیں۔ سلطان، خان، ملک اور سارے فوجی افسر تاتاری ٹوپی  
 (تشریات) پہنتے ہیں اور تکلاوات (۹) اور خوارزمی قبائیں جو کمر پر  
 چست ہوتی ہیں۔ بڑھیا لاس ریشم کے چھوٹے عامے جن کی لمبائی دس  
 بارہ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی سہ پر باندھے جاتے ہیں۔

شریف ناصر الدین محمد حسین کارمی المعروف بہ زمری نے جنہوں  
 نے دو بار ہند کا سفر کیا اور سلطان قطب الدین کے مہمان رہے، مجھ  
 سے بیان کیا کہ ہند کے لوگ زیادہ تر سفید کپڑے پہنتے ہیں، جو کہ  
 دن اکثر لوگ ٹھٹ دار لباس میں میوس ہوتے ہیں جن پر سونے کا کام  
 ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کی آستینوں پر سونے کے تاروں سے نقش و نگار بنے  
 ہوتے ہیں اور کچھ بوٹیوں کے مونڈھوں پر جب کہ مفلوں کی رسم ہے، قبائیں

مَرْتَبَةُ الانبساط (؟) ہوتی ہیں، اور ان پر جواہرات لگے ہوتے ہیں، ٹانگے کے لئے زیادہ تر یا قوت و الماس استعمال کئے جاتے ہیں۔ لوگ لمبے بال رکھتے ہیں جیسا کہ مصر و شام میں فوج کا دستور ہے، لٹوں میں ریشمی مہاف ڈالے جاتے ہیں۔ کمر میں سونے چاندی کے ٹپکے، چرمی موزے اور ہمیریں باندھی جاتی ہیں، تلوار صرف سفر کے دوران کمر سے باندھی جاتی ہے۔ وزیروں اور سکریٹریوں کا لباس فوجی افسروں کی طرح ہے، لیکن وہ ٹپکے نہیں باندھتے، کچھ وزیر اور سکریٹری پگڑی کا پتہ صوفیوں کی طرح آگے لٹکاتے ہیں۔ قاضیوں اور عالموں کا لباس ڈھیلی اچکن یا کوٹ ہوتا ہے۔ عام لوگ قمیص (فرجیات مقتدرہ ؟) اور ڈھیلا کوٹ (دراریع) پہنتے ہیں۔ شبلی نے مجھ سے بیان کیا کہ دہلی کے باشندے ذہین اور خوش فکر ہوتے ہیں، فارسی و ہندی بے تکان بولتے ہیں، بعض اہل علم عربی میں بھی اچھے شعر کہتے ہیں، ان میں بہت سے درباری شاعر نہیں ہوتے لیکن سلطان کی شان میں قصیدے لکھتے ہیں اور سلطان ان کی آؤ بھگت کرتا ہے اور انعام دیتا ہے۔ شبلی نے کہا:۔ سلطان کے ایک سکریٹری کا دستور ہے کہ فتح یا دوسرے اہم موقع پر وہ قصیدہ لکھتا ہے سلطان کے حکم سے اس کے شعر گئے جاتے ہیں اور ہر شعر پر سکریٹری کو دس ہزار تنکے دئے جاتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سلطان کو قصیدے کا کوئی حصہ یا شعر پسند آتا ہے اور وہ یہ سمجھ کر کہ اگر اس نے سکریٹری کے انعام میں کوئی خاص رقم متعین کر دی تو اس کا حق پورا پورا ادا نہ ہوگا، وہ سکریٹری کو حکم دیتا ہے کہ خزانہ میں جائے اور جو چاہے لے لے۔ شبلی نے سلطان کی غیر معمولی داد و بخش اور فیاضی پر میر تقی میر کی دیکھی تو کہنے لگے کہ اس



کے باوجود سلطان حکومت کی آمدنی کا نصف بھی خرچ نہیں کرتا۔  
 بیکٹائے روزگار شیخ شمس اصفہانی نے محمد سے بیان کیا: قطب الدین  
 شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کیمیا سازی کو برحق سمجھتے تھے، میں نے ان سے  
 بحث کی اور کیمیا سازی کو غلط قرار دیا۔ انھوں نے کہا: تمہیں معلوم  
 ہے کہ سونے کی کتنی بڑی مقدار عمارتوں کو سجانے اور زیور بنانے میں  
 ضائع ہو جاتی ہے، اور جتنا سونا ضائع ہوتا ہے اتنا کانوں سے نکلتا نہیں،  
 مجھے تحقیق سے معلوم ہے کہ گذشتہ تین ہزار سال میں سونا ہندوستان سے  
 باہر نہیں گیا، اور نہ وہ سونا جو باہر سے یہاں آیا پھر کبھی باہر گیا، سوداگر  
 ساری دنیا سے خالص سونا لے کر یہاں آتے ہیں اور اُس سے عود، طبّی  
 جرّی بوٹیاں، اور قسم قسم کے گوند خریدتے ہیں، اس سے ظاہر ہوا کہ  
 سونا اگر بنایا نہ جاتا تو بالکل ختم ہو چکا ہوتا۔ ہمارے شیخ شہاب الدین  
 نے کہا: قطب الدین شیرازی کا یہ قول تو درست ہے کہ جو سونا باہر سے  
 ہند آتا ہے وہ پھر لوٹ کر نہیں جاتا، لیکن ان کا یہ کہنا کہ کیمیا برحق ہے،  
 صحیح نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ محمد بن تغلق کے کسی پیش رو سلطان نے  
 کوئی علاقہ فتح کیا اور وہاں اتنا سونا ملا کہ تیرہ ہزار بیلوں پر لادا گیا۔ اہل ہند  
 کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دولت جمع کرتے ہیں، کسی سے اگر پوچھا جاتا  
 ہے کہ تمہارے پاس کتنی دولت ہے تو وہ کہتا ہے: یہ تو مجھے نہیں معلوم،  
 ہاں میں دوسرا یا تیسرا ہوتا ہوں جو اپنے دادا کی دولت جمع اس گولک  
 میں کر رہا ہوں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کتنی ہے!

اہل ہند روپیہ جمع کرنے کے لئے زمین میں کنوئیں یا غار کھودتے ہیں اور  
 کچھ لوگ تالاب میں گولک بناتے ہیں جس میں صرف اشرفی ڈالنے کے لئے

سوراخ ہوتا ہے۔ ملاوٹ کے ڈر سے نہ تو وہ ڈھلا ہوا سونا لیتے ہیں، نہ سونے کے ٹکڑے اور نہ سونے کی چھڑیں بلکہ صرف دینار لیتے ہیں۔ ہند کے بعض جزیروں کے باشندوں کے پاس جب گھڑا بھر دینار ہو جاتے ہیں تو چھت پر ایک جھنڈا گاڑ دیتے ہیں، کسی کسی کی چھت پر دس اور اس سے بھی زیادہ جھنڈے لگے ہوتے ہیں۔

شیخ برہان الدین ابوبکر بن خلیل محمد بڑی نے مجھ سے بیان کیا : اس سلطان (محمد بن تغلق) نے ایک علاقہ میں فوجیں بھیجیں جو حدود دیوگیر کے بالکل آخر میں واقع تھا۔ یہاں کے باشندے ہندو تھے اور ان کا ہر راجہ رائے (سالک : را) کہلاتا تھا۔ شاہی فوج جب رائے سے نہر آزما ہوئی تو اس نے سیفر بھیجے کہ بادشاہ سے کہہ دو کہ ہم سے جنگ نہ کرے اور بار برداری کے جتنے جانور چاہے بھیج دے میں سب کو سونے چاندی سے لاد دوں گا۔ کمانڈر ان چیف نے سلطان کو رائے کی رضداشت سے مطلع کیا۔ سلطان نے جواب میں لکھا کہ رائے سے جنگ بند کر دو، اور اس کو امان دے کر اپنے ساتھ میرے پاس لے آؤ۔ رائے جب حاضر ہوا تو سلطان نے اس کی بے انتہا آؤ بھگت اور عزت کی اور کہا : (دولت کے بارے میں) جو بات تم نے کی میں نے آج تک نہیں سنی، تمہارے پاس کتنی دولت ہے جو تم نے کہا کہ ہم جتنے جانور چاہیں بھیج دیں تم سب کو لاد دو گے؟ رائے مجھ سے پہلے اس سلطنت میں سات رائے حکومت کر چکے ہیں اور ہر ایک نے ستہ ہزار باہین دولت جمع کی ہے اور یہ سب میرے پاس موجود ہے۔ راوی : باہین ایک خمار۔ "باحول ہوتا ہے جس میں چار طرف سے سیڑھیوں کے ذریعہ اترتے ہیں" رائے کی یہ بات سن کر

سلطان حیران ہوا اور حکم دیا کہ اُس ساری دولت پر اُس کے نام کی مہر لگا دی جائے۔ پھر سلطان نے راتے سے کہا کہ اپنی قلمرو میں گورنر مقرر کر دے اور خود دہلی میں قیام کرے۔ سلطان نے اس کو مسلمان ہونے کی بھی دعوت دی، لیکن اس نے انکار کر دیا، سلطان نے اس کو اپنے مذہب پر رہنے دیا۔ راتے دہلی میں ٹھہر گیا اور اپنی قلمرو میں گورنر مقرر کر دئے۔ سلطان نے اس کی شایانِ شان وظیفہ جاری کر دیا اور (۲۶/۵) بہت سادہ اس کے عزیزوں میں تقسیم کرنے بھیجا تا کہ وہ اس کی رعایا بن جائیں۔ تہ خانوں پر اپنی مہر لگا کر سلطان نے ان کو جوں کی توں رہنے دیا۔ اس قصہ کے راوی بڑی ہیں جن کی ثقاہت اور سچ گوئی مسلم ہے، تاہم اس میں اگر کوئی بات صحیح نہ ہو تو اس کی ذمہ داری اُن کے سر ہے۔

علی بن منصور حقیقی نے جو بحرین کے ایک عرب رئیس ہیں مجھ سے بیان کیا کہ ہمارے سفیر برابر ہند جاتے ہیں اور وہاں کے بہت سے حالات ہمیں معلوم ہیں۔ یہ خبر پے در پے ہمیں موصول ہوئی کہ اس سلطان نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں، ایک مفتوحہ شہر میں پانی کا ایک تالاب تھا اور اس کے بچوں پنج ایک مندر جس کی تعظیم کی جاتی تھی اور لوگ اس کی مورقی پر نذرانے چڑھاتے تھے، جتنے نذرانے آتے وہ اس تالاب میں ڈال دئے جاتے۔ سلطان نے شہر فتح کیا تو اس کی توجہ اس مندر کی دولت کی طرف دلائی گئی، چنانچہ تالاب سے ایک بمبا کاٹا گیا جس سے ہو کر سارا پانی نکل گیا، اس کے نیچے جو سونا تھا وہ سلطان نے لے لیا، (اور وہ اتنا زیادہ تھا) کہ دو سو ہاتھیوں اور کئی ہزار



سیلوں پر لادا گیا۔ عُقیلی نے کہا: سلطان بڑا فیاض آدمی ہے، اور پردیسیوں کے ساتھ خوب داد دہش کرتا ہے، ہمارے دو عرب اس سے ملنے کے ارادے سے گئے اور اُن کو سلطان کے حضور میں باریاب ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، سلطان بڑی مہربانی سے پیش آیا، خلعت سے ان کی عزت افزائی کی، اور ان پر خوب روپیہ صرف کیا حالانکہ وہ یہاں کے معمولی عرب تھے۔ پھر سلطان نے ان کو اختیار دیا کہ چاہے ہند میں قیام کر لیں، اور چاہے وطن مالوت واپس چلے جائیں، ایک نے ہند میں اقامت پسند کی، اس کو سلطان نے ایک بڑی جائداد دی، بہت سا روپیہ اور بہت سے مویشی، اس وقت ہند میں وہ خوب ٹھٹھا کر رہا ہے۔ دوسرے نے وطن جانے کی خواہش کی، اس کو سلطان نے تین ہزار سونے کے تنکے مرحمت فرمائے اور اُس کو خوش و خرم بحرین لوٹا دیا۔

## ہند کے کچھ متفرق حالات

نوٹو نسخہ رقم ۵۵۹ (معارف عامہ) دارالکتب المصریہ، قاہرہ ۱۲/۱  
مجھ سے ابو محمد حسن بن عمرو نے بیان کیا کہ ہند کے ہر شہر میں کسبیاں ہوتی ہیں، لیکن ان کے مخصوص و معلوم گھرانے ہوتے ہیں، ان کے علاوہ باقی لوگ ضبط نفس اور عفت پر سختی سے عمل کرتے ہیں، اُس مرد کو سخت ترین سزا دی جاتی ہے جو غیر کسی سے زنا کرے، اور اُس عورت کو بھی سخت سزا ملتی ہے جو اُن کسبیوں میں سے نہ ہو۔ جن کے نام سرکاری رجسٹروں میں درج ہوتے ہیں۔ غیر کسی عورت اگر کسی بنتا چاہے تو اس کے گھر والے اس سے سارے ناتے توڑ لیتے ہیں اور اس سے اپنے قطع

تعلق کی تحریر لکھ دیتے ہیں، اور عورت کو گھر سے نکال دیتے ہیں اور کبھی اس کو سلام نہیں کرتے وہ عورت کسی ہو جاتی ہے لیکن اس کا رتبہ پیشہ ور کسبیوں سے کم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ہر شہر میں گواہی وہ بوڑھی کسبیاں دیتی ہیں جن کی مائیں اور نانیاں کسی تھیں، ان بوڑھیوں کی بات اور گواہی ہر معاملہ میں سنی اور مانی جاتی ہے۔ جب کوئی مرد کسی کسی سے اپنے ساتھ رات گزارنے کا وعدہ لے لے اور اس کو بیعانہ دے دے تو اگر کسی کو کوئی دوسرا آدمی اس رات کے لئے دگنے چوگنے روپے بھی دے تو وہ اس کے ساتھ رات نہ گزارے گی اور پہلے کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرے گی۔

۱۲/۲ منصورہ (موجودہ حیدر آباد سندھ) کے ایک باشندہ نے کہا جو مانگیر آیا جایا کرتا تھا۔ مانگیر اور ساحل بلاد اُرد کے درمیان سینکڑوں فرسخ (افرخ = ۳ عرب میل) کا فاصلہ ہے اور یہاں بلا راتے (مسالک: بلہور) کی حکومت ہے، کہ ہند کے بعض پہاڑوں میں ایسے زہریلے چنگبرے اور مٹیالے سانپ ہوتے ہیں کہ اگر کسی انسان کو دیکھ لیں اور انسان ان کو، تو موخر الذکر فوراً مرجاتا ہے، یہ سانپ سب سے زیادہ زہریلا ہوتا ہے۔ مؤلف کتاب: اس سانپ کو مُکَلَّہ (سُفَہَہ) کہتے ہیں اور یہ اتنا زہریلا ہوتا ہے کہ اگر اس کی نظر کسی حیوان پر پڑے تو وہ مرجاتا ہے، لیکن اگر وہ فوراً بعد کسی دوسرے جانور کو دیکھ لے تو پہلا بچ جاتا ہے اور دوسرا مرجاتا ہے، کیوں کہ زہر کا اثر دوسرے میں سرایت کر جاتا ہے۔ اس کو مُکَلَّہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دوسری صنف کے ایک سانپ پر سوار ہوتا ہے جو اس کو لئے پھرتا ہے۔

۱۔ مائیں کہتا ہیں رائے کا بائے تخت، نرہا دریا سے قین سو پچاس میل جنوب میں۔ حدود العالم ص ۶۴  
تصحیح و توضیح ذی مار کی ۱۹۲۳ء۔  
۲۸ (باقی)

# اسلام ان موڈرن ہسٹری

## ایک باب کا ترجمہ

پروفیسر ڈاکٹر ڈبلیو، سی، اسمتھ

ملحق

(جناب ضیاء الحسن عثمانی فاروقی ایم۔ اے)

ڈاکٹر ڈبلیو۔ سی۔ اسمتھ کی کتاب موڈرن اسلام ان انڈیا (Modern Islam in India) برہان دہلی ۱۹۴۳ء میں چھپی تھی، اس وقت سے ہندوستان کا پڑھنا لکھا طبقہ ان کو جانتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان اور ہندی اسلام سے انہیں شروع سے دلچسپی رہی ہے، اس دلچسپی میں ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہے۔ پچھلے چند برسوں سے اس دلچسپی کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے اور اس کا دامن اسلام اور دنیائے اسلام تک پھیل گیا ہے۔ اسلام اور مسلم تحریکوں کو سمجھنے کے لئے انہوں نے، جب کبھی موقع ملا ہے، مسلم ممالک کا سفر کیا ہے، اسلامی زبانیں سیکھی ہیں اور ماضی اور حال کا گہرا مطالعہ کیا ہے، یہ سلامیات کے مطالعہ سے ہی کاشون ہے جس نے ان کو یہ جو عمدہ بحث کردہ میکگل یونیورسٹی، مانٹریال (کنیڈا) میں اسلامی علوم اور زبانوں کے درس و تدریس اور ریسرچ کے لئے ایک انسٹیٹیوٹ قائم کریں۔ سچ اس انسٹیٹیوٹ کے پاس اس سترار سے زیادہ معیاری کتابوں پر مشتمل ایک چھاپا کتب خانہ ہے۔ اس کے علاوہ تحقیقی علمی کاموں کے لئے دوسری سہولتیں بھی دی گئی ہیں۔

اسلام ان موڈرن ہسٹری (Islam in Modern History) جس کے ایک باب کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے، مشن کے وسط میں چھپ کر آئی تھی۔ یہ کتاب نے کثرت حب معصوفہ کی برسوں کی زہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس موقع پر جس کتاب پر ریویو نہیں کرنا چاہتا، البتات



مرد رہنا چاہتا ہوں کہ حال میں مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان میں یہ کتاب اور پروفسر گرب (بارورڈیونیورسٹی - امریکہ) کی کتاب موڈرن ٹرنڈز ان اسلام (Modern Trends in Islam) (شکاگو ۱۹۶۳ء) بڑی اہمیت رکھتی ہیں ان دونوں کتابوں میں ان علمی، ذہنی اور نفسیاتی رجحانات سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مسلم دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے گہرے مسائل چھیڑے گئے ہیں۔ وہ رجحانات اور وہ مسائل جن سے خود تعلیم یافتہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بڑی حد تک بے خبر ہے یا غیر شعوری طور پر بے تعلق ہے۔ ڈاکٹر اسمتھ کی اس نئی کتاب میں آج کے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی کیفیت، وہ نئی صورت حال جس سے وہ دوچار ہیں اور گونا گوں پیچیدہ مسائل کی طرف بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس کے اس باب کا ترجمہ کروں جس کا تعلق مسلمانان ہندوستان سے ہے تاکہ حساس اور سوچنے والے وہ مسلمان جو انگریزی زبان نہیں جانتے، اسے پڑھیں اور سمجھیں اور اگر انھیں اس میں کوئی تعمیری پہلو نظر آئے تو اس کو ذمہ داری کے ساتھ قبول کریں۔ ایسے مضامین پر غور و فکر کرنے کے لئے میں جس چیز کو بہت ضروری سمجھتا ہوں وہ نیک نیتی، دیانت داری اور بے تعصبی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے دیس کے مسلمان اس مضمون کو ہر طرح کے تعصبات ذہنی سے ماوراء ہو کر پڑھیں۔

(ضیاء الحسن فاروقی)

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان تقسیم ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ اس کا مسلمانوں کا فرقہ بھی تقسیم ہو گیا۔ اس واقعہ سے اس فرقہ کو بڑا عہدہ پہنچا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے پاکستان اس بنیاد پر بنایا تھا کہ ان کی جماعت ایک (ناقابل تقسیم) واحدہ ہے۔ مسلم لیگ نے یکایک مسلمانوں کے لئے ایک انگ ریاست کا نعرہ جو لگایا وہ درحقیقت اس کے اس نظریہ کا ضمنی نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیئے۔ بڑی شدت کے ساتھ اور پُر زور لفظوں میں اس نے اعلان کیا کہ ہند کے مسلمان ایک علاحدہ قوم ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک قوم محسوس کرنے میں کامیاب رہے۔ لیکن مسلم لیگ کی پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب ہندوستان

رقبل از تقسیم) کے مسلمان دو الگ قومیں ہیں۔

تقسیم سے پہلے کے ہندوستانی مسلمان اپنے علاحدہ قومیں ہیں، نہ صرف اس لحاظ سے کہ ان دونوں کے درمیان ایک سیاسی حد کھینچ دی گئی ہے (حالات نے اس حد بندی کو اور پختہ کر دیا ہے اور آمد و رفت، خبروں کا گذر، ایک دوسرے کو سمجھنے کے امکانات اور تجارتی تعلق۔ یہ سب معاملات اکثر مشکل ثابت ہوئے ہیں اور بسا اوقات تو ختم ہو گئے ہیں۔) بلکہ بنیادی طور پر بھی یہ دو الگ الگ قومیں بن گئی ہیں۔ اب ان کے سامنے جو مسائل ہیں وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور وہ جس پالیسی پر عمل پیرا ہیں وہ نہ صرف مختلف بلکہ متضاد بھی ہے۔ ایک کامفاد دوسرے کے لئے مضر ہو سکتا ہے یا اس کے نتائج دوسرے کے حق میں تباہ کن ثابت ہو سکتے ہیں۔ دونوں کے بنیادی مفادات ہیں، خواہ آخر میں وہ ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں، فی الحال کوئی مطابقت نہیں ہے۔ ان کے روحانی معاملات اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی مختلف ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان کا تاریخی ارتقار متضاد اصولوں کی بنیادوں پر ہو، ممکن ہے ان کا مذہبی قافلہ واضح طور پر دو متخالف راستوں پر گامزن ہو۔ مسلمانوں کے یہ دونوں گروہ اب اپنی الگ الگ "تقدیر" رکھتے ہیں درچونکہ ان کی ذمہ داریاں اور سرگرمیاں مختلف ہیں اس لئے ان کی رقتا ان کے اپنے وجود کی خصوصیات کے پیش نظر پرکھنی چاہیئے۔

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق برصغیر ہندوستان میں ۹ کروڑ ۳۴ لاکھ ۵۰ ہزار مسلمان تھے اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد تقریباً ۱۰ کروڑ ۳۴ لاکھ تھی۔ اس

۱۰ لاکھ ہندوستان کے بعض مسلمان یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی تقسیم نے مسلمانوں کو تین قوموں میں تقسیم کر دیا ہے ہندوستان کے مسلمان اور پاکستان میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے مسلمان، اور یہ تینوں آگے چل کر اپنا الگ الگ پارٹیاں ادا کرنے والی ہیں۔ ۱۰ لاکھ ہندوستان کی مردم شماری: ۱۹۴۱ء، دہلی، ۱۹۵۱ء۔

۱۰ لاکھ ہندوستان کی مردم شماری: ۱۹۵۱ء، آبادی مذہب کے لحاظ سے: ٹیبل نمبر ۱۔ مردم شماری بیٹن نمبر ۲، صفحہ ۱۰۰؛ ہندوستان ۳ کروڑ ۳۴ لاکھ (ٹائمز آف انڈیا ڈاکٹر کیری اینڈ میریک ۱۹۵۵ء، صفحہ ۱۰ تا ۱۱) کشمیر۔ ۵۳ لاکھ (ریڈ آؤٹ ۱۹۵۵ء میں مجموعی آبادی جیسا کہ ٹائمز آف انڈیا نے دی ہے اور جو ۳۴ لاکھ ۱۰ ہزار ہے اس کے ۷۰ فیصدی کو لے کر نکالیا گیا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ۱۱ لاکھ ۷۰ فیصدی کا اندازہ تھا۔ ڈبلو۔ نارین براؤن، وی یو اینڈ اسٹیشن اینڈ انڈیا اینڈ پاکستان، کمبرج، ۱۹۵۹ء،





زندگی کی جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں وہ پہلے سے مختلف ہیں۔ اس گروپ نے ابھی یہ حقیقت پوری طرح نہیں سمجھی ہے کہ یہ ایک ”نیا گروپ“ ہے۔

یہ نئی صورتِ حال، اس کے مسائل اور اس کے تقاضے اتنے نئے اور اچھوتے ہیں کہ پہلے کبھی اس طرح کی کوئی صورتِ حال تاریخِ اسلام میں نہیں ملتی۔ مسلمانانِ ہند کا یہ نیا گروہ اتنا ہی نیا ہے جتنا پاکستان، ایک اور پہلو سے اگر دیکھا جائے اور جس سے لگے چل کر ہم بحث کریں گے، یہ گروہ زیادہ قدیم ہے اور اپنے پیچھے زیادہ تاریخی حقائق رکھتا ہے۔ بہر حال بعض معاملات میں، خاص طور سے جہاں تک مذہبی معاملات سے تعلق ہے اس کی حیثیت نئی ہے، یہ ایک ”بدعت“ ہے بالکل جدید، لیکن یہ ایک حقیقت بھی ہے۔

دنیا کے اسلام کے تمام علاقے آج ایک نئی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ یہ بیسویں صدی میں رہنے کی برکت ہے۔ ہر علاقہ کا اپنا معاملہ الگ اور انوکھا ہے اس جہد میں تاریخِ اسلام کا دھارا الگ الگ کئی حصوں میں مختلف انداز سے بہہ رہا ہے ہندوستانی مسلمانوں کی جماعت اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی۔ آج اسلامی تاریخ کی اشو و نمایاں س کا ریل انوکھا ہے اور زیادہ تر اس کا اپنا ہے۔ ماضی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حال میں اس کا سہیم و شریک کوئی نہیں اور اس سے آگے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس نئی صورتِ حالی کا مقابلہ حسن کردار اور خوش سلوئی سے کر لیا تو ان کی جماعت عصرِ حاضر کے اسلام میں نمایاں اور اہم حیثیت کی مالک ہوگی۔

تعدادِ بذاتِ خود زیادہ اہمیت نہیں رکھتی مصر، ترکی اور ایران کی آبادی پاکستان اور انڈونیشیا سے بہت کم ہے لیکن تاریخِ اسلام میں ان کی اپنی اہم حیثیت مقدم ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ اگر اس کی تاریخ میں مسلمانانِ ہند کا حصہ عربوں سے کم رہا ہے تو انڈونیشیا جیسے بڑے مملکت کے مقبرہ میں کہیں زیادہ رہا ہے۔ اس لئے قطع نظر تعداد کے دیکھنا یہ چاہیے کہ اسلامی تاریخ میں ہندی مسلمانوں کا پارت بڑ

ازراہم رہا ہے۔ اس طرف اشارہ کرتے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کے پیچھے ہزار سالہ تاریخی شاندار روایات ہیں، جو بڑی گراں بہا ہیں، بڑی رنگارنگ ہیں، خاص طور سے حکومت، فنون لطیفہ، مذہبی فکر و عمل کے مختلف گوشوں میں ان روایات کی اپنی خصوصیت ہے، اپنی اہمیت ہے۔ مذہبی خیالات اور اعمال میں صوفیوں کی روایات بڑی روشن ہیں، ان روایات کی گود میں ایک زندہ اور ممتاز تمدن نے جنم لیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس تمدن کی عظمت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار سچائی ہے، اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی سوال اٹھا سکتا ہے تو یہ کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کیا یہ صلاحیت ہے کہ وہ ان روایات کو زندہ اور جاری رکھ سکیں اور اس سلسلہ کو ٹوٹنے نہ دیں؟ یہ جان قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں کوئی رائے قائم کی جائے ہمیں اس مسلم اقلیت کے حالات اور سرگرمیوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ ہم نے خود صورت حال کے نئے ہونے پر زور دیا ہے، پھر بھی اگر یہ نئی صورت حال ہے، لیکن ایک طویل سلسلہ ہی کی ایک کڑی ہے۔

ایک طرح سے پاکستانی اور ہندوستانی مسلمان دونوں ایک ہی ماضی کے وارث ہیں۔ دونوں کے پیچھے ایک ہی قسم کی روایات ہیں، تہذیبی اعتبار سے ہر ایک کے پاس وہی میراث ہے جسے ہم ”ہندوستانی اسلام“ کہتے ہیں اب یہ ان پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح برتتے ہیں اور اسے کیا شکل دیتے ہیں۔ اسی بات کو اگر دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھئے تو برخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے اس پر لاپرواہی سے غور کیا ہے، پاکستان اس تہذیبی ارتقاء کے سلسلہ کو توڑ دیتا ہے۔ اور اس کو نئے پاکستان ایک نئی چیز ہے۔ برصغیر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہی یہ ہندوستان ہی ہے جو اگرچہ اب چھوٹا رہ گیا ہے لیکن اس قدیم تہذیبی سلسلہ کو جوڑے ہوئے ہے۔ روایات ہجرت نہیں کرتیں اور تاریخ ایک سنگ چھوڑ کر دوسرے ملک میں پناہ نہیں لیتی۔ نئے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اجداد کی جو روایات اور تہذیبی دار





یونین اور نیکرو افریقہ کے مسلمانوں کو ان کی تعداد کی کمی اور مقابلہ بہت کم تاریخی اہمیت کے پیش نظر، ہندی مسلمانوں کے مقابلہ میں نہیں لایا جاسکتا مزید برآں سب سے بڑا اختلافی پہلو یہ ہے کہ وہ آزاد نہیں ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کی یہ انوکھی صورت حال پیچیدہ ہے اور ضرورت ہے کہ واضح طور پر اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن شروع شروع میں بہت سے مسلمانوں کے نزدیک یہ بڑی سادہ اور آسان معلوم ہوئی یعنی یہ کہ انھوں نے اپنے خوابوں کی اچھی تعبیر اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جو امید ٹائیم کی تھی اس میں انھیں مکمل طور پر ناکامی اور انتشار کا سامنا کرنا پڑا۔ اور انھوں نے ایسا محسوس کیا کہ ہر طرف سوائے دیرانی کے اور کچھ نہیں ہمارا خیال ہے کہ عصر حاضر کے مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کے مذہب اور ان کی موجودہ تاریخ میں مطابقت اور ہم آہنگی نہیں۔ یہ عدم مطابقت پورے طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے جلوہ گر ہوئی۔ اگر دوسری اسلامی جمعیتوں کے سامنے صرف یہ حقیقت تھی کہ مسلمانوں کی دنیوی زندگی کا جلال و شکوہ زوال مادہ منزلوں سے گذر رہا تھا اور ان کی تاریخ کا بڑھتا ہوا قافلہ رک گیا تھا یا اس کی رفتار سست ہو گئی تھی، تو ہندوستان میں مسلم جمعیت یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ ماضی کی شان و عظمت اور زمینی زندگی کی ساری برکتیں نابود ہو گئی ہیں۔ اور جب کہ اسلامی تاریخ کے دوسرے گوشے اپنے آپ میں خدائی مقصد سے کوئی مناسبت نہیں محسوس کرتے تھے تو اس جمعیت نے ایک پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد کی جہاں اسلامی تاریخ کا کم از کم ایک جزو ایک بار پھر سچی عظمت کی جلوہ ساء نیوں سے جلو کا سکے۔

ہندوستان کی موجودہ مسلم جمعیت آگ اور خون، نفرت اور وحشت کی آگنی فشاں میں اُبھری جہاں جنگی نعروں کی گونج تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان تقسیم ہوا اور خون کا فسادات اور قتل و غارت گری کے جلو میں ہندوستان اور پاکستان کی دونوں ریاستیں وجود میں آئیں۔

جب ان دنوں کے تشدد اور زیادتیوں کا اثر دونوں ملکوں نے پوری طرح محسوس کیا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان ملکوں کی اقلیتوں پر کیا گداری ہوگی جن کو بے بسی اور خوفزدگی نے بڑھا کر دیا تھا۔ اور یہ صورت حال آزادی کے بعد شروع کے چند ہفتوں ہی میں ختم نہیں ہو گئی بلکہ دونوں ملکوں کے مابین بڑھتے ہوئے تناؤ کے ساتھ کئی سال تک جاری رہی۔ پرجوش اندھی اور جذباتیت کی ماری ہوئی، فرقہ پرستی کا پس منظر لئے ہوئے اور ایک تباہ کن طوفان سے گذرتی ہوئی یہ مسلم جمعیت ایک ایسے ملک میں اقلیت بن کر ظاہر ہوئی جس کی عام آبادی اُس کو اور جسے وہ غیر اور اپنا سخت دشمن تصور کرتی تھی۔

جب جذبات سرد پڑے تو خوف کی فضا ختم ہوئی لیکن مشکلات قائم رہیں۔ نئے ہندوستان نے جلد ہی اپنے آپ کو شروع کے انتشار کی دلدل سے نکال لیا اور کسی قدر حوصلے اور ہوشیاری کے ساتھ خوراک کی کمی اور اس طرح کے دوسرے بحران مسائل کو قابو میں لانے کی کوشش کی، اس نے تعمیری، ذمہ دارانہ، مشکل اور حوصلہ بخش کام یعنی آج کی پیچیدہ اور دلولہ انگیز دنیا میں آزاد رہ کر جینے کے کام کی بنیاد ڈالنی شروع کی۔ کچھ مسلمانوں نے بھی، خاص طور سے گنتی کے وہ چند افراد جنہوں نے ہندوستانی نیشنلزم سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا تھا اور مسلم لیگ کی علاحدگی پسندی کی تحریک سے بے زاری ظاہر کی تھی، ہندوستان کے اس بڑے ترقی پسند اقدام میں شرکت کی۔ انہوں نے خلوص نیت اور اپنی تمام جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس میں حصہ لیا اور اُن کی خدمات کی قدر کی گئی۔ لیکن ان لوگوں کی جماعت کی اکثریت جو نہ تو دوسروں پر اعتماد کرتی تھی اور نہ خود اعتماد کے لائق تھی، اب تک رہی اور خوفزدہ، بے اعتمادی کی ماری ہوئی اور نظر انداز کی ہوئی یہ اکثریت بڑھا رہی تھی۔

اس مسلم اقلیت کے بیشتر افراد یہ محسوس کرتے تھے کہ ہندوستان کی یہ تعمیری سرگرمیاں ان کے لئے نہیں ہیں، وہ یہ خیال کرتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی نے ان کے دشمنوں کو

یہ بے روک موقع دے دیا ہے کہ وہ انھیں مغلوب رکھیں اور ختم کر دیں۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ اس نئی ریاست کی سیکورزم حسین کا بار بار اقرار اور اعلان کیا جاتا ہے محض قریب اور منافقت پر مبنی ہے، اور جمہوریت (ڈیموکریسی) کا مقصد یہ ہے کہ اُن کو اُن کے دلوں کی مؤثر اہمیت سے محروم کر دیا جائے۔

ہم ان اہم مسائل سے پھر بحث کریں گے۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا اور سمجھنا ہے کہ جس طرح کے حالات میں مسلمان گھرے ہوئے تھے اُن میں وہ یا کوئی اور جماعت کیسے نہ انھیں نتائج تک پہنچتی اور یہ چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے، نہ صرف یہ اندازہ لگانے میں کہ اُن کے احساسات کیا تھے، اُن کی بیجانی کیفیت کیا تھی بلکہ یہ بھی کہ اُن کے خارجی حالات کی نوعیت کیا تھی۔

یہ کلیہ بھی بے محل نہ ہوگا اگر کہا جائے کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی مذہبی اقلیت یہ محسوس نہیں کرتی کہ وہ محفوظ ہے اور اس کے وجود کو اکثریت نے تسلیم کر لیا ہے۔ کمیونسٹوں کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل غالباً چین میں یہ حالت نہیں تھی۔ اس لئے اس وقت کے حالات میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اقلیتوں کو اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس تھا۔ ابھی تک آدمی کوئی ایسا سماجی نظام نہیں بنا سکا ہے جس کی فضا ان گروہوں کے لئے بھی قابلِ اطمینان حد تک سازگار ہو جو پوری طرح اس نظام کو اپنا سکیں اور اس میں پوری طرح نہ شریک ہو سکیں، امریکہ میں عیسائیوں کو، عیسائی دنیا میں یہودیوں کو، مصر میں قبطیوں کو اور کمیونسٹ بلاک میں کمیونزم کی آزاد تفسیر کرنے والوں کو خوفزدہ اور ہراساں رہنے کے وجوہ مختلف اور معقول ہیں۔ کسی بھی سوسائٹی میں اقلیت بن کر رہنا کوئی آسان اور خوش گوار بات نہیں ہے۔ حقوق اور آزادی، خواہ نامکمل ہی کیوں نہ ہوں، اپنی اہمیت رکھتی ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر دینا حماقت ہے۔ راتلیتوں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ وہ خامیوں کو تو دیکھتی ہیں اور اُن کی شکایت کرتی ہیں مگر حقوق اور آزادی



کو خواہ وہ کسی درجہ کی ہوں، تحسین کی نگاہوں سے نہیں دیکھتیں) لیکن اس حقیقت سے بھی آنکھ پڑانا غلط ہے، خواہ اقلیتوں کو کتنی ہی آزادی ہو اور کتنے ہی حقوق ملے ہوں، انسانی مسائل کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ اس میں اقلیت کا کوئی فرد پورے اطمینان اور بھروسے سے نہیں رہ سکتا۔ اس کی زندگی مختلف قسم کے دباؤ سے دوچار رہتی ہے تاریخ انسانی کی تلخ حقیقتوں میں سے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی شخصیت اُس آزاد نشوونما کی برکتوں سے محروم رہتی ہے جو ایک آزاد جماعت کے رکن کا حصہ ہوتا ہے۔

جہاں تک ہندوستان اور ہندوستان کی مسلم اقلیت کا تعلق ہے، یہ بات بڑی غیر ذمہ داری کی ہوگی اگر دستور ہند کی آئینی دفعات کا صحیح اندازہ نہ لگایا اور حکومت اور سوسائٹی کی لبرل اسپرٹ (Liberal Spirit) کو جیسی کہ وہ اس وقت پائی جاتی ہے، پیش نظر نہ رکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نا انسانی کی بات ہوگی اگر ماضی سے درشہ کے طور پر ملے ہوئے مختلف عوامل اور حال کے واقعات کی رفتار سے جو بھائی چارہ کے احساس اور انسانیت کی فضا کی طرف نشاندہی کرتی ہے، اصرار ہوتا جائے۔ سیکولر ازم اور بغیر کسی امتیاز کے جمہوری انصاف کی منزل یقیناً ابھی دور ہے اور ابھی یہ محض نصب العین ہی ہے لیکن اس موقع پر اس سبق کو یاد رکھنا چاہیے جو فسطائیئت نے ہم کو یاد دلایا ہے: یعنی یہ کہ جمہوریت کی منانقاہ نمائش اور جزوی انصاف کا نمائشی اعلان بھی اپنی اضافی قدر و قیمت رکھتا ہے، اس قسم کے کسی نمائشی نصب العین سے کہ بیت کے مسلم ممبرتیاں رہے نہ صرف مشہور و معروف اور مدت العمر کی بانی بیچانی مولا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بلکہ آئن اور ہر دل عزیز رفیع احمد قدوائی جنہوں نے تن من سے ملک کی خدمت کی اور آزاد ہندوستان کے شروع کے بحرانی سالوں میں مسئلہ خوراک کو حل کرے میں کامیاب رہے۔ ان کے علاوہ دوسرے نابالغ مسلمانوں نے بھی سفیر، سول سروس، کشتی و خیرہ کی حیثیت سے اپنے ملک کی خدمت کی اور دہلی کے قریب جامعہ ملیہ نے جس نے پہلے سے ہی اپنا اعتبار قائم کر رکھا ہے، اپنے آپ کو ترقی و توسیع کی راہ پر گامزن پایا۔ کم اہمیت رکھنے والے مسلمانوں نے بہر حال یہ بات ضرور کہی کہ اس قسم کا کام ان لوگوں کے لئے آسان تھا جو شہر پر رکھتے اور چوٹی کے اشخاص شمار ہوتے تھے۔ گم نام اندر در دراز کے علاقوں کے مسلمانوں کے لئے یہ آسانی نہیں تھی۔

کا نہ ہونا اور کسی دوسرے خواب کی تعبیر کو عملی جامہ پہنانا کتنا تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے ہندی مسلمانوں کی ایک بہت چھوٹی سی تعداد نے اس قوم کے (جس کے کہ وہ ممبر ہیں) اعلیٰ مقاصد کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ان کے حصول کے لئے حکومت اور دوسرے رہنماؤں کی دیا تدارانہ جدوجہد کو خراج تحسین ادا کیا۔ فرقہ وارانہ امتیاز سے بالاتر ہو کر اسٹیٹ نے خالص انسانی فلاح و بہبود کے متعلق جن مقاصد کا باضابطہ اعلان کیا ہے وہ حقیقتاً بڑے گراں بہا ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ، سوسائٹی میں وہ ہندو اور غیر ہندو رجحانات جو ان مقاصد کے حصول کے لئے کم از کم کچھ لوگوں کو حوصلہ بخشتے ہیں، ان کی بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ یہ چھوٹی بات نہیں تھی کہ ہندوستانی قوم کے ہندو رہنماؤں نے سیکولرزم اور انسانیت کے نام پر ہندو اکثریت کے مسلمانوں سے انتقام لینے کے فطری اور بنیادی طور پر خوقناک جذبہ کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے۔

دوسری طرف یہ بھی ایک قابل انکار حقیقت ہے کہ اقلیت اقلیت ہی ہے۔ اس کی کوتاہیاں اور بایوسیاں، اس کا خوف اور اس خوف کے اسباب بھی مسلم ہیں۔ یہ لسانی، معاشی، سیاسی اور اس قسم کے دوسرے اسباب ہیں جو حقیقی اور بڑے ہیں۔

مسلمان ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی زبان سے جسے مذہب کے بعد دوسری اہم چیز سمجھتے ہیں، محروم نہ ہو جائیں۔ گزشتہ ۹ سالوں میں جب کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں حالات بتدریج رو بہ اصلاح رہے ہیں، زبان کا مسئلہ جوں کا توں ہے اور حالات کی بہتری کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ اور باوجود ہندوستان کے آئینی، جمہوری اور سیاسی نظام کے اور ہندو فلسفہ کے اس عنصر کے ہوتے ہوئے بھی انسان کی اہمیت بحیثیت انسان کے پرکھنی چاہیے، ہندو مذہب میں ذات پات کا نظام اپنی تمام تنظیمی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے ذات پات کا یہ سسٹم اپنے پیچھے بدلتا ہی رہتا ہے۔ اور اس کے ۷ میوں کو اس کے قیام پر اصرار ہے لیکن یہ جمعی صحت سے۔ انسانیت کا یہ پانچواں گنوت ہمیشہ کرنے میں جو ناکامیاں ہوئی ہیں ان کی طویل

تاریخ میں سماجی بے انصافی اور متشدد اور مغرورانہ عدم مساوات کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ شروع میں ہم نے جو یہ کہا تھا اور جس کی وضاحت ابھی باقی ہے کہ ہندوستان کی مسلم جماعت ایک بڑی اہم اور تخلیقی کارنامے انجام دے سکنے کی پوزیشن میں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کے سامنے اپنا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

انتشار جس کا سبب پاکستان ہے | مسلمانان ہند کی مسلسل پریشانیوں اور احساس عدم تحفظ کا ہندو فرقہ پرستی کے بعد سب سے بڑا سبب پاکستان کا رویہ رہا ہے۔ ان کی زندگی کے انتشار میں پاکستان کے مسلمانوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بعض حیثیت سے تو یہ محض پاکستان کا وجود ہے جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی پوزیشن کو کمزور کر دیا ہے۔ اس کے قیام سے مسلم اقلیت بہت چھوٹی بن کر رہ گئی۔ غیر منقسم ہندوستان میں یہ صورت حال نہیں تھی۔

مزید برآں، ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں نے تمام دوسری پیشکشوں کے خلاف قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر نئے ہندوستان میں اپنی اسی خاص حیثیت کے استحقاق کو خود ہی رد کر دیا۔ (ان لوگوں نے ناقابل برداشت حد تک ایک بڑا مطالبہ کیا اور ہم نے اسے مان لیا۔ اب انھیں خاموش رہنا چاہیے۔) ایک مسلم کسان جس نے سرٹیا کہی کسی سیاسی تحیل کا سودا ہی نہیں سمایا تھا، اپنے گاؤں میں اس تنہا میز خنہ کے ساتھ اٹھکے کھا سکتا ہے۔ ”تم کیوں نہیں نکل جاتے؟ تم کیوں نہیں اپنے ہندوستان کا رہنے بیٹھے؟“ ورس نے چار سہ کی چٹخ و نیگار دیکھ کر کہہ دیا: ”میں بھی نہیں پاتی“

بہر حال، پاکستان کے قیام کے بعد مسلمانان ہندوستان نے اپنے علاقے میں اپنی اپنے آپ کو اٹھال سکنے تھے اگر اس سوائے ملک قومی سرگرمیاں ہی زیادہ ہیں۔ اس علاقہ میں مسلم مفادات کی فروغ و ارادہ جیہ نے ان بنیادوں پر جن ”بقولہ“ اور ”پہا“ گیارہوں نے سہ ہدیار کے مرد مسلمانوں کو یہ مسائل پہنچائے ہیں مدد دی ہے۔ تقسیم کے بعد فوراً ہی یہ چیز شروع ہو گئی کہ پاکستانی مسلمانوں کے ناگہان کمزور



اور ہندوؤں کا قتل عام کیا اور انھیں جلاوطن کر دیا۔ مجموعی طور پر ہندوستان نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ یہ خوفناک صورت حال دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ہے۔ اس کے رہنماؤں اور مختلف شہریوں نے انسانیت کے اصولوں کے معیار پر اس طوفان و ہنگامہ کو جانچا اور "تاریخ ہند" کے اس تاریک ترین باب "پراسوس اور ندامت کا اظہار کیا۔ برخلاف اس کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ وہ تعصب کی تنگ نایوں سے نکل کر اپنے اس تقریباً مساوی جرم کو تسلیم کرتا۔ اس ملک کے مسلمانوں کو عام طور پر اس احساس نہیں ہے کہ دوسری طرف بھی لاکھوں آدمی اس خوفناک مصیبت کا شکار ہوئے۔ اس حشرانہ پاگل پن کو محسوس کرنے اور تسلیم کرنے کی ذمہ داری مسلمان ہند پر ڈال دی گئی جنہوں نے اپنے درمیان غضبناک پناہ گزینوں کو خوف اور شہی کا موڈ لئے ہوئے کارواں درکارداں آتے دیکھا۔ انہوں نے اس پاگل پن کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ جزوی طور پر اس کی قیمت بھی ادا کی۔ (باقی)

سے سردار شیل نے بنگلور میں کانگریسیوں کے ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے (۲۵ فروری ۱۹۵۸ء) ان لوگوں پر سخت تنقید کی جو "ہندو راج" اور "ہندو کلچر" کاغذ لگاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "گانڈھی جی اس پر فریب تجیل سکے لیکن مخالفت تھے لیکن ہم نے ان کی نہیں سنی اور جب ہم کو آزادی ملی تو ہم جانتے ہیں کہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا سلوک کیا، اب یہ تاریخ کا ایک افسوسناک واقعہ ہے اور ہمیشہ کے لئے ہندوستان کی تاریخ میں اس کے تاریک ترین باب کی حیثیت سے محفوظ ہو گیا ہے۔" — ہندوستان ٹائمز، نئی دہلی ۲۶ فروری ۱۹۵۸ء۔

یڈروں کے اس قسم کے بیانات کے علاوہ اس مصنف نے مولوی شہریوں کو بھی رکھتے میں سکھ میکیسی چلانے والے اور ہندو پناہ گزینوں سے ٹرینوں میں ممانعت ہوتی ہے) اسی قسم کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے پایا ہے یہ سب ذمہ داری کشیدگی اور متنزہ پر اسوس کرنے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کے نتائج انسانیت کے لئے باعث فہم ہیں۔ سچ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کس طرح کتنی نسل غارت گری ہوئی اور کہاں کہاں لوگوں کو کتنی کتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال ۱۹۵۸ء میں اس مصنف نے بڑی توجہ سے اس کی تحقیق کی، خاص طور سے ان عیسائی رفاکاروں کی مدد سے جو شہرنا رہنما تھے اور خواہشہ عورتوں کے کمپوں میں کام کرتے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ پتہ لگانا دشوار ہے کہ کس طرف زیادہ ہنگامہ ہوا یا اس تنازعہ پر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں دونوں طرف شاکھ ہوا تھا کہ اسوس اور ندامت کا اظہار کیا جائے لیکن ۱۹۵۸ء میں بھی پاکستان میں حکومت اور شہریوں کی طرف سے جو کچھ اور شائع کیا جا رہا ہے اس میں ۱۹۴۷ء کے خون خرابے کے متعلق اپنے آپ کو کبھی متہم نہیں کیا جاتا۔ پاکستان میں بعض اردو ناولیے لکھ گئے ہیں جن میں ۱۹۴۷ء کے واقعات کو فرقہ وارانہ انداز میں پیش کرنے کے بجائے شافی نقطہ نظر سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام رجحان میں ابھی کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ [معیاری رجحان ایک شان: حکومت کی طرف سے شائع کی ہوئی۔ پاکستان، دی

# مصر نے انیس سو میں — ایک ادیب معاشرے کا وزیر

(جناب عابد رضا صاحب بیدار)

پنجاب کے مشہور اخبار، پیسہ اخبار کے مالک و رایدیر منشی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء میں تقریباً چھ مہینے یورپ اور ممالک اسلامیہ کی سیاحت میں گزارے۔ ۲۷ مئی کو ہندوستان سے روانہ ہوئے اور ۱۹ نومبر کو بمبئی واپس پہنچے۔ ستمبر ۱۹۰۸ء میں سفر نامہ یورپ کے نام سے انھوں نے اپنے حالات سفر شائع کئے۔ یہ سفر نامہ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تقریباً ۷۷ صفحے مصر پر لکھے ہیں۔

غیر ضروری اور اتشائے باتوں سے قطع نظر انھوں نے اپنے جو کچھ مشاہدات بیان کئے ہیں وہ دم توڑتی ہوئی انیسویں صدی کے مصر کے عینی شاہد کی حیثیت سے ایک معاشرہ ستادہ کی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ سن کے اصل الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے حافظ عبد الرحمن امرتسری کے سفر نامہ مصر کے ضمیمہ کے طور پر یہ اقتباس بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور خالی از قاعدہ نہ ہوگا: (امرتسری کے سفر نامہ مطبوعہ برہان، اکتوبر، ۱۹۵۸ء کے سلسلہ میں ایک اہم غلطی کا اعتراف کروں۔ شبلی کا سفر نامہ روم و مصر و شام ۱۹۱۴ء میں نہیں ۱۸۹۲ء میں شائع ہوا ہے لیکن اس میں مصر کے بارے میں کوئی نادر

سہ پیسہ اخبار ۱۸۸۷ء میں گوجرانوالہ سے شائع ہونا شروع ہوا۔ بعد میں یہ لاہور آگیا۔ قیمت کی ارزانی اور خاص کر اپنے نام کے سبب یہ چل نکلا۔ محبوب عالم نے یڈ میر کی ساری قیمتی خصوصیات موجود تھیں یہ اخبار سے پہلے بھی کئی اخباروں کے ایڈٹ کرنے کا انھیں تجربہ تھا۔ سفر کا شوق اس پر مستزاد تھا جس سے چشم دید احوال حاصل جاتی تھیں۔

مولانا آزاد کے اہلال، ۱۹۱۴ء کے جنوری۔ جون کے کسی شمارہ میں بھی ان کے ایک سفر کی اطلاع ہے۔ وہ اس وقت یورپ میں تھے۔ پہلے سفر کے موقع پر اقبال نے ایک طویل اوداعی نظم بھی ہی تھی جو سفر نامہ میں شامل ہے اور اس لحاظ سے اقبال کے نوادر میں سے ہے کہ یہ ان کے کسی مرتب مجموعے میں نہیں ملتی۔ منشی محبوب عالم کا تذکرہ مختلف اخباروں کے ذیل میں، اردو اخبارات کی پہلی تاریخ اختر شائع ہی میں، جگہ جگہ ملتا ہے۔ پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ ”دومی زبان۔ کراچی۔ یکم دسمبر ۱۹۵۸ء (اگست ۱۹۵۸ء) صفحہ انور قریشی، میں بھی ان کے بارے میں کچھ تفصیلات دی گئی ہیں۔ سہ سفر کے ۸ سال بعد اشاعت

یا اہم اطلاع درج نہیں) :

”... پورٹ سیداب خاصا بارڈن شہر (۸۹۷ء آبادی ۲۰۹۵۴) یورپین طرز کا سمندر کے کنارے اور نہر کے دہانے پر واقع ہے... شہر سے لگ ایک طرف تھوڑی سی آبادی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سیویوں کی آبادی ہے جسے شہر سے لگ کر دیا گیا ہے... (صفحہ ۹۱۶)

مصر میں ہر چیز گراں ہے، بلکہ قاہرہ میں تو بعض چیزیں اور مکانات یورپ کے بھی گراں ہیں... (صفحہ ۹۱۷) اجنبی کو پورٹ سید میں جو بات سب سے نرالی معلوم ہوتی ہے، وہ عورتوں کا ایک برقعہ یا پردے کا سامان ہے اور یہی اسکندریہ، قاہرہ اور سوئس میں عورتوں کے چہروں پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ ایک لکڑی یا پتیل وغیرہ کی ریل کی صورت کی چیز ہوتی ہے، جس پر تانگا پر دو کراس کو (صفحہ ۹۱۸) سر سے ایسے طور سے باندھا جاتا ہے کہ یہ سیدھا ناک کے طول پر تھم رہتا ہے۔ اور ناک کے نیچے سے ایک سیدھا دروازہ نکلتا ہے۔ تک لگتا ہے پیشانی پر سیاہ یا سفید پٹی باندھی جاتی ہے جس سے وہ عورتوں کی آنکھیں نشانی رہ جاتی ہیں اور باقی جسم سیاہ چادر سے خوب ڈھکا ہوا ہوتا ہے... (صفحہ ۹۱۹)

اسکندریہ میں... ایشیاء، الابہرہ، روزانہ اخبار، فرانسیسی اخباریں، بھوار رسالہ کے علاوہ ایک فرانسیسی اخبار ”الایژینڈری“ اور یونانی بولنے والے... کے عددیں زمین خبر بہت کہتے ہیں... یہاں میوہ جات کثرت سے ہیں جن سے دکانیں بھر بیٹھتی ہیں۔ ان میں سے اکثر لیموں سے آئے ہوئے میوے بھی ہیں... (صفحہ ۹۲۰)

رات دن میں تین تین میل گاڑی سکتا۔ یہ زمانہ کہے میں آتی جاتی ہے۔ فی صدام میں ہے میں بچے صبح کو سوار ہو کر ایچ بی بی کے پاس پہنچ گیا... (صفحہ ۹۲۱) راستہ میں آٹھ دس اسٹیشن پڑتے ہیں جن میں غلط سب میں بڑا سے درجہ پیدائشی عید رحمتہ کا دفن ہونے کے مصریوں کی نفوس دلیا ہی قابل احترام مقام ہے جیسا کہ سب شوق کے مسلمانوں میں پختہ عید رحمتہ کا دفن ہونے کے مصریوں کا مزار ہے۔ مصری یوں بھی بڑے بڑے پرست معلوم ہوتے ہیں... (صفحہ ۹۲۲)

دیکھتے ہیں صفا گزشتہ کی روح سے سفر، میں اتنی مشاہدات کے ساتھ کہ وہاں میں جتنے واقعات بھی شامل کروئے ہیں لیکن سب مستند ذرائع سے۔



ہر چند کہ یہاں برقی ٹریموے بہت دور تک چلتی ہے۔۔۔۔۔ اور یہاں کے تنگ بازاروں میں چھوٹی چھوٹی بس گاڑیاں اور زسٹوریا گاڑیاں گھوڑوں سے چلتی ہیں لیکن سب سے بڑی سواری یہاں کے گدھے ہیں جو گو بہت چھوٹے قد کے ہوتے ہیں مگر بڑے تیز کام سبک رفتار اور مضبوط ہوتے ہیں۔۔۔ ان کا کرایہ بھی سست پڑتا ہے۔۔۔ اس لئے بہت لوگ اس سواری کو پسند کرتے ہیں۔ اس واسطے جا بجا زروں میں کسے کسائے گدھے مع خریانوں کے نظر آتے ہیں یہ گدھے دالے اکثر لڑکے ہوتے ہیں جو تیز رفتاری میں اپنے گدھوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔۔۔ (صفحہ ۹۱)

اہل مصر ج کو گ کی طرح تنقہ کرتے ہیں۔۔۔ (صفحہ ۹۱) ث کو ت کی طرح۔۔۔ جیسے کثیر کو کثیر اور د کو جب کہ وہ آخر کلمہ میں ہو ڈ کہتے ہیں مثلاً علی طریق ارشاد کو رشاڈ پڑھیں گے اسی طرح ق کو الف جیسے قدیم کو اذیم۔۔۔ (صفحہ ۹۱)

بخلاف ترکی کے مصر میں بھی ہر مصری یورپین لباس نہیں پہنتا۔۔۔۔۔ (صفحہ ۹۲)

سب لوگ سوائے ترکوں کے جو۔۔۔ آندھی کہلاتے ہیں، مصری کہلاتے ہیں۔۔۔ مصر کی تمام آبادی مع ترکی اور عربی جزو کے ترکوں اور شامیوں سے شائستگی اور قابیت میں بہت پیچھے ہیں۔۔۔ (صفحہ ۹۲)

۱۸۹۲ء میں خدیو توفیق نے انتقال کیا جب کہ وجودہ خدیوہ مع اپنے چھوٹے بھائی کے دیا نا میں تعلیم پاتے تھے۔۔۔ خدیو عباس بڑے روشن ضمیر اور لایق حکمراں ہیں اور بالکل اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ حکمرانوں کی طرح حکومت کرتے ہیں۔ سوائے عربی اور ترکی کے، فرانسیسی، جرمنی اور انگریزی بخوبی جانتے ہیں مگر چوں کہ ایک طرف مصر پر ترکی کی ماتحتی اور دوسری طرف انگریزی کی نگرانی کا بار ہے، اس لئے ان کی حکومت عجیب و غریب حکومت ہے۔

غیر صیاد و غیر باغبان ہے۔۔۔۔۔ در عملی میں ہمارا آشیں ہے

گو گزشتہ چھبیس سال سے مصر پر انگریزی فوج کا قبضہ ہے لیکن چوں کہ فرانس نے اس

قبضہ کو تسلیم نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ اس لئے انگریزوں نے اپنی من و مانی حکومت نہیں کر سکتے تھے لیکن ۱۹۰۴ء

سے انگلستان نے فرانس سے مصر کے متعلق یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ فرانس انگلستان کے قبضہ مصر کی راہ میں حائل نہ ہو اور اس کے عوض میں انگلستان نے فرانس کو مراکش کی مداخلت کا پورا اختیار دے دیا ہے ... (صفحہ ۹۲۶)

اس طرح سے جو کبھی انگلستان کے مصر خالی کر دینے کی امید تھی وہ بھی جاتی رہی ہے۔ گو پہلے پہل انگلستان و فرانس نے قرضہ مصر کے انتظام کے لئے مصر میں مداخلت کی تھی مگر اب نہ سونے جو ہندوستان کا شاہراہ ہے انگلستان کو ہرگز مصر چھوڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جب تک کہ ملک ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وہ ضرور مصر کو اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ اس لئے مصر میں جو 'سلف گورنمنٹ' اور 'مصر مصریوں کے لئے' کی خواہش سے قومی فریق قائم ہوا ہے، سر دست کوئی امید نہیں کہ انگریز اس کی پکار کی طرف توجہ کریں ... (صفحہ ۹۲۶)

فرانس اب ۱۸۸۷ء کی طرح تخیل مصر کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ ٹرکی اپنی حالت میں خود حیران ہے ... ان حالات میں سوائے اس کے کہ مصر مدت مدید تک انگریزی نگرانی میں رہے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ گو ظاہر آنگریزی ایجنٹ صرف نگرانی کرتا ہے لیکن درحقیقت حکومت کی زمام کار اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے ... (صفحہ ۹۲۶)

لیکن یہ صریح بے انصافی ہوگی اگر ہم انگریزی قبضہ مصر کی برکتوں کو صرف اس وجہ سے نظر انداز کر دیں کہ انگریزوں نے بے انصافی سے اور اپنے ابتدائی وعدوں کے خلاف مصر پر اپنے قبضہ کو طول دے رکھا ہے۔ اگر صرف ایک بات، آزادی پریس ہی کو لے لیا جائے تو اس کی بدولت اہل مصر کو اس قدر فوائد حاصل ہوئے ہیں کہ جن کا حصر میں آ سکتا مشکل ہے۔ اس وقت مصر بلحاظ اشاعت اخبارات، پولیٹیکل مضامین پر آزادی سے بحث کرنے اور ہر قسم کی علمی کتابیں چھاپنے میں یورپ کے، چھپے، چھپے ملکوں کے برابر ہے۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت صرف ۱۸۹۷ء تک کے اعداد ہیں۔ انگریزی قبضہ، بغاوت عربی پاشا فرد کرنے کے بعد ۱۸۸۲ء سے شروع ہوا اور اس پندرہ سال کے عرصہ میں مصر میں حسب ذیل تبدیلیاں ترقی ہوئی:

۱۸۸۲ء میں مصر کی کل آبادی ۶۸ لاکھ ۱۳ ہزار تھی جو ۱۸۹۷ء میں ۹۷ لاکھ ۳۴ ہزار ہو گئی....، شہروں اور موصعوں کی تعداد ۳۲۲۷۷ تھی جو ۱۸۹۷ء میں ۲۸۱۴۱ ہو گئی، محاصل ۹۰ لاکھ پونڈ تھے جو ۹۷۷ میں ایک کروڑ ۱۰ لاکھ پونڈ تک پہنچ گئے (سجالیہ بعض محصولات و شکیس کاشتکاروں کے معاف کئے گئے)، تجارت درآمد ۱۰ لاکھ ۸ ہزار ۸۰۰ تھی جو ۲۲ لاکھ ۶۲ ہزار ۸۰۰ ہو گئی، محصول چونگی ارضائی ۱۰ لاکھ پونڈ..... ۳۰ لاکھ ۹۳ ہزار پونڈ تک پہنچ گیا، کل ملک میں ۳۴۴ اڈا کھانے تھے جو ۸۸۷ ہو گئے، تقریباً پانچ ہزار لڑکے مدارس میں تھے جو دس ہزار ہو گئے اور معلموں کی تعداد ۳۴۷۷۷ تھی جو ۱۸۹۷ء میں ۸۰ لاکھ ۲۶ ہزار پونڈ سے اوپر ہے (۹۲۸) ۱۸۸۰ء میں مصری قرضہ کی تعداد ۹ کروڑ ۸۷ لاکھ پونڈ تھی اور سود و ادائیگی ۳۰ لاکھ ۶۰ ہزار پونڈ تھا جو ۱۸۹۷ء میں ۹ کروڑ ۶۰ لاکھ پونڈ اور سود وغیرہ ۳۸ لاکھ ۶۳ ہزار پونڈ رہ گیا، اسی طرح آج تک بہت کچھ ترقی ہو چکی ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں کل محاصل ایک کروڑ ۸۷ لاکھ پونڈ سے متجاوز تھے اور تعداد طلباء مدارس سرکاری میں ۱۹۰۵ء میں انیس ہزار تک بڑھ گئی ہے۔ ۱۸۸۳ء میں لارڈ ڈفرن نے حالات مصر کی جو رپورٹ لکھی تھی اس میں اس ملک کی تعلیم کا یوں تذکرہ کیا تھا: (۹۲۹)

”اس وقت مصر میں جتنے مدرسے موجود ہیں وہ تین قسم کے ہیں:

اول جامع الازہر، اس میں آٹھ ہزار طالب علم ہیں جن کو تین سو استاد تعلیم دیتے ہیں اور اس میں علوم ذیل پڑھائے جاتے ہیں: علم کلام، فقہ، نحو، منطق اور عربی زبان دانی۔  
دوم: وہ مدرسے جن کو مصر میں غیر مالک کے لوگوں اور ان کی مشنری جماعتوں نے قائم کیا ہے۔ ایسے مدارس کی تعداد ۱۵۲ ہے اور ان میں ۱۲۲ طالب علم پڑھتے ہیں۔ طلبہ کی اس تعداد میں ۶۴۱۹ خاص مصری لڑکے ہیں جن کی ۵۲ فی صدی۔ اور ان مدارس میں بعض مدرسوں کو حکومت مصر کی طرف سے مالی مدد بھی ملتی ہے۔

سوم: خاص حکومت کے مدارس اور ان کے چار درجے ہیں (۳۲-۹۲۹)



۳۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو سرکاری نگرانی میں آٹھ مختلف پیشوں کی تعلیم کے کالج، چار خاص ٹکنیکل اسکول، ۳ سکندری درجہ ۳ پرائمری اسکول تھے جن میں ہتمامہ یا ایک حد تک فرانسیسی یا انگریزی میں تعلیم دی جاتی تھی۔ ان میں ۷۴ مدرسین اور ۱۰۳۱۲ شاگرد تھے جن میں ۳۷۸ لڑکیاں تھیں۔ ان کے علاوہ سات خاص اور ٹکنیکل اور ۱۰۹ پرائمری تھے جن میں صرف عربی زبان میں تعلیم ہوتی تھی۔ ان میں ۲۵۲ استاد اور ۸۳۵۰ استاد تھے (جن میں ۱۹۰۲ لڑکیاں تھیں) اور ۱۳ پرائیویٹ پرائمری اسکول درجہ ۳۲۴ کتاب جنہیں سرکاری افسران تعلیم معائنہ کرتے ہیں ان کے علاوہ ہیں۔ . . . .

جامعہ الازہر میں ۹۷۵۸ طلباء جو علوم دین کی تعلیم ۳۱۷ استادوں سے حاصل کرتے ہیں اور جامعہ الاحمدی طنطا میں ۵۱۶۱ طلباء ۷۰ استادوں سے علم دین پڑھتے ہیں۔  
مصر کے ان سرکاری، ابتدائی (مڈل) اور تہجیری پاشا نوئی (ہائی) اسکولوں میں نصاب تعلیم حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے: (صفحہ ۹۷۳)

مدارس ابتدائی: القرآن والا سلام، اللغة العربیہ، الترجمة، الخط، الحساب،  
الہندسہ (مبادی قیلہ)، انگلیزیہ (اوانفرانسیہ)، دروس الاشیاء، الجغرافیہ الرسم (مصور کا  
التاریخ (مبادی)۔

مدارس ثانوی: الترجمة، اللغة العربیہ، انگلیزیہ (اوانفرانسیہ)، الریاضیات،  
الجغرافیہ، التاريخ، الطبیعیات، الکیمیا، الرسم (مصور)، التمرین (عضلی ورزش)  
... اگرچہ مرحوم شیخ محمد عبیدہ کی جدوجہد ترقی الازہر میں ناکام رہی تاہم انھوں نے  
طلبہ کے دلوں میں تاریخ، طبیعیات وغیرہ علوم جدیدہ کے مطالعہ کا شوق ضرور پیدا کر دیا  
جس کی وجہ سے اب بعض طلبہ کسی قدر ان علوم کی کتابیں دیکھنے اور آزادی بحث اور خواہش  
درست علویات اور مفید علوم میں تمیز کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہو گئے ہیں اس وقت ازہر  
میں دس ہزار سے زائد سب علم باعتبار سکونت مختلف گروہوں میں منقسم ہیں اور ہر فرقہ مسجد

کی تھت یا پڑوس کے ایک مکان میں رہتا ہے جس کے اندر بہت سے حجرے ہیں اور یہ مکان رواق کہلاتے ہیں۔ الازہر میں ایسے ۲۷ رواق ہیں منجملہ ان کے اخاص سرزمین مصر کے باشندوں کے لئے ہیں جن کی تقسیم شہروں یا مذاہب کے لحاظ سے ہے ... (ص ۹۲) معلوم ہوا کہ نہ طلباء کی کوئی مستقل جماعت بندی ہے نہ وقت کی پابندی نہ رجسٹر حاضری، نہ سالانہ امتحان کی قید۔ اس لئے بعض لوگ ساری عمریں ازہر میں خرچ کر دیتے ہیں اور کسی منزل تک نہیں پہنچتے ... (ص ۹۳) ۱۹۰۲ء میں ... (ص ۹۴) ہندی طلباء ۳۰ (تھے) ... (ص ۹۵) قاہرہ میں بہت سے روزانہ ہفتہ وار اخبار اور ماہوار رسالے عربی زبان میں شائع ہوتے ہیں جن میں بعض مسلمانوں اور بعض عیسائیوں کے ہیں۔ روزانہ اخبارات میں الموبد سب سے بڑا اخبار ہے اور اب اللہ ابھی ترقی کر رہا ہے اور برقی طاقت سے شائع ہوتا ہے۔ گو الموبد کے ہوشیار مالک شیخ علی یوسف صاحب کی ایماقت اور رسوخ سے ان کا سکا پ بیٹھ چکا ہے کہ مہر کے چھلے چھلے لوگ الموبد سے رستہ نہیں۔ الموبد دولت عثمانیہ کا طرقدار ہے مگر نگر نری قہضہ مصر سے بھی ظہار مخالفت نہیں رہا اور شاید دنیا میں مسلمانوں کا سب سے بڑا اخبار ہے، اب سے شیخ ... بڑی ہریانی بر شیت سے پیش آئے در ان سے دینین ملاقاتیں ہوتیں۔ آخری روز جب میں سے رخصت ہوا، تو انیسوس کرتے تھے کہ میں نے اتنی جلدی رخصت ہونے کا ارادہ کر دیا۔ اس پر انھوں نے میری کچھ کیفیت حسن ظن کے ساتھ اس روز کے الموبد میں شائع کی اور مجھے اپنا فوٹو گراف بھی دیا۔ یہ وہاں پہنچے چوٹے قد کے آدمی ہیں اور وطنی لباس پہنتے ہیں۔ سوائے عربی زبان کے کوئی مغربی زبان نہیں جانتے مگر عربی لکھتے اور معاملات کے سمجھنے میں بڑے دقیق ہیں۔ ان کے نائب ایڈیٹر نگر نری اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں۔ دوران گفتگو میں میں نے ان سے ذکر کیا کہ ہندوستان میں نگر نری زبان سے اخبارات دسی ۹۵ زبان کے اخبارات سے زیادہ مغرزا اور بڑے ہوتے ہیں انھوں نے ہا مصر میں صورت اس کے برعکس ہے۔ وہاں عربی زبان کے اخبارات سب سے بڑے ہیں ... میں نے پوچھا الموبد کی اشاعت کس قدر

ہے، آپ نے کہا آٹھ ہزار روزانہ ہے۔ یہ شاعت ہندوستان کے شاید ہی کسی انگریزی اخبار کی بمشکل ہو۔ مصر میں بازاروں میں اخبارات بکنے کا رواج بہت ہے اور عام لوگوں میں اخبار خرید کر پڑھنے کا مذاق بھی خوب پیدا ہو گیا ہے۔

میں مصطفیٰ کامل صاحب ایڈیٹر مالک الملواء سے بھی ملا جنہوں نے ابھی سال گذشتہ میں روزانہ اخبار جاری کیا تھا۔ لیکن ان کی ذات کی شہرت ان کے اخبار سے بھی زیادہ ہے۔ ایک چھپرے بدن کے خوبصورت نوجوان ہیں، یورپین لباس پہنتے ہیں۔ پہلے انھوں نے قانونی پیشہ کے لئے تعلیم حاصل کی تھی لیکن حب الوطنی نے جوش مارا۔ انھوں نے اس بات کی تائید میں لکچر دینے شروع کئے کہ انگلستان نے مصر میں عربی پاشا کی بغاوت کے وقت فوج بھیجتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ جب امن ہو جائے گا تو مصر خالی کر دیا جائے گا۔ لیکن اب اس بات کو مدت طویل گزر چکی ہے اور مصر میں ہر طرح سے امن بھی ہے۔ اب انگلینڈ اپنے وعدے کو الفا کرے۔ یہ عربی زبان کے علاوہ فرانسیسی میں بھی چھی تھری کر سکتے ہیں۔ . . . . انھوں نے خیر و عافیت کے بعد مجد سے چھپا کہ ہندستان میں تم لوگوں کا کیا حال ہے، تو میں نے کہا اچھا ہے۔ ہم لوگ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہمیں ہر طرح کی اصلاح اور ترقی کی آزادی حاصل ہے۔ . . . (صفحہ ۹۵۹) میں نے جو انان مصر کی تعلیم، قومی خیالات اور خصوص اور کیریئر کی نسبت ان کی رائے دریافت کی تو انھوں نے جواب دیا کہ بے شک وہ بہت ہوشیار اور معقول اور اہل خلوص ہیں۔ . . . . خاتمہ پر کہا کہ مصر میں کئی شیرخاڑوں میں سوتے ہیں جو بوقت ضرورت نکل آئیں گے۔ لیکن میرے ہمراہوں محمد بشکری اور عابدین آفندی نے مجھے راستہ میں یقین دلایا کہ مصر کے نوجوان اکثر نالایق ہیں۔ . . . بہر حال مصطفیٰ کامل صاحب ہوتا رہا اور پرجوش آدمی معصوم ہوتے ہیں۔ ان کا اخبار ترقی کر رہا ہے میرے واپس آنے کے بعد مصطفیٰ کامل پاشا کو بہت کامیابی ہوئی ہے۔ ان کے ہم خیال لوگ بہت بڑھ گئے ہیں اور ۱۹۰۷ء سے انھوں نے مصریوں کے قومی گروہ کے خواص و اشاعت کے لئے روزانہ الملواء کے ایک فرانسیسی اور ایک روزانہ اخبار



نے تاندر و ایجنیاں اور ”دی ایجینسین سینڈرڈ“ جاری کئے ہیں۔ مصر کی آزادی کے لئے کوشش کرنا اور باب عالی کی حمایت مصطفیٰ کامل پاشا کی پالیسی کا خلاصہ ہے۔

”المقطم“ یہ مسیحی روزانہ اخبار انگریزی قبضہ مصر کا اکیلا آرگن ہے۔ فارس نمبر... اس کا ایڈیٹر ہے۔ یہ اخبار خبروں میں متانت کا لحاظ رکھ کر اندرونی معاملات پر خوب لکھتا ہے۔ بکر عثمانی حکومت کی پالیسی پر ضرور منہ آتا ہے۔ وہ ترکوں پر بعض اوقات معقول اعتراض کرتا ہے۔ سب سے مقدم پالیسی اس اخبار کی، انگریزوں کی رضا جوئی ہے... (صفحہ ۹۶)

”الاسلام“ یہ بھی عیسائی روزانہ اخبار ہے جو عام مصری پبلک اور عثمانی پالیسی کو راہی رکھنا چاہتا ہے۔ بعض اوقات یہ فریخ حقوق کا بھی پاس کرتا ہے اور عموماً بے رود رعایت لکھتا ہے ان کے علاوہ ”المیسر و الظاہر“ وغیرہ اور کئی ایک روزانہ اور ہفتہ وار پولیٹیکل اخبار بھی ہر شے شائع ہوتے ہیں۔ ماہوار رسالے الہلال، المنار، الحیات، المقطوف، انوار الاسلام وغیرہ کئی نکلتے ہیں کہ جن کی فہرست بہت لمبی ہے۔ ان میں سے میں رشید آفندی صاحب ایڈیٹر المنار سے ملا یہ بڑے لائق اور فاضل نوجوان ہیں۔ السید محمد عبدہ صاحب مفتی دیار مصر آپ کے اعزہ سے ہیں۔ آپ نے ان سے میری ملاقات کرائی۔ مفتی صاحب علوم وینیات میں فاضل اصل ہیں اور زمانہ حال کے حالات سے بھی بے خبر نہیں۔ آپ نے اعلیٰ عہدے کی بہت سی ذمہ داریوں کے علاوہ اکثر سرکاری اور غیر سرکاری مجلسوں کے رکن رکین ہیں اور رفاہ عام کے کاموں میں مدد کرنے کے دل سے ساعی رہتے ہیں۔ مفتی صاحب نے ایک روز محمد سے مسلمانان ہندوستان کی تعلیمی کیفیت دریافت کر کے کہا کہ کیا ایسی دنیاوی تعلیم سے طلباء مذہب کو تو نہیں بھول جاتے۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا سوائے اسلام کے دیگر ادیان کے نیک لوگ بھی مستحق مغفرت ہیں یا نہیں فرمایا کہ جو نیک بندے خدا کو مانتے ہیں وہ بخشے جائیں گے۔ آپ نے اپنی تصنیف سے رسالہ التوحید اور تقریر مفتی دیار مصر کے کئی نسخے دئے۔ ایک روز میں زہر میں ن کے درس تفسیر... (صفحہ ۹۷) میں بھی شامل ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ ۱۹۰۵ء میں ایسے سلام کا انتقال ہو گیا ہے



# فارسی و اردو کی چند مکیاب کتابیں

## کتاب خانہ دانش گاہ دہلی میں

(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

(۳)

مقدمہ : سفرنامہ حکیم | دہلی کی گزشتہ اشاعت میں سفرنامہ ناصر خسرو کے اس مطبوعہ نسخے  
ناصر خسرو علوی بلخی کا تفصیلی تعارف کرایا گیا تھا، جسے شائع میں مولانا الطاف حسین  
حالی مرحوم نے مرتب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس قسط میں ان کے مقدمے  
کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو اردو داں حلقے کے سامنے پہلی بار آ رہا ہے۔ مولانا حالی کی  
تعلیم اگرچہ باضابطہ نہیں ہوئی تھی لیکن وہ اردو، فارسی اور عربی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔  
ان کی اردو نثر میں سادگی اور تاثیر کی خصوصیت ایسی تھی جسے ان کے ہم عصروں میں کوئی  
نہیں پہنچتا۔ ان کے مقدموں میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی  
بھی سادہ نثر لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ عربی میں ان کے دو ایک خطوط، مجموعہ مکاتیب  
میں شامل ہیں انہیں دیکھ کر مولانا کی عربی دانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ فارسی عبارت میں بھی  
سادگی اور بے ساختگی موجود ہے ان کی عبارت ”منشیانہ“ نہیں ہے نہ اس میں ”محدثا ہی  
روش“ ملتی ہے، اسی فارسی ہے جسے اگرچہ بیرون کی تحریروں کے سامنے تو پیش نہیں  
کیا جاسکتا، لیکن ہندوستانی فارسی دانوں میں شاید ہی دہلی کا ہم عصر اتنی پاکیزہ فارسی  
لکھنے پر قادر رہا ہو۔ یہاں ان کی فارسی عبارت کا قہور اس وقت سرا دیا جاتا ہے اس کے بعد  
پورے ”مقدمہ“ کا اردو ترجمہ۔ ترجمے میں کوشش کی گئی ہے کہ نہ لفظی نہ ہو، اصل کا مطلب



پوری طرح ادا ہو جائے اور بس۔

پہلے فارسی عبارت کا ایک ٹکڑا ملاحظہ فرمائیے :

”راس و رئیس مدعیان حکیم یکے مفتی خراسان بود خفّی المذہب دیگر حاکم بلخ کہ در اکثرے از اشعار دے روی شکایت بایشان است و تصائد بسیار کہ دریں خصوص گفتہ است دلالت دارد بر اینکہ تا آخر عمر از دوری وطن و جورا ہالی وطن می ناید و شب روز فریاد و زاری می کرد۔“

ترجمے میں ایک الترمیم یہ کیا گیا ہے کہ جہاں کسی فارسی عبارت کا اقتباس ہے وہ محولہ کتاب کے اصل الفاظ میں نقل کر دیا جائے۔ اُس کا ترجمہ ساتھ دے دیا گیا ہے۔ شار احمد فاروقی [

سیرت حکیم ناصر خسرو۔ صاحب سفرنامہ رقم زدہ کلک گہرسلک

جناب مولوی خواجہ محمد الطاف حسین صاحب انصاری پانی پتی مقیم

دہلی متخلص بہ حالی سلمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سجدہ و نصلی علی نبیہ الکریم

اس سفرنامے کا مصنف حکیم ابوالمعین ناصر بن خسرو علوی خطہ خراسان کے قدیم شاعروں میں سے ہے جو شاعری کے علاوہ علم و حکمت اور فضل و دانش میں شہرہ روزگار تھا۔ مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے اس کا حال لکھنے میں تحقیق و تلاش سے کام نہیں لیا۔ صحیح اور غلط روایتوں میں تمیز نہ کر کے انھوں نے اس کے حالات پر اور پردے گرادیے ہیں۔ چنانچہ اگر اُس کا یہ سفرنامہ در دیوان کے بعض جزا ہاتھ نہ گئے تو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ہم بھی اُن تذکرہ نگاروں کا اتباع کریں اور صحیح راتے سے دور جاڑیں۔

اس معاملے میں جتنا غور کیا جائے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم کے معاصروں میں سے کسی نے اُس کا حال لکھنے کی تکلیف نہیں کی اور بہت برسوں تک اُس کے حالات ضبط تحریر میں نہ آ سکے۔

بظاہر ان بے عفتیوں کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں شیعوں اور سنیوں کے علم و فقہاء جن کا آگے تذکرہ کیا جائے گا، اُسے فرقہ اسماعیلیہ کا پیرو سمجھتے تھے۔ ان اسماعیلیوں کا لقب ملاحہ سلف اسماعیلیہ کیا نامید گزردہ ہے جو اسماعیل بن جعفر صادق کو ان کے بعد امام برحق جانتا اور مانتا ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے

اور باطنی تھا۔

اس لئے غالب امکان ہے کہ زمانہ دراز تک دونوں فریقوں میں سے کسی نے اس نفرت کی بناء پر جو اختلاف مسلک کے تعصب سے پیدا ہوتی ہے حکیم موصوف کا ترجمہ لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی لیکن جب بعد کے زمانے میں حکیم کا دیوان اشعار اور دوسری تصانیف تمام ممالک میں پھیل گئیں اور اس کے معتقدوں کا گروہ کوہستان بدخشاں کے اطراف سے، جہاں حکیم موصوف کا مقدر ہے، جوق در جوق نکلنے لگا تو سب تذکرہ نگار اس کے حالات کی تحقیق اور اس کی تصانیف کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن ہوا یہ کہ جو کچھ طب یا بس انھیں ملا، یا انھوں نے عام لوگوں سے جو افواہ سنی اسے بے تکلف اپنی کتابوں میں داخل کر لیا۔ اور وہ افسانے بھی جو حکیم کے معتقدوں نے اپنی طرف سے گھڑ کر حکیم سے منسوب کر دئے تھے حکیم ہی کے اقوال سمجھ کر اس کی تصانیف سے رجوع کر کے کھرے کھوٹے کی تمیز کئے بغیر نقل کر دئے۔ اس طرح حکیم کے حالات پر گہرے پردے پڑتے چلے گئے اور صحیح واقعات کا کھنڈا لانا بہت مشکل ہو گیا۔ اگرچہ اب اس زمانے میں چارلس سیفر نامی ایک یورپی فاضل نے فرانسیسی زبان میں ناخبرہ کے حالات شرح و بسط سے لکھے ہیں لیکن فرسخ زبان سے واقف نہ ہونے کے باعث ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس تحقیق سے کہاں تک عہدہ برآ ہو سکا ہے اور کہاں تک اس نے داد تنقید دی ہے۔ لہذا اس کے حالات لکھتے وقت ہم صرف انھیں اقوال و روایات سے استفادہ کریں گے جو معقول اور قابل یقین ہیں ورنہ باقی اس کے اپنے کلام سے استنباط کر کے لکھا جائے گا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کرام جعفر صادق نے منصب امامت انھیں تفویض کیا تھا اور اس عیال کی ماں کے ساتھ کسی دوسری عورت یا نوٹھی کو جمع نہیں کیا تھا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ کے ہوتے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں دوسرا نکاح نہ کیا۔ نیز یہ لوگ اس عیال کو خاتمالانہ کہتے ہیں ورنہ ان کے بعد ہونے والے چھ اماموں کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ امامت کا مدار ست مرتبہ جس طرح سات دن، سات آسمان اور سات ستارے میں۔ حاکم اس عمل چمکے ہے ”وہ کجا داد تنقید دادہ است“ اس پر نشان لگا کر حاشیہ میں مولانا حاکم نے لکھا ہے ”تنقید معنی نقای“ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ..... کہ غلطی تک یہ لفظ نقد و انتقاد کے معنوں میں استعمال ہونے لگا تھا۔ لیکن ردی کسی اتنی قدیم عبارت میں اس کی سند ہماری نظر سے نہیں گذری۔ (فاروقی)

سال ولادت اس کے پہلا اختلاف اس کے سال ولادت کے تعیین میں ہے۔ حمد اللہ مستوفی قزوینی نے تاریخ گزیدہ میں ۳۸۵ھ ہجری نبوی لکھا ہے اور مصنف دبستان المذاہب نے ۳۷۵ھ۔ صاحب حبیب السیر ۳۸۵ھ بتاتا ہے لیکن یہ تینوں اقوال غلط ہیں۔ صحیح ترین قول وہ ہے جو رضا قلی خاں نے مجمع الفصحا میں نقل کیا ہے یعنی ۳۹۲ھ۔ چارلس شریف نے اپنے نوشتہ حالات میں یہی قول خراسانیہ کیا ہے اور خود حکیم کے قول سے استناد کیا ہے وہ اپنے بعض قصائد میں لکھتا ہے۔

بگذشت ز ہجرت پس سی صد تو دو چار بہاد مرا مادر بر مرکز اغبر

مولدائے بعض تذکرہ نویسوں نے حکیم کی اصل اصفہان سے بتائی ہے لیکن کوئی قرین اعتبار دلیل نہیں دی لیکن چند قرائن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ اسے اصفہان یا عراق عجم اور پارس کے دوسرے شہروں سے کوئی پشتینی تعلق نہیں رہا اس کے اسلاف اور بزرگ مامون الرشید کے عہد حکومت سے یاد دوسرے لفظوں میں یوں کہ جائے کہ امام علی بن موسیٰ الرضا کے زمانے سے جو ناصر خسرو کے آٹھ پشت اور دادا ہوتے تھے ہمیشہ خراسان میں رہے اور بلخ شہر جو ایک زمانہ دراز تک ولایت خراسان کا دارالسلطنت رہا ہے، یہی حکیم ناصر خسرو کا مولد ہوگا جیسا کہ خود حکیم نے کہا ہے۔

اے یادِ عصر گر گزری بر دیار بلخ بگذر بجائے من و آں جا بجوی حال

اور اسی طرح اپنے بہت سے اشعار میں خراسان اوائل خراسان سے جدائی پر افسوس کا اظہار کیا ہے جیسا کہ ہر شخص کو وطن سے دور ہونے اور غربت کے عالم میں ملال ہوتا ہے۔ سفر نامے میں بھی ایسی متعدد عبارتیں ہیں جو اس مر پر وضاحت کی روشنی ڈالتی ہیں۔

تعلیم بہر حال حکیم کا سلسلہ نسبیت واسطوں سے امام ہمام علی بن موسیٰ الرضا علیہ التحیۃ والثناء پر منتهی ہوتا ہے جو مشہد مقدس میں مدفون اور شاہ خراسان کے لقب سے معزز ہیں۔ کہا جاتا ہے

خداوند کریم امیر اشعار رضا قلی خاں شخص بہ بدایت کی تالیف ہے جو ۷۵۰ھ میں دارالسلطنت تہران میں شائع ہوا اور اب ہندوستان میں پہنچا ہے۔ حالی  
۳۸۵ھ عراق عجم اور پارس کا کسایرن کی دو ولایتوں رصیدوں کے نام ہیں مجازاً تمام مملکت ایران کو پارس کہا جاتا ہے۔ حالی۔



کہ حکیم نو سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید سے مشرف ہوا اس کے بعد ساہا سال تک معقول و منقول کے علوم مروجہ و متعارفہ کی تکمیل میں مشغول رہا اور علوم غریبہ و فنون متنوعہ مثل نجوم و رمل اور دوسرے تمام فنون جو اس عہد میں کمال کی سند سمجھے جاتے تھے اور ان کی تحصیل کے بغیر کسی کو فرائد و دانش مند نہ سمجھا جاتا تھا، حاصل کرتا رہا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ علوم دین اور فلسفہ و دانش کے علاوہ، جو اس نے مانے کے اہل اسلام میں رائج تھے، حکیم نے توریت و انجیل اور تمام مقدس مذہبی کتابوں کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور اتنا کمال ہم پہنچایا کہ فضلاء یہود و مسیحی اپنی مذہبی کتابوں کا درس حکیم سے لیا کرتے تھے جو کچھ خود حکیم کے کلام اور اس کے سفر نامے سے مستفاد ہوتا ہے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ عبرانی زبان اور رسم الخط سے واقف تھا کیوں کہ فلسطین کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بعض ایسے کتبوں کی تشریح کی ہے جو عبرانی زبان میں لکھے ہوئے تھے۔

دربار میں توسل القصد، کمالات علمی میں پوری دستگاہ حاصل کر لینے کے بعد وہ لوگوں کو درس دیتا رہا۔ اپنے درس میں وہ دقیق فلسفیانہ مسئلوں و نکات مغالقات کی توضیح و تفسیر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کسی تقریب سے پنج سے نکل کر مرو شاہجان میں آیا جو ان دنوں ردی حکومت کے زیر نگیں ہے۔ آج کل مرو اگرچہ تاتار کی مطلق العنان حکومت میں سمجھا جاتا ہے لیکن اگلے زمانے میں یہ ممالک خراسان کے شہروں میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور سبقتیوں کا پائے تخت تھا سلاطین عجم اور اسلامی سلطنت کے زمانے میں بہت سے علماء و فضلاء اس شہر میں پیدا ہوئے۔ بہر حال ناصر خسرو، مرو میں بہت مشہور ہوا۔ اُس عہد میں طفل بک سلجوقی نشا پور میں اور اس کا چھوٹا بھائی چغریک مرو میں مسند حکومت پر متمکن تھے۔ امیر ناصر کو چغریک کی خدمت میں قربت اور اختصاص حاصل ہو گیا اور وہ حکومت کے دبیروں میں شامل کر لیا گیا۔ جیسا کہ خود اپنے سفر نامے میں اُس نے لکھا ہے کہ وہ سعادت کے اعمال و اموال نیز مہمت دیوانی میں دخیل تھا۔

تاریخ تمدن اہل اسلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے زمانے میں جو لوگ "فلاسفہ اسلام" کے لقب سے مشہور ہوئے سب کے سب ترک تجرید کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے اور سلاطین و ملوک

کی خدمت میں ہرگز مصروف نہ ہوتے تھے۔ ان فلاسفہ میں جس شخص نے سب سے پہلے سلاطین و ملوک کی خدمت کو اپنا شعار بنایا وہ شیخ رئیس ابو علی ابن سینا تھا جس کی زندگی کا بڑا حصہ آل بویہ کی وزارت میں گزرا۔ صاحبِ حق تعالیٰ لکھتا ہے :

”بعد از شیخ رئیس اکثرے از حکمای اسلام  
 کہ ملازمت حکام و ارباب فرمان اختیار  
 کردند بمقتدا بہ شیخ کردہ اند“  
 شیخ رئیس کے بعد فلاسفہ اسلام کی اکثریت میں جس نے  
 بھی کسی حاکم یا فرماں روا کی ملازمت کی، انہوں نے  
 شیخ ہی کی پیروی کی۔

یہاں کہ شیخ ابو علیؑ اور ناصر خسروؒ کی اصل بلخ ہی سے تھی اور شیخ کو آل بویہ کی وزارت کے زمانے میں جو  
 عروجِ جاہ و حشمت نصیب ہوا، اس کا شہرہ ناصر نے اپنے دورہ شباب میں سنا ہوگا اور ناصر  
 خسروؒ نے یقین کے ساتھ یہ جانا ہوگا کہ شیخ کو جو شہرت اور جاہ و حشمت نصیب ہوئی یہ صرف قرب  
 سلاطین کے سبب ہوئی ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ان اسبابِ خسرو کو بھی آل سلجوق کی خدمت  
 کرنے کی ترغیب لائی اور گوشہٴ غربت سے نکال کر دار السلطنت مرو میں کھینچ بلایا۔

ترک خدمت اگرچہ ناصر خسروؒ کو چغریک کی ملازمت سے علیحدہ ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا جیسا کہ  
 ہم آئندہ بیان کریں گے۔ اور پھر بھی اس نے ملازمت کی سوچ بھی نہیں لیکن اس کا بھائی خواجہ  
 ابو الفتح عبد الحلیل طغرل بک کے عہد میں اور اس کا بڑا خواجہ معین الدین ملک شاہ سلجوقی کے زمانے  
 میں مدتِ دراز تک دیوان کے ملازم اور ”مستند درگاہ“ رہے۔

اسی طرح مستند تک کہ اس وقت ناصر خسروؒ کی عمر ۴۴ سال ہوئی تھی، وہ چغریک کی ملازمت  
 میں رہا یہاں تک کہ سفر حج کے ارادے نے اسے ملازمت چھوڑنے پر ابھارا جس کا ذکر اپنے سفر نامے  
 میں حکیم نے کیا ہے۔ اب اس نے سہ ماہی کی کموں کے اشغال سے پوری طرح کنارہ کشی کر لی اور جاہ

ابو علی کا پختہ پختہ حاکموں میں سے تھا۔ درنوعِ عام فی سلطنت کے زمانے میں بخارا کی طرف چلا گیا تھا وہیں  
 مستند میں ابو علی کی پیدائش ہوئی۔ مستند ناصر خسروؒ کی ولادت شیخ کی پیدائش سے اکیس سال بعد ہوئی اور جب  
 شیخ کا وصال ہوا ہے تو ناصر خسروؒ ۴۴ سال کا تھا۔

و چشمت کے تمام ساز و سامان تیار کر دیئے۔ اپنے چھوٹے بھائی ابوسعید اور ایک غلام کو ساتھ لے کر سفر کے لئے نکلا، اس سفر کی روداد اس نے سفر نامے میں لکھی ہے۔ وہ خراسان، عراق عجم، اور آذربائیجان کے شہروں میں ہوتا ہوا، آرمینیا پہنچا۔ وہاں سے شام و فلسطین اور عراق و عرب کو عبور کرتا ہوا حج کے زمانے میں مکہ معظمہ میں وارد ہوا۔ حج سے فارغ ہو کر مصر گیا۔ تقریباً تین سال تک وہاں قیام کیا۔ مصر میں اقامت کے زمانے میں دو مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارتِ روضہ متورہ جناب رسالت مآب (شرفہا اللہ تشریفاً) کے لئے حجاز آیا اور یہاں سے پھر مصر کو مراجعت کی۔ روضہ الصفا، حبیب السیر اور دبستان المذاہب میں لکھا ہے کہ سات سال تک مصر میں مقیم رہا اور ہر سال حج کو جاتا تھا لیکن سفر نامے کی تصریح اس بیان کی تکذیب کرتی ہے۔

اُن دنوں مستنصر باللہ فاطمی عبیدی جو خلفائے فاطمیہ میں مشہور ترین خلیفہ ہوا ہے اور ساٹھ سال تک مسندِ خلافت پر متمکن رہا، مصر میں حکومت کرتا تھا۔ سفر نامہ سے جو کچھ استفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حکیم کی دوستی سلطنتِ مصر کے ارکان میں کسی سے ہو گئی تھی اُسی کی دست سے وہ قصرِ خلافت میں پہنچا، وہاں کی عمارتیں، دربار اور ایوان کا مشاہدہ کیا۔ لیکن یہ تذکرہ حکیم نے کہیں نہیں کیا کہ وہ امیر المؤمنین مستنصر باللہ کے دربار میں بھی باریاب ہوا کہ نہیں لیکن قرائن صادقہ کی شہادتوں سے مکشوف ہوتا ہے اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مستنصر نے اس کے ساتھ بہت مراعات کیں اور اپنی محبت و عقیدت اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔ (باقی)

اردو کے عظیم المرتبت شاعر میر محمد تقی میر کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے، دلچسپ، ہجرت انگیز، اور حیرت آمیز واقعات

## میر کی آپ بیتی

میں ملاحظہ فرمائیے

اسے معروف نقد و شارح احمد فاروقی نے اصنافِ رسی کتاب سے ترجمہ کیا ہے اور جابی ضروری معلومات جو اسی میں لکھ دی ہیں۔

ترجمہ تالیف کے حسن کا اعتراف تمام مقتدر علمی جریڈوں اور عالموں نے کیا ہے۔

طباعت علی۔ کتابت عمدہ۔ کاغذ نفیس۔ گٹ پشٹن دار، مکتبہ برہان دہلی سے ۸/۲ میں طلب فرمائیے۔



# احزابیت

## غزل

(جنابِ اتم منظر نگری)

خود یہ آواز بھی ہے صاحبِ آواز بھی ہے  
جس جگہ سوز ہے بے پردہ وہیں ساز بھی ہے  
دیکھنا تھا یہ تجھے قبل رہائی صیاد  
اے مفتی سربزم مجھے پھونک دیا  
خاک سے دل کی ہوا پھر نیا اک دل پیدا  
چاک دامن نظر آتی ہیں بہاریں مجھ کو  
کیا اڑوں شاخ نشین ہی پہ میں بیٹھا ہوں  
رفت منزلِ غم تک مجھے لے جائے گی  
ہمت افزائے سر راہ جنوں میں بھی ہوں  
دیکھ اے مرغِ سحر صحنِ چین میں ہر گل  
معتبر باغِ جہاں میں نہیں کوئی کہ یہاں  
چارہ سازوں کو خبر ہی نہیں اس کی ایک

نغمہ دل کی صدا سوز بھی ہے ساز بھی ہے  
شمع کے ساتھ ہی پروانہ جاں باز بھی ہے  
کچھ مرے بازوؤں میں طاقتِ پرواز بھی ہے  
تیری آواز میں تو سوز بھی ہے ساز بھی ہے  
جو ہے انجامِ محبت وہی آغاز بھی ہے  
پردہ گل میں نہاں کوئی جنوں ساز بھی ہے  
اس چین میں کہیں گنجائشِ پرواز بھی ہے  
ہر ٹرپ دل کی مرے گرمیِ پرواز بھی ہے  
پردہ بانگِ جرس میں مری آواز بھی ہے  
ہے تو خاموش مگر گوشِ بر آواز بھی ہے  
راز دانندہ گل جو ہے وہ غماز بھی ہے  
زخمِ دل زخم بھی ہے دریا ک راز بھی ہے

ہر رنگِ دل میں کھٹکتے ہیں اتمِ دوپیکار

درد کے ساتھ نگاہِ غلط انداز بھی ہے

## تبصرہ

درس الاسلام پہلا حصہ | از جناب مولوی حفیظ الرحمن صاحب داصفت - تقطیع متوسط -  
 ضخامت ۳۲ صفحات طباعت کتابت بہتر قیمت ۴۰ نئے پیسے پتہ : مکتب خانہ رحیمیہ دو بازار  
 جامع مسجد دہلی ۷۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ نے تعلیم الاسلام کے نام سے دینی رسالوں کا  
 جو ایک سلسلہ شائع کیا تھا وہ ایک زمانہ میں اتنا مقبول ہوا تھا کہ برصغیر ہندوپاک کے علاوہ برما  
 میں بھی مسلمانوں کے گھر گھر پڑھایا جاتا تھا۔ اور اب بھی سیکڑوں مکاتب اسلامیہ میں داخل ہوتا ہے  
 اس سلسلہ کو منظوم کرنے کا عزم مولانا مرحوم کے فرزند ارجمند جناب اصفت نے کیا ہے  
 چنانچہ زیر تبصرہ رسالہ تعلیم الاسلام کے پہلے نمبر کا منظوم ترجمہ بنے ترجمہ نہایت کامیاب ہے ہر صوفی  
 نے تعلیم الاسلام ہی کے الفاظ میں معمولی سی تعلیم دماخیر کر کے اس کو شعر کا جامہ پہنا دیا ہے۔

اس بنا پر اب بچوں اور بچیوں کے لئے اس کا زبانی یاد کر لینا بھی آسان ہو گیا۔ آخر میں شکل  
 الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جس سے رسالہ کی افادیت دو چند ہو گئی ہے امید ہے کہ یہ منظوم تعلیم الاسلام  
 مدارس اسلامیہ میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہوگا اور مسلمان بچوں اور بچیوں کو اس سے مزید فائدہ پہنچے گا۔  
 تذکرہ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادیؒ | از مولانا ابوالحسن علی ندوی تقطیع کلاں ضخامت  
 ۵۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت دو روپے پچاس نئے پیسے پتہ : مکتب دار العلوم  
 ندوۃ العلماء۔ بادشاہ باغ لکھنؤ۔

حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ چودہویں صدی ہجری کی  
 ابتداء کے مشہور صاحب معرفت و طریقت بزرگ تھے جو اپنے عہد میں تصوف اور طریقت کے ایک  
 اہم مرکز تھے اور جن سے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں نے بھی روحانی استفادہ  
 کیا ہے۔

یہ کتاب حضرت مرحوم کے ہی حالات پر ہے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا نام اس کتاب کے استناد کا ضامن ہے عام طور پر صوفیاء اسلام کے تذکروں میں جن خارق العادات واقعات کا ذکر ہوتا ہے اس کتاب میں ان سے بہت کم اعتنا کیا گیا ہے اور مولانا کے علم و عمل سے متعلق جو اصل واقعات ہیں انہیں پرکتفا کیا گیا ہے اس حیثیت سے یہ تذکرہ جہاں رہا باب معرفت کے لوں میں نور پیدا کرنے کا باعث ہو گا تاریخی اعتبار سے بھی علماء اور طلباء کے لئے بڑی قابل قدر چیز ہے اس کتاب کا مطالعہ ہم خرمادہم ثواب کا مصداق ہو گا۔

**برگ گل** | تقطیع متوسط ضخامت ۹۰ صفحات - طباعت و کتابت دیدہ زیب (ٹائپ) قیمت ندارد - پتہ: اردو کالج کراچی (پاکستان)

اردو کالج کراچی کا مجلہ بابت ۱۹۵۵ء برگ گل کے نام سے ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ مجلہ اسم با سمنی اور ہری ظ سے مجلس دارت کے حسن ذوق کا آئینہ دار نیز کالج کے اساتذہ طلبہ و طالبات کی علمی و ادبی دلچسپیوں کا خوشنما مرقع ہے۔ سبد گل، زر گل، برگ سبز، آتش گل، رنگ بوستاں یہ عنوانات ہیں مجلہ کے مختلف حصوں کے جن میں بلند پایہ علمی و ادبی مقالات، غزلیات، منظومات اور افسانے الگ الگ ترتیب دئے گئے ہیں۔ ”رنگ بوستاں“ کالج کی مختلف انجمنوں کی رودادوں پر مشتمل ہے اور اخیر میں ”طائرانِ جن“ کی تصویریں ان کی علمی و عملی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو ظاہر کر رہی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ مجلہ بڑا ہی وقیع ہے اور اراکین ادارہ لائق مبارک باد ہیں کہ نہ صرف معنوی بلکہ ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے بھی انہوں نے مجلہ کو باغ و بہار بنا کر پیش کیا ہے۔

## رہمائے قرآن

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے رنگ کی یہ بالکل جدید کتاب ہے جو خاص طور پر غیر مسلم یورپین اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے لکھی گئی ہے۔ مولف نواب نظامت جنگ مرحوم مترجم ڈاکٹر میر دلی الدین صاحب، جدید ایڈیشن۔ قیمت ایک روپیہ۔



# بُزْهَان

شماره ۶

جلد ۴م

دسمبر ۱۹۵۸ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۸ھ

## فہرست مضامین

۳۲۲

سید احمد اکبر آبادی

نظرات

جناب ڈاکٹر طہ حسین صاحب

علیؑ

۳۲۵

مترجم مولانا عبد الحمید صاحب نعمانی

صرف تاریخ کی روشنی میں

جناب ڈاکٹر نور شید احمد فارق صاحب

عربی کی ایک قلمی کتاب ہے

تاریخ ہند پر نئی روشنی

۳۲۱

اُستاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی

اسلام ان موڈرن ہسٹری

جناب پرنسپل ڈاکٹر ڈبلیو سی، اسمتھ

ایک باب کا ترجمہ

۳۲۹

مترجم ضیاء الحسن شمس فاروقی ایم۔ اے

عقائد جامی اُس کی شرحیں اور تراجم

۳۶۵

جناب محمد سخاوت مرزا صاحب بی۔ اے ال۔ اے

رقبہ ادب

۳۷۹

جناب نثار احمد صاحب فاروقی

ادبیات

۳۸۳

جناب آتم مطلق نگرہی

غزل

۳۸۴

(۱۔ ن، ش)

تیسرے

# نَظَرِی

ایک معمولی بات بھی خواہ کتنی ہی پیہمی ہو جب موضوع فکر و تقریر بن جاتی ہے یہی حال آج کل لفظ قومیت کا ہے۔ بعض اسلامی حلقوں میں اس لفظ کی تشریح و توضیح اور اس کی اعریف و تفصیل میں ابھی پچھلے دنوں، اس درجہ اقد، م کیا گیا ہے کہ ایک سادہ حقیقت بھی عقدہ داخل نظر آنے لگی ہے۔ ہندوستان کے پانچ مختلف المذہب لوگوں کو گر یک جگہ جمع کر کے پوچھا جائے کہ یہ کون ہیں؟ تو چونکہ پوچھنے والے کو یہ پہلے سے معلوم ہے کہ ان پانچوں میں سے ہر ایک کا مذہب الگ الگ ہے اس بنا پر اس کے سوال کا مطلب لازمی طور پر یہ ہوگا کہ جواب میں کوئی ایسی چیز کی جائے جو ان پانچوں میں مشترک ہو۔ اس صورت میں مذکورہ بالا سوال کا صحیح جواب ہوگا "ہندوستانی"، اس جواب کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ پانچوں دی اختلاف مذہب کے باوجود ایک ہی ملک کے باشندے اور ایک ہی حکومت میں آباد ہیں۔ اب ایک شخص کہتا ہے کہ وطن اور حکومت کا یہ، شتر اک ہی قومیت ہے، جس کو انگریزی میں شینٹی کہتے ہیں اور ان سب لوگوں کو نیشن ور قوم کہتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ کیونکر ہوگا کہ لفظ نیشن یا قوم کا طر ق جن لوگوں پر ہوتا ہے وہ تہذیب، کلچر، مذہب اور زبان ان سب وجوہ سے ش ایک ہی ہوتے ہیں۔ دنیا میں کسی مقام پر دو آدمی ہیں، ایسے نہیں جس جو ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے شتر یک در اسی جیسے ہوں اور ان میں کچھ باتیں مابہ اشتراک ہوں گی اور کچھ باتیں مابہ اختلاف۔ ہر دو ان دونوں کی طر ق دنیا کے سب س کو بھی پس ای سمجھ چلائے۔ مابہ اشتراک اور مابہ اختلاف دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل حقیقتیں ہیں ایک کے ثبات سے دوسرے کی نفی ہرگز لازم نہیں آتی۔ البتہ ہاں منطق کے مسلمہ اصول لا متناہی فی الاصطلاح کے مطابق عنوان در نام میں فرق ہو سکتا ہے۔

جہاں تک لفظ قوم کے طلاق کا تعلق ہے تو قرن و حدیث سے در تاریخ و ادب کی کتابوں میں عام استعمالات سے یہ بات ثابت ہے کہ اس لفظ کے معنی و مفہوم میں بڑی وسعت ہے، اس کا اطلاق کبھی

ایک ہی مذہب کے لوگوں پر ہوتا ہے اور کبھی ایک ہی ملک یا ایک ہی نسل یا ایک ہی زبان کے مختلف املاز لوگوں پر ہوتا ہے۔ منطق کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ کبھی بہ طور جنس بولا جاتا ہے اور کبھی بہ طور فصل اور کبھی بہ طور نوع۔ لیکن بہر حال یہ یقینی ہے کہ جو لوگ ہندوستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں ان سب کو ایک قوم کہتے ہیں ان کی مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان میں باہم مذہب، زبان، اور کلچر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ مسلم اور غیر مسلم تو الگ رہے خود مسلمان مسلمان اور غیر مسلم غیر مسلم تک میں باہم زبان اور کلچر کا فرق ہے۔ پنجاب کے ایک ہندو کو جنوبی ہند کے ایک ہندو کے ساتھ کھڑ کر کے دیکھئے۔ دونوں میں کتنا فرق نظر آئے گا۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں مذہب اور اس کے عوامل و مقتضیات کا فرق ہے، اس لئے وہ ایک قوم نہیں بن سکتے سزا سرسٹو اور ایک فریب بخش ہے۔ اس کو آج کی دنیا کا نہ کوئی نظام تسلیم کر سکتا ہے اور نہ کوئی دستور۔ اور خود ہم رہے ملک کے دستور کا باشندگان ملک کی مذہبی اور تہذیبی آزادی کو تسلیم کرنا اس امر کی دیں ہے کہ قومیت کے معنی اتنی دلچسپ اور اتنی تہذیب و تمدن کے ہرگز نہیں ہیں اور دستور ملکی خود تہذیب و تمدن اور کلچر کے اختلاف کو تسلیم کرتا ہے۔

صل معاملہ کو اس حیثیت سے دیکھئے تو صاف نظر آئے گا کہ متحدہ قومیت کو جو لوگ تسلیم کرتے ہیں اور جو اس کے منکر ہیں ان میں کوئی حقیقی نزاع نہیں ہے۔ کیونکہ اور گروہ جس ماہ الا شتراک کا قائل ہے یعنی وطنیت اور اس کے حقوق و واجبات۔ دوسرا گروہ اس کا منکر نہیں اسی طرح دوسرا گروہ جس چیز کا منکر ہے یعنی اتحاد کلچر۔ اتحاد تہذیب و ثقافت تو پہلا گروہ اس کا قائل نہیں اب نزاع جو کچھ بھی ہے وہ صرف اس بات میں ہے کہ مشترکہ وطنیت کو قومیت کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ تو ظاہر ہے نتیجہ مذکور کی روشنی میں یہ نزاع محض لفظی ہو گا نہ کہ حقیقی لیکن افسوس ہے کہ ہمارے بعض دوستوں کی سمجھ میں اتنی ذرا سی بات بھی نہیں آتی۔ چنانچہ عزیزوں! زندگی کے لائق مدبر لکھتے ہیں یہ بات صحیح نہیں کہ چند چیزوں میں شتراک قومیت کے لئے کافی ہے۔ صل چیز شتراک نہیں داخلی وحدت ہے۔ جب تک یہ موجود نہ ہو قومیت موجود نہیں ہو سکتی "سوال یہ ہے کہ یہ "داخلی وحدت ہے کہاں؟ جو امت سدئی کے رکان اور علمائے دیوبند و برہمنی میں ہے؟ مولانا حفیظ الرحمن سیوہ ریدی اور شہید سہروردی صاحب میں ہے؟ اگر نہیں ہے اندیقین نہیں سے تو قومیت کا وجود صرف



[illegible]

علیؑ

## صرف تاریخ کی روشنی میں

ڈاکٹر طہ حسین کے قلم سے

مترجم

(مولانا عبد الحمید عثمانی)

(۲)

پھر لوگوں نے دیکھا کہ طحہؑ اور زبیرؓ نے رضا اور رغبت کے ساتھ بیعت نہیں کی ہے، ان تمام باتوں کو دیکھ کر اور جان کر دورانِ کاہنہ لگا کر کیوں نہ لوگ سرسیمہ اور خوف زدہ ہوں؟ تاہم نئے خلیفہ ایسی قابلیت کے مالک تھے کہ یہ لوگ کاہل طبیبان اور امیدوں سے بھر دیں وہ نبیؐ کے چچا زاد بھائی تھے، خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والے، مردوں میں سب سے پہلے رسول اللہؐ کے ساتھ ہمارے چچا پر مٹھنے والے، اسلام کی دعوت اور اعدان کے پہلے نبیؐ کی تربیت میں رہنے والے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے احسب فرمایا کہ بوط سب، زندگی کے دن تنگی میں گذر رہے ہیں اپنے کوشش کی کہ بیٹوں کا بوجھ اٹھانے میں دوسرے چچا ابوطالب کی امداد کریں چنانچہ صرف عقیس ابوطالب کے پاس رہ گئے اور وہ یہ چاہتے بھی تھے، باقی دوسرے لڑکے اور بھائیوں کی پرورش میں چلے گئے، آلِ حضرت نے علیؑ کو اپنی کفالت میں لے لیا اور ان کی تربیت اور پرورش فرماتے لگے۔ جب اللہ نے آپ کو نبوت کے لئے پسند فرمایا تو علیؑ آپ کی تربیت میں تھے اور ابھی دس سال سے کچھ ہی بڑے تھے پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ علیؑ اسلام کے ساتھ ساتھ چچے اور بڑے ہوئے، نبیؐ کو آپ کے بے حد محبت تھی وہ آپ کو غیر معمولی درجے میں مقدم رکھتے تھے، ہجرت کے موقع پر

آپ کو لوگوں کی امانتیں سپرد کیں اور آپ نے ان کے مالکوں تک پہنچا دیا، پھر قریش نے جس رات اللہ کے رسولؐ کو قتل کر دینے کی سازش کی تھی آپ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا اور آپ سوئے، اس کے بعد آپ نے ہجرت کی اور مدینہ میں نبیؐ سے جا ملے اس کے بعد مواعظ کی تقریب میں رسول خداؐ نے اپنے ساتھ حضرت علیؑ کا بھائی چارہ قائم کیا، پھر اپنی لڑکی فاطمہؑ سے بیاہ دیا، بعد میں تمام غزوات میں علیؑ نبیؐ کے ساتھ رہے سخت محروکوں میں علم آپ ہی کے ہاتھوں میں رہا خیر لے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فریاد کل میں جھنڈا ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کو بھی اس سے محبت ہے دوسرے دن جب صبح ہوئی تو جھنڈا حضرت علیؑ کے ہاتھ میں دیا، مدینہ پر اپنا جانشین بنا کر جب آنحضرتؐ غزوہ تبوک جانے لگے تو فرمایا تم میرے لئے موسیٰ کے ہارون ہو سیکر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، حجۃ الوداع جاتے ہوئے مسلمانوں کو خطاب کر کے اپنے فریاد۔ جس میں سہ دارمیں علیؑ بھی اس کے سردار ہیں، اے خدا جو علیؑ کو دوست رکھے اس کو تو بھی دوست رکھ دو جو اس سے دشمنی کرے تو بھی اس سے دشمنی کر۔

حضرت عمرؓ حضرت علیؑ کے علم و رفقہ سے خوب واقف تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہم میں سب سے زیادہ فیصلہ کرنے کی طاقت علیؑ میں ہے حضرت عمرؓ کو جب کسی معاملے کے فیصلے میں پیچیدگی کا سامنا ہوتا تو وہ اس کو حضرت علیؑ کے سامنے پیش کرتے۔ حضرت عمرؓ نے جب شوریٰ کی ہدایت کی تھی اس وقت یہ بھی فرمایا تھا کہ اس ٹپیل سردارے کو مسلمان گر پناہ دالی بنالیں تو وہ ان کو بے راہ نہیں ہونے دے گا، حضرت علیؑ کے محمد درمی سن بہت زیادہ ہیں نبیؐ کے صحابہ نے اختلاف کے باوجود ان میں سے کسی کا اعتنا کرتے ہیں، یہی بزرگان اوصاف کے قائل ہیں اہل سنت کا ان فضائل پر یقین ہے جس طرح شیعوں کا یقین ہے۔

اے جس کو جب ہم حضرت علیؑ کی سیرت اور مشکلات اور مصائب میں ان کے طرز عمل کی تفصیل پیش کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ حضرت علیؑ مذکورہ بالا فضائل اور محاسن بلکہ اس سے



بھی زیادہ کے اہل تھے اور بلاشبہ آپ میں سب سے زیادہ یہ صلاحیت تھی کہ مسلمانوں میں قاروقِ اعظم جیسی روش اختیار کریں اور ان کو اسی راہ پر لے جائیں اور اگر حالات سازگار ہوتے تو حضرت علیؓ مسلمانوں کو بھلائی، کامیابی اور سعادت کی اس منزل پر پہنچا دیتے جہاں ان کو حضرت عمرؓ پہنچا چکے تھے۔

حضرت عمرؓ خدا کی ان پر رحمت ہو بڑی سچی فراست کے، لگتے تھے انھوں نے بالکل ٹھیک اندازہ کیا تھا جس میں کوئی غلطی نہ تھی کہ اگر علیؓ کو خلافت دے دی جاتی تو وہ لوگوں کو سیدھی راہ سے بھٹکنے نہ دیتے، حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ علیؓ ان سے بہت زیادہ مشابہ ہیں وہ بھی حق کے بارے میں سختی سے پتہ آتے ہیں، حق کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں، حق کا انکار کرنے والوں یا حق کے معاملے میں تنگی برتنے والوں کے لئے بڑے سخت ہیں لیکن قوم نے ابن خطاب کی وفات کے بعد جب دین قدموں پر گر رہی تھی، جب سرگرمیوں میں قوت تھی، جب اقدام نتیجہ خیز تھا، جب مقبولیت اور ذہانت کا فرقہ با تھی اور معاملات مسلمانوں کی منشا کے مطابق چل رہے تھے، حضرت علیؓ کو خلیفہ نہیں بنایا، اور بتایا تو حضرت ایمان کو بنایا، پھر نتیجہ دونوں کے حق میں جو کچھ ہونا تھا ہوا اس کے بعد جب دنیا بگڑ گئی، معاملات میں انتشار ہو گیا اور افتدار کی رسی ڈھیلی ہو گئی، بعضوں نے بعض کے ساتھ بدگمانی کی حد کر دی، کچھ لوگوں نے کچھ لوگوں کے خلاف کاروائیوں کی انتہا کر دی تب جا کر کہیں ایک اچھی خاصی تعداد نے حضرت علیؓ سے انتہا کی اور آپ کی بیعت کی کچھ لوگ ضرور آپ سے دور رہے لیکن ان کا مقصد آپ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا نہ تھا ہاں ایک جماعت نے آپ کی بیعت سے انکار کیا وہ آپ کو پسند کرتی تھی اور نہ اسے آپ کی اطاعت منظور تھی، اب نئے خلیفہ اور اس کے ساتھیوں نے جو نظر اٹھائی تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ غیر معمولی حالات اور معاملات سے دوچار ہیں وہ ایک ایسے مشتبہ فتنے کے گہرے میں ہیں جس کی تاریکی مبنی کا خاتمہ کر چکی ہے آذنی میں پناہ نہ نکالے تو اس

بڑی بڑی مشکلات کے ان پہاڑوں اور فتنہ و فساد کی ان بے رحم تاریکیوں کے درمیان بھی ایک بالکل مطمئن آدمی کی طرح، حضرت علیؓ اپنے دل میں ایمان کی صداقت، دین کی سچی محبت، حق کی بقا کا جذبہ اور سیدھی راہ پر ثابت قدمی کی ٹرپ، تمام و کمال پاتے تھے، اسلام کے معاملے میں انھوں نے نہ سبز نہ خراف کیا ورنہ ذرا بھی رورعایت کی، جدھر حق دکھایا اُدھر چل پڑے پھر کسی طرف نہیں جھکے نہ کسی کا انتظار کیا انجام کی بھی پروا نہ کی، اس کو اہمیت نہ دی کہ کامیاب ہوں گے یا نہ کام، زندگی ملے گی یا موت، ہاں اہمیت تھی تو اس کی کراستے بھرا اللہ راضی رہے اور دل مطمئن۔

## خلافت اور بنی ہاشم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؓ دورانِ کربچا عباسؓ دونوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ منصبِ خلافت صرف بنی ہاشم کا حق ہے نہ کسی اور خاندان میں منتقل ہونا چاہیے اور نہ کسی غیر ہاشمی کو خلیفہ بنانا چاہیے اور اگر عباسؓ اسلام لانے میں بچھڑ نہ گئے ہوتے تو کھجور کی جالشیبی کے لئے یقیناً خود اپنی ذات کو پیش کر دیتے اور مسلمانوں پر حکومت کی ورثت حاصل کر لیتے لیکن انھوں نے معاملے پر غور کیا اور سمجھا کہ علیؓ اس اقتدار کے وارث بننے کے ان سے زیادہ حق دار ہیں، اس لئے کہ اسلام لانے میں انھوں نے پہل کی ہے وہ ان حضرت کے پرورش کر رہے ہیں، غزوات کی مسیبتوں میں پوری طرح ثابت قدم رہے اور اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جانی کہا کرتے تھے جس پر ایک دن اُمّ امین نے ان حضرت سے مذاق کرنے ہوئے کہا تھا۔ ”جانی بھی کہتے ہیں اور انھیں سے اپنی لڑکی بھی بیہ دی ہے۔“ مزید برآں آنحضرتؐ نے حضرت علیؓ کے لئے فرمایا ہے کہ وہ میرے لئے مومنی کے ہارن میں زریہ کہ جس کا میں سردار ہوں سی بھی اس کے سردار ہیں۔

غیر تمام باتوں کے پیش نظر عباسؓ وفاتِ نبوی کے بعد حضرت علیؓ کے پاس آئے

اور کہنے لگے ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کروں گا، لیکن حضرت علیؑ نے فتنے کا خطرہ محسوس کر کے اس سے انکار کر دیا، اس واقعے کا تذکرہ بہت دنوں بعد عباسؑ نے حضرت علیؑ سے کیا۔ قریش کے ایک اور آدمی نے چاہا تھا کہ حضرت علیؑ کی بیعت کر لے۔ اس کی یہ خواہش اس نے نہیں تھی کہ اس کو حضرت علیؑ سے محبت تھی، اور وہ آپؑ سے خوش تھا یا وہ نبیؐ سے آپؑ کے خاص تعلق کا اعتراف کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا یہ ارادہ عہد مناف کی خاندانی عصبیت کی بنیاد پر تھا، یہ آدمی ابوسفیانؑ ہے اسلام سے مقابلے اور نبیؐ سے جنگ کے دوران میں یہی آدمی قریش کا سردار تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کا لشکر مکہ پر چھا گیا ہے تو مجبوراً اسلام قبول کر لیا، عباسؑ اس کو نبیؐ کی خدمت میں لائے جہاں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہہ دینے میں اس کو کچھ تردد نہیں ہوا اس لئے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہ ہونے کا اعتراف کر لینے میں اس کے نزدیک کوئی مضائقہ کی بات نہ تھی لیکن جب اس سے یہ شہادت طلب کی گئی کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں تو اس نے کہا اس کے بارے میں یہ ادل صاف نہیں ہے اور اگر عباسؑ اس کو آمادہ نہ کرتے اور قتل کی دھمکی نہ دیتے تو وہ ہرگز رسالت کا اقرار نہ کرتا۔ بہر حال وہ مسلمان ہوا اور نبیؐ نے قریش میں اس کی پوزیشن کی رعایت رکھ کر، جب اسلامی فوج مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہی تھی، اس کے گھر کو بھی امن کی جگہ قرار دی، پس ابوسفیانؑ ان امان یافتہ لوگوں میں سے ایک ہیں جس کو اللہ کے رسولؐ نے مکہ کے فاتحانہ داخلے کے موقع پر معاف کر دیا تھا۔ ان واقعات کے پیش نظر اس کو اپنے خلیفہ المسلمین ہونے کا تو خیال بھی نہیں آ سکتا تھا البتہ اس نے دیکھا کہ نبیؐ اس کے باپ عورتوں کی اولاد میں سے ہیں اور یہ کہ علیؑ اس اقتدار کی دراست کے سب سے زیادہ حق دار ہیں لیکن خلافت قبیلہ تمیم کے ایک آدمی ابو بکرؓ کو دی جا رہی ہے اور اندازہ ہے کہ اس کے پاس یہ منصب قبیلہ عدی کے ایک شخص عمرؓ تک پہنچے گا، تو اس نے باپ کی ذریعہ اولاد کو بیچا کے بیٹوں پر ترجیح دی اور حضرت علیؑ سے کہا۔ ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کروں گا۔ لیکن حضرت علیؑ نے اپنے چچا عباسؑ کی طرح اس کی بات مانتے سے بھی انکار کر دیا، اگر آپ



ان دونوں بوڑھوں کی بابت مان لیتے تو مسلمانوں میں خواہ مخواہ کافتنہ پیدا کر دیتے، پھر اس فتنے کا مقابلہ کرنے اور اس پر غلبہ پانے کی بات تو درکنار اس کی برداشت ہی بس سے باہر ہوتی اس لئے کہ آپ جانتے ہیں کہ نبیؐ کی وفات کے بعد بیعت کے معاملے میں انصار میں اختلاف تھا اب اگر قریش میں بھی پھوٹ پڑ جاتی تو انجام کیا ہوتا اسی طرح آپ جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں کچھ عرب دین سے پھر نئے لگے تھے اب اگر قریش اور انصار ایک دوسرے کے مقابل ہو جاتے تو صورتِ حال کا نقشہ کیا ہوتا؟

پس حضرت علیؓ، عباسؓ اور ابوسفیانؓ سے اپنی بیعت کا انکار کرنے میں بالکل حق بجانب تھے، ان کا طرزِ عمل سراپا خیر تھا وہ اللہ اور اسلام کے پوری طرح مخلص تھے، اپنی ذات کو خلافت کے لئے پیش نہیں کیا اور نہ اس سلسلے میں ابوبکرؓ سے جھگڑا کیا بلکہ لوگوں کی طرح ان کی بیعت کر لی طبیعت کو تقاضے کے خلاف دبا یا اور مسلمانوں کی خاطر اپنی طبیعت کو اس بات پر اصرار کیا کہ اپنے حق سے چشم پوشی کر لیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کا اندازہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے بعد خلافت انھیں کو ملے گی، اور مسلمان اس بوڑھے کو خلیفہ بن دینے میں معذور تھے جس کو اپنی بیماری کے دنوں میں آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ وہ نماز میں لوگوں کی امامت کرے تاہم حضرت علیؓ نے بیعت کرنے میں تیزی نہیں دکھائی بلکہ کچھ دیر لگائی شاید وہ حضرت ابوبکرؓ سے خفا تھے جس طرح فاطمہؓ خدا کی ان پر رحمت ہو حضرت ابوبکرؓ سے خفا تھیں اس لئے کہ جب انھوں نے اپنے باپ کی میراث کو ان سے مانگا تو ابوبکرؓ نے انکار کرتے ہوئے حضرت کی حدیث سنائی۔۔۔ ”ہم انبیاء کی کسی کو وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ سب کا سب صدقہ ہے۔“ لیکن یہ حال حضرت علیؓ آئے اور بیعت کرتے ہوئے اپنی تاخیر کا یہ عذر پیش کیا کہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج جمع کر لینے کے بعد ہی گھر سے نکلوا گا، مگر حضرت ابوبکرؓ نے آپؐ کا عذر قبول کر لیا۔

حضرت ابوبکرؓ بڑھے ہوئے تھے ان کی عمر ساٹھ سے اوپر ہو چکی تھی اور حضرت علیؓ

ابھی جوان تھے تیس سال سے کچھ زیادہ کی عمر تھی، سوچتے تھے کہ ان کے اور مسلمانوں کے سامنے مستقبل کا میدان بہت وسیع ہے، بہت جلد ان کو ان کا حق مل جائے گا جب اللہ اس بوڑھے کو اپنے جوار رحمت میں بلا لے گا جس کو نبیؐ نے دین کے ایک کام کے لئے آگے کیا تھا پھر مسلمانوں نے دنیا کے کاموں کے لئے بھی اسی کو آگے کر دیا۔

لیکن صدیق اکبرؓ نے خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کو نامزد کیا اور مسلمانوں نے بالاتفاق اس نامزدگی کو منظور کیا، ایک نے بھی مخالفت نہیں کی یہ دیکھ کر حضرت علیؓ نے محسوس کر لیا کہ ان کے اور قریشی ہاجرین کے درمیان ایک کھلا ہوا اختلاف ہے، وہ خلافت کو اپنا حق خیال کرتے ہیں اور ہاجر اس کے لئے ان کا حق تسلیم نہیں کرتے، ہاجر ان کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی خیال کرتے ہیں جو پابندی اوروں کے لئے ضروری ہے وہ ان کے لئے بھی ہے اب رہے انصار تو انہوں نے خلافت سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو قریشی ہاجروں کے لئے رضامند بنایا تھا ان میں سے جس کو پیش کیا جاتا اس کی بیعت کر لیتے، حضرت علیؓ نے فتنے کو برا سمجھا، امن و عافیت کو مقدم جانا اور مسلمانوں کی خیر خواہی کی کہ حضرت ابو بکرؓ کی طرح حضرت عمرؓ کی بھی بیعت کر لی، اور جس بات کو اپنا حق خیال کرتے تھے اس کا اظہار تک نہیں کیا اور صبر سے کام لیتے رہے آپ نے خلیفہ اول کی طرح حضرت عمرؓ کی بھی خیر خواہی کی پھر جب فاروق اعظمؓ کو خنجر مار دیا گیا اور خلافت کا منصب چھ ارکان کی مجلس شوریٰ کے حوالے کیا گیا، حضرت علیؓ کو یقین تھا کہ قریش ان کی ہم نوائی نہیں کریں گے اور نہ ان کا حق تسلیم کریں گے تو نہ اپنے لئے تحریک کی نہ لوگوں پر ان کی مرضی کے خلاف جبر کرنا چاہا اور اگر کرنا بھی چاہتے تو اس کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے کہ آپ کی رہائش میں کوئی جماعت نہ تھی، اور نہ آپ کسی زبردست پتاہ میں جا سکتے تھے، ہاں کچھ تھوڑے سے چھ مسلمان آپ کے ہم خیاں تھے جو دبی زبان آپ کے لئے تحریک کرتے تھے لیکن وہ کمزور تھے ان کے پاس جو کچھ قوت تھی وہ اسلام کی تھی، نہ وہ کوئی مادی طاقت رکھتے تھے اور نہ خاندانی عصبیت کا زور، جیسے عمار بن یاسر اور مقداد بن اسود وغیرہ، شیخینؓ کی طرح حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ

کی بھی بیعت کر لی جانتے تھے کہ آپ کو دیا جا رہا ہے لیکن پھر بھی آپ نے بیعت میں پس پیش نہیں کیا اور نہ پہلے دونوں خلفاء کی طرح حضرت عثمانؓ کے ساتھ خیر خواہی میں کوئی کمی کوتاہی کی، تا آنکہ مصائب کا دور آگیا جس کی تصویر ہم نے اس کتاب کے پہلے حصے عثمانؓ میں کھینچی ہے۔

یہ فطری بات تھی کہ حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد حضرت علیؓ اپنے متعلق غور فرماتے اور جو زیادتی آپ کے ساتھ کی گئی ہے اس پر کچھ سوچتے لیکن پھر بھی آپ نے خلافت کی طلب نہیں کی اور جب آپ کو مجبور نہیں کر دیا گیا آپ نے بیعت کے لئے اپنے کو پیش نہیں کیا، حضرت عثمانؓ کے بعض باغیوں نے تو یہ دھمکی دی کہ اگر آپ مادہ زمہوں گے تو آپ کو بھی انھیں کی جگہ پہنچا دیا جائے گا، علاوہ ازیں مدینہ کے مہاجر اور انصار آپ کی خدمت میں آئے اور آپ سے درخواست کی کہ مسلمانوں کے دلی بن کر ان کو اس فتنے کی تاریکی سے نکالیں، پھر حبابؓ نے ان کی درخواست منظور کر لی تو کسی صحابی کو مجبور نہیں کیا جس نے چاہا اس کی بیعت لی اور میں نے انکار کیا اسے چھوڑ دیا، سعد بن ابی وقاصؓ، عبداللہ بن عمرؓ، اسامہ بن زیدؓ کو اور انصار کی ایک جماعت کو جس کے سردار محمد بن مسلمہؓ تھے چھوڑ دیا، بقول اکثر مورخین کے حضرت علیؓ نے طلحہؓ و زبیرؓ کو نہیں چھوڑا اس لئے باغیوں سے ان کے تعلق کی بنا پر فتنے کا خطرہ تھا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں کو بھی بیعت پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ یہ اپنی خوشی سے حضرت علیؓ کے پاس آئے اور بیعت کی بعد میں جب انھوں نے خلیفہ کا سلوک اپنی توقع کے خلاف دیکھا تو اپنا نقطہ نظر بدل دیا غالباً یہ دونوں سمجھے ہوئے تھے کہ حضرت علیؓ کو ان کی سخت ضرورت ہے ان میں سے ایک کو ذمہ میں اور دوسرا بصرہ میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے اور انھیں دونوں شہروں نے بجاوت میں غیر معمولی مشترک طور پر حصہ لیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ کوذ اور بصرہ کے لوگوں نے طلحہؓ اور زبیرؓ کے اشتعال دلانے سے یا کم از کم ان کی مرضی سے بجاوت میں سرگرمی دکھائی تھی۔

پس یہ دونوں اس توقع میں تھے کہ حضرت علیؓ بہت جلد محسوس کر لیں گے کہ کوذ اور بصرہ میں ان کو اپنی جماعتوں میں غیر معمولی اثر و اقتدار حاصل ہے اور بلا تامل ان کو اپنی حکومت



میں شریک کر لیں گے اس طرح یہ خلافت ثلاثی یعنی سطاقتی ہوگی اور شوریٰ کے یہ تین ممبر حکومت باہم تقسیم کر لیں گے، حجاز، مصر اور شمالی افریقا کے مفتوحہ اور غیر مفتوحہ علاقے حضرت علیؑ کی حکومت میں ہوں، بصرہ اور اس کے مضافات کا علاقہ زبیرؓ کے تابع رہے اور کوفہ اور اس کے آگے کے علاقہ طلحہؓ حکمراں ہوں طلحہؓ اور زبیرؓ خیال کرتے تھے کہ اگر ان کی یہ سطاقتی خلافت مستحکم ہوگئی تو شام کا مسئلہ نہایت آسان ہوگا، لیکن حضرت علیؑ نے ان کو ان دونوں شہروں کی گورنری دینے سے انکار کر دیا اور چاہا کہ ان کے ساتھ حضرت عمرؓ جیسا سلوک کریں اور ان کو اپنے ساتھ مدینہ میں روک رکھیں جس طرح حضرت عمرؓ نے اس سے پہلے ممتاز مہاجر صحابہ کو مدینہ میں روک رکھا تھا لیکن حضرت علیؑ نے ان دونوں کے ساتھ وہ سختی نہیں برتی جو حضرت عمرؓ جہاد کی اجازت مانگتے والے صحابہ کے ساتھ کرتے تھے بلکہ ایک مہربان دوست کی طرح ان سے کہا — میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں حضرات کو اپنے ساتھ رکھوں کہ آپ کی جدائی سے مجھے وحشت ہوگی —

اب ان دونوں کو معلوم ہوا کہ ان کا خیالی دراندازہ غلط تھا اور یہ کہ حضرت علیؑ وہ دروازہ کھولنے والے ہیں جو حضرت عمرؓ پر خنجر سے وار کے بعد بند ہو چکا تھا اور ان کا انجام مدینہ میں ان ممتاز مہاجر صحابہ کا انجام ہوگا جو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے، چنانچہ ان کو مدینہ میں قیام کرنا ہوتا ہر سال وہ اپنا مقررہ وظیفہ حاصل کر سکیں گے اور حضرت عثمانؓ کی نرمی و اداری اور چشم پوشی سے جو عہد مل جایا کرتا تھا وہ حضرت علیؑ سے کسی صورت میں نہیں ملے گا، پس انھوں نے نہ کوفہ مانگا نہ بصرہ بلکہ رنجیدہ ہو کر چپ چاپ بیٹھ رہے، اور سنجیدگی اور غور کے ساتھ اپنا معاملہ ٹھیک کرنے میں مصروف ہو گئے۔

## علیؑ اور صوبوں کے گورنر

حضرت علیؑ کا نرم اور مدبرانہ جواب سن لینے کے بعد بھی شاید طلحہؓ اور زبیرؓ کے دل

سے بصرہ اور کوفہ کا خیال نہیں نکلا، بلاذری کا بیان ہے کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت علیؓ کو مشورہ دیا کہ۔ انتظامات میں مضبوطی کے پیش نظر آپؐ شام پر معاویہؓ کو برقرار رکھئے اور عراق کے دونوں شہروں پر طلحہؓ اور زبیرؓ کو مقرر کر دیجئے لیکن عبداللہ بن عباسؓ نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا بصرہ اور کوفہ دولت اور خراج کے چشمے میں اگر ان پر ان دونوں کو حکمراں بنا دیا گیا تو یہ مدینہ میں مقیم خلیفہ کو تنگ کر س گئے، اور شام پر معاویہؓ کا باقی رہنا حضرت علیؓ کے لئے مفید ہونے سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہوگا، حضرت علیؓ نے ابن عباسؓ کی رائے مان لی اور مغیرہ بن شعبہ کا مشورہ قبول نہیں کیا۔

دوسرے مورخوں نے اس کو ایک دوسری طرح بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ نے حضرت علیؓ کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے ان کو مشورہ دیا کہ ایک سال تک عثمانی گورنروں کو جن میں معاویہؓ بھی تھے ان کے عہدوں پر باقی رکھئے تاکہ لوگ آپ کے حق میں پکے ہو جائیں اور صوبوں سے وفاداری کی اطلاع بھی آپ تک جائے، ایک سال گزرنے کے بعد جیسی تبدیلی مناسب سمجھنا کر لینا، حضرت علیؓ نے یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اس لئے کہ چالبازی آپ کو طبعاً ناپسند تھی اس کے بعد مغیرہ دوسرے دن آئے اور حضرت علیؓ سے کہنے لگے میں نے اپنی پہلی رائے بدل دی اور اب مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے، مغیرہ واپس ہو رہے تھے کہ ابن عباسؓ نے ان کو دیکھ لیا اور حضرت علیؓ کے پاس آکر ان سے دریافت کیا کہ مغیرہ کیا کہہ رہے تھے، حضرت علیؓ نے ان کی دونوں باتیں بتا دیں ابن عباسؓ نے کہا کل اس نے جو کچھ کہا اس میں آپ کی خیر خواہی اور اخلاص تھا اور آج اس نے جو بات کہی وہ قریباً وردِ صوحا ہے اس کے بعد ابن عباسؓ نے اصرار کے ساتھ حضرت علیؓ پر زور ڈالا کہ معاویہؓ کو ان کی جگہ کم از کم ضرور برقرار رکھنا لیکن اپنے دامن پر مکر و فریب کے داغ سے ڈر کر حضرت علیؓ نے یہ منظور نہیں کیا اور شام کی حکومت ابن عباسؓ کو دینا چاہی لیکن انھوں نے قبول کرنے سے معذرت کی۔

مورخین میں چاہے جیسا اختلاف ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ کے گورنروں کو حضرت علیؓ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے ایک تو یہ بات ان کی راستبازی کے خلاف تھی کہ انہوں نے بار بار حضرت عثمانؓ کو انہیں گورنروں کے تقرر پر ٹوکا تھا لوگوں کے ساتھ ان کے طرز عمل سے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا، پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کل تک تو ان کے معزول کرنے کا مطالبہ کرتے رہے اور آج ان کے برقرار رکھنے پر رضامند ہو جاتے دوسرے سیاست کا تقاضا بھی اس کے خلاف تھا اس لئے کہ فتنہ کی آگ لگانے والے یہ باغی صرف خلیفہ کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے وہ تو سیاست کا کل نقشہ بدل دینا چاہتے تھے جس میں گورنروں کا تبادلہ پہلا قدم تھا ہاں ابو موسیٰ اشعری کو یہ لوگ شاید معاف کر دیتے جن کو کوفہ والوں نے خود پسند کیا تھا اور حضرت عثمانؓ نے بھی لوگوں کی اصلاح اور فتنے کی روک تھام کے خیال سے اس کو منظور کر لیا تھا۔

بہر حال مدینہ والوں کی بیعت سے فرصت پا کر پہلا کام جس کی طرف حضرت علیؓ نے توجہ کی وہ صوبوں کے لئے گورنروں کا تقرر تھا چنانچہ اپنے نہایت مناسب انتخاب کیا بصرہ کے لئے عثمان بن حنیف ایک مشہور اور ممتاز انصاری کا تقرر کیا اور شام کے لئے انہیں کے بھائی سہل ابن حنیف کو روانہ کیا اور قیس ابن سعد ابن عبادہ کو مصر کی طرف روانہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ انصار کو خوش کرنا چاہتے تھے اس لئے کہ بصرہ، کوفہ اور شام جیسے اہم مقامات کے لئے اپنے انہیں میں سے تین افراد کو پسند کیا۔

اب رہ گیا کوفہ تو بعض مورخوں نے روایت کی ہے کہ اس کے لئے آئے عمارہ بن ثہب کو چننا تھا لیکن ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ ایک کوفی نے ان کو واپس ہو جانے کے لئے کہا اور دھمکی دی کہ اگر واپس نہ ہوں گے تو قتل کر دے گا، اس نے یہ بھی کہا کہ کوفہ کے لوگ اپنے امیر ابو موسیٰ کے سوا کسی کو پسند نہیں کریں گے چنانچہ عمارہ واپس آ گئے اور ابو موسیٰ نے اپنی اور کوفہ والوں کی بیعت حضرت علیؓ کی خدمت میں بھیج دی۔



حضرت علیؓ نے یمن کا حاکم اپنے چچا زاد بھائی عبداللہ بن عباسؓ کو مقرر کیا جب یمن پہنچے تو حضرت عثمانؓ کے گورنر یعلیٰ ابن امیہ مکہ روانہ ہو گئے اور اپنے ساتھ سارا مال بھی لے گئے۔ مکہ کی حکومت پر حضرت علیؓ نے شروع میں بنی مخزوم کے ایک آدمی خالد بن عاصؓ بن ہشام ابن مغیرہ کو مقرر کیا لیکن مکہ والوں نے حضرت علیؓ کے لئے اس کی بیعت سے انکار کر دیا کہا جاتا ہے کہ ایک نوجوان مکی نے حضرت علیؓ کا مکتوب چبا کر پھینک دیا جو مزہم کے حوض میں جا گرا اور مکہ سے متعلق ایک در بات ہے جس کا ہم آگے چل کر تذکرہ کریں گے۔

حضرت علیؓ کے گورنر اپنے اپنے صوبوں کی طرف روانہ ہو گئے قیس ابن سعدؓ تو آسانی سے مصر پہنچ گئے اور عام مصریوں سے حضرت علیؓ کے لئے بیعت لے لی، البتہ ایک جماعت مقام خربتیا میں جمع ہو کر حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے لگی، لیکن اس جماعت نے نہ کسی پر ہاتھ اٹھایا، نہ کوئی حکم توڑا البتہ قصاص کا انتظار کرتی رہی۔

عثمان بن حنیف جب نصرہ پہنچے تو لوگوں نے ان کے ساتھ کوئی بے ہودگی اور چال بازی نہیں کی حضرت عثمانؓ کے حاکم عبداللہ ابن عامر جو کچھ لے سکے سب لا کر مکہ چلے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ کوذین پنا حاکم بھیجنے کی روایت ہر چند کہ میں نے پہلے پیش کر دی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ حضرت علیؓ نے وہاں کسی کو حاکم بنا کر نہیں بھیجا بلکہ ابو موسیٰ ہی کو باقی رکھا اس لئے کہ وہ کوذوالوں کی مرضی کے مطابق تھے۔

سہل بن حنیف شام کی طرف روانہ ہوئے ابھی وہ شامی حدود تک پہنچے ہی تھے کہ معاویہ کے سواروں سے ان کی ٹکڑھیر ہو گئی سواروں کے پوچھنے پر سہل نے کہا وہ حاکم ہو کر آئے ہیں سواروں نے جواب دیا کہ اگر آپ حضرت عثمانؓ کی طرف سے آئے ہیں تو حکومت حاضر ہے لیکن اگر کسی اور نے بھیجا ہے تو جس نے بھیجا ہے اسی کے پاس واپس چلے جائیے، چنانچہ وہ حضرت علیؓ کے پاس چلے آئے جیسے ہی لوگوں کو یہ معلوم ہوا سخت رنجیدہ ہوئے اور یقین کر لیا کہ معاویہ لڑائی پر آمادہ ہیں اب لوگوں نے حضرت علیؓ کا خیال معلوم کرنا چاہا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، لڑیں گے یا صلح کریں گے یا

دکان پر جاتا، بنیا اس کو دیکھ کر سب کام چھوڑ دیتا چاہے اس کے سر پر بڑے سے بڑا تاجر ہی کیوں نہ کھڑا ہوتا، وہ سارے گاہکوں کو ہٹا دیتا، برتن لیتا، کوڑیاں گنتا اور نمونے دیکھتا، پھر ہاتھی کو بے حد سستے داموں چیزیں دیتا، اور سب سے بڑھیا قسم - ہاتھی خریدتا اور چیز بڑھاتا جاتا (؟) کبھی بنیا کوڑیاں گنتا اور گنتے میں غلطی کرتا تو ہاتھی سوئڈ سے کوڑیوں کو اُلٹ پلٹ دیتا، تب بنیا دوبارہ گنتا۔ ہاتھی سوا لے کر لوٹ جاتا، کبھی اس کا مالک چیز کو کم سمجھ کر ہاتھی کو مارتا تو وہ پھر غصے کی دکان کو واپس جاتا اور اس کا سامان اُلٹ پلٹ اور گڈمڈ کر دیتا، بنیا یا تو چیز بڑھا دیتا، یا کوڑیاں لوٹا دیتا۔ ایسا سدھا ہاتھی جھاڑو دیتا ہے، بستر کرتا ہے، اوکھلی کو سوئڈ میں پکڑ کر دھان کوٹتا ہے اور ایک آدمی اس کے لئے دھان جمع کرتا جاتا ہے، اس کے علاوہ وہ چادل پیتا ہے، یانی پلاتا ہے، سودے کے برتن میں ایک رسی پٹری ہوتی ہے اس میں سوئڈ ڈال کر اٹھالے جاتا ہے اور سب کام کاج کر لیتا ہے، لمبے سفر کے موقع پر اس کا مالک اس پر سوار ہو کر جاتا ہے، بچہ اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر اس کو جنگل لے جاتا ہے، ہاتھی گھانس اور تپے اپنی سوئڈ سے توڑتا ہے اور لڑکے کو دیتا جاتا ہے جو ایک کساء (؟) میں ان کو جمع کر لیتا ہے، یہ چارا ہاتھی اٹھا کر گھر لے آتا ہے اور کھاتا ہے۔ ایسا سدھا ہاتھی جھنگا ہوتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی قیمت دس ہزار درہم (پانچ ہزار روپے) ہوتی ہے۔

۴۸۱۲ عبد الواحد حسین قسوی نے مجھ سے بیان کیا :- میں نے تربنی (مسالک : رس) میں ایک خوش رُرد اور خوش بدن مسلمان اڑکنے کو

دیکھا جو ہند میں پیدا ہوا تھا اور جس کے اطوار ہندوانہ تھے، کہ وہ ہاتھ میں ڈنڈا لئے سارے شہر میں گھوما کرتا اور اس کے آگے آگے ڈھول اور بگل بجانے والے ہوتے۔ میں نے اس سے پوچھا کیا بات ہے تو اس نے کہا: میں نے ایک ہندو سے شرط بندی ہے کہ خود کشی کر لوں گا، میں اس کے ساتھ خیر اندیشی سے پیش آیا اور نرمی سے سمجھایا کہ اپنے ارادہ سے باز آئے، لیکن وہ نہ مانا اور بولا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں شرط پوری نہ کروں؟“ میں نے کہا تم مسلمان ہو اور تمہارے اس فعل سے مسلمان بدنام ہوں گے، ”خدا سے ڈرو اور خود کو جہنم میں مت دھکیلو“ میرا کہا کچھ کام نہ آیا۔ دوسرے دن راجہ کا خاندان اور شہر کے لوگ تربہنی میں جمع ہوئے اور لڑکا اکڑتا پان چباتا آیا، اس کے جسم پر دو کپڑے تھے، ایک قمیص اور ایک دھوتی۔ اُس نے وہاں کی مسجد کا چکر لگا کر، اس کو سجدہ کیا پھر دونوں کپڑے اپنے دو ساتھیوں کو دے دئے اور لکڑی کی ایک کرسی پر چڑھا جو اس کے لئے بنائی گئی تھی، دَقْدَ عَیْ خَشْبَتِیْ وَبَدَیْ بَیْنِ تِلَاحَ خَشْبَاتِ (۹) اپنے بال ایک بانس کے سرے سے باندھے، اور دوسرے دو بانسوں کے سروں سے اپنے پیروں کے انگوٹھے۔ پھر اس کے پاس ایک شخص آیا جس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی، پانچ سیر پھل کی اور استرے سے زیادہ تیز، اس نے لڑکے کی پنڈلی پر کلہاڑی ماری اور پیہ مت پنڈلی کے بانس کے سرے سے لٹک گیا، دوسرا پیر بھی اسی طرح اس نے کاٹ دیا۔ تَمَوْصِعُ الْمَسْدَرِ عَیْ عَانِقَهُ الْآخِرُ فَلَحِقَ الْقَطْعُ التَّالِیَ مَالِدًا، متعلق الرأس مع الحق مع الصد، ومانع دلت فی رأس النساء (۹) لڑکے کے گھر والے آگئے اور انہوں نے اس کے جسم



کے ٹکڑوں کو جمع کر کے دفن کر دیا۔

ایک ایسے شخص نے جو ہند کے حالات سے خوب واقف ہے بیان کیا کہ ہزر کا ایک بڑا بادشاہ کھانا کھا رہا تھا اور اس کے سامنے پنجر لٹک رہا تھا جس میں ایک طوطا تھا۔ بادشاہ نے طوطے سے کہا: ”آ میرے ساتھ کھانا کھا، طوطا بولا: ”مجھے بلی کا ڈر ہے، بادشاہ: ”اَنَا بِلَا وَجَرَتْ!“ ہندی زبان (غالباً سنسکرت) میں اس کے معنی ہیں کہ اگر تجھ کو کوئی نقصان پہنچا تو ویسا ہی میں اپنے کو پہنچاؤں گا۔“ اس لفظ کی زیادہ واضح تفسیر یہ ہے کہ مثلاً ہند کے کسی بادشاہ کے پاس اس کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق، لوگ آتے ہیں اور کہتے ہیں: ”حَن بِلَا جَرَوَتْ!“ یہ سن کر بادشاہ ان کو اپنے دستِ خاص سے چاڑل اور پان دیتا ہے۔ اب آنے والوں کا ہر فرد اپنی چھنگلی کاٹ ڈالتا ہے اور بادشاہ کے سامنے (عہد جانشہاری کے طور پر) رکھ دیتا ہے۔ اس کے جد جہاں کہیں بادشاہ جاتا ہے یہ لوگ اس کے ساتھ جاتے ہیں، جو وہ کھاتا پیتا ہے وہی یہ کھاتے پیتے ہیں، اس کے کھانے کی نگرانی کرتے ہیں، اس کے سارے معاملات کا انتظام کرتے ہیں، بادشاہ کی کوئی چھیتی عورت یا باندی یا غلام اگر اس سے ملنے آئے تو یہ اس کا جھاڑا لیتے ہیں، بادشاہ کا بستر دیکھتے ہیں، (کہ اس میں کسی نے زہر قاتل تو نہیں رکھ دیا) اس کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز آئے تو لانے والے سے کہتے ہیں کہ پہلے تم کھاؤ، غرض یہ کہ اسی طرح کی اور بہت سی باتوں کی جن سے بادشاہ کو خطرہ ہوتا ہے دیکھ بھال کرتے ہیں اور اگر بادشاہ مرتا ہے تو یہ بھی مر جاتے ہیں، اگر وہ جل کر جان دیتا ہے تو یہ بھی جل مرتے ہیں، اگر وہ بیمار ہوتا ہے تو یہ بھی اپنے جسم

کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتے ہیں، اگر وہ دشمن سے لڑنے جاتا ہے یا دشمن اس سے لڑتا ہے تو یہ پروانہ کی طرح اس کے ساتھ رہتے ہیں، ضروری ہے کہ 'بلا و جریہ' شہر کے معزز، بہادر اور وجیہ لوگ ہوں۔ یہ ہے 'بلا و جریہ' کی حقیقت۔ جب بادشاہ نے طوطے سے کہا کہ 'میں بلا و جریہ ہوں، تو طوطا پنجرے سے اتر کر کھانا کھانے دسترخوان پر آیا، بی بی نے اس کو آدھوچا اور گردن کاٹ لی۔ بادشاہ نے ایک تھال میں طوطے کا دھڑ اور اس کے ساتھ کا تور، الائچی دانے، پان، چونا، اور چھالیہ رکھا، پھر ہاتھ میں تھالی لئے ڈھول پٹواتا ہوا نکلا اور شہر اور فوج کا گشت لگایا، اس کے بعد وہ ہر دن گشت کرانے کے لئے تھال بھیج دیا کرتا۔ جب دس سال گزر گئے تو 'بلا و جریہ' اور دوسرے اعیان حکومت بادشاہ کے پاس آئے اور کہا: یہ بڑی نامناسب بات ہے، طوطے کو مرے اتنا عرصہ گزر گیا، آپ کب تک ٹالیں گے؟ یا تو اپنی ذمہ داری پوری کیجئے اور اگر پوری کرنے کا ارادہ نہ ہو تو ہمیں بتائیے تاکہ ہم آپ کو گدی سے اتار کر کسی دوسرے کو بادشاہ بنائیں، کیوں کہ جو شخص 'بلا و جریہ' کہہ کر اپنی ذمہ داری کو ٹالے یا اس سے گریز کرے وہ بھندا ہو جاتا ہے۔' بھندا اس بیخ ذات آدمی کو کہتے ہیں جس کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اس کے خلاف کوئی فیصلہ صادر کیا جائے، جیسے گانے والا، شہنائی بجانے والا اور اسی طرح کے دوسرے لوگ، ایفائے شرط کے مہم میں بادشاہ اور پرجا سب برابر ہوتے ہیں۔ بادشاہ نے یہ باتیں سنیں تو غصہ، صندن درگھی جمع کیا، اور ایک گڈھا کھدوایا جس میں یہ خیرین چھائی گئیں پھر وہ گڈھے میں کودا اور چل کر مر گیا، اس کے ساتھ اس کے بلا و جریہ اور بلا و جریہ کے بلا و جریہ (یعنی فدائیوں کے فدائی بھی چل کر خاک ہو گئے، اس طرح کل ملا کر دو ہزار آدمیوں نے جان دی وراس کا سبب طوطے سے بادشاہ کا یہ کہنا تھا کہ: 'بلا و جریہ' (باقی)

# اسلام ان موڈرن ہسٹری

## ایک باب کا ترجمہ

پروفیسر ڈاکٹر ڈیلور، سی، اسمتھ

مترجم

(جناب ضیاء الحسن ضا فاروقی ایم۔ اے)

(۲)

بہر حال ۱۹۴۷ء کے خوفناک دن گزر گئے اور رفتہ رفتہ ہندوستان نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان دنوں کی یاد کو ٹھنڈا دیا جائے۔ لیکن اُس وقت کے گہرے زخم یکا یک بھر نہیں سکتے، اور کوئی تلخی باقی نہ رہے، اس میں وقت لگے گا۔ پھر بھی دس سال کے اندر اندر مسلمانان ہند نے دھیرے دھیرے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ بڑے خطرے اب نہیں رہے۔ یعنی یہ کہ ہندوستان میں مسلمان ہمیشہ کے لئے قتل نہیں ہو جائیں گے (جیسا کہ اسپین میں ہو چکا ہے) یا یہ جیسا کہ بعض لوگوں کو اندیشہ تھا کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔ اکثریت نے محض جردی طور پر مسلمانوں کو معاف اور ماضی کو فراموش کیا تھا، لیکن حکومت نے انھیں انتقام لینے سے باز رکھا۔

اس اکثریت کا جذبہ خیر سگالی جس پر بہت سی چیزوں کا مدار اور انحصار تھا، مختلف حالات سے متاثر ہو رہا تھا، خاص طور سے جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، پاکستان کا رویہ اثر انداز ہوتا رہا۔ پاکستان مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرتا ہے اور خارجی معاملات میں ہندوؤں سے متعلق اس کا رویہ کیا رہتا ہے، ان سب کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ اکثریت کے رویہ اور رجحان پر پڑتا رہا ہے۔ جہاں ذرا بھی دونوں ملکوں کے تعلقات میں تناؤ پیدا ہوا یا پاکستان



کے ہندوؤں کے حالات خراب ہوئے، اس کا اثر ہندوستانی مسلمانوں پر ضرور پڑا ہے، مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی کوئی نئی بے اطمینانی، سرحدوں پر کوئی نیا واقعہ، نہری معاملات میں کھنچا یا پناہ گزینوں کی جائداد کے متعلق کوئی نئی بات۔۔۔۔۔ ان سب کا اثر ہندوستان میں مسلمانوں کی زندگی پر ظاہر ہوا ہے۔ اس عمل اور ردعمل نے مسد کشمیر کی پیچیدگیوں کو اور بھی الجھا دیا ہے۔ کشمیر اگر پاکستان کو مل جائے تو اس سے ہندی مسلمانوں کے مفاد کو سخت صدمہ پہنچے گا۔ یہاں تک کہ اگر کشمیر کے لئے پاکستان کی طرف سے کوئی دباؤ ڈالا جاتا ہے تو بھی ہندوستان میں مسلمانوں کا مفاد خطرہ میں آجاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلم قوم پرست رہنماؤں نے اس حقیقت کو جان لیا ہے اور اس کو ظاہر بھی کر دیا ہے لیکن پاکستانی اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔

بہر حال کشمیر سب سے زیادہ اہم مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں اس کے اثرات گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں اور نتائج اہم ہو سکتے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر زیادہ اہم وہ نقطہ نظر یا فلسفہ ہے جو اعمال کے پیچھے کار فرما رہتی ہے۔ پاکستان کے وجود اور اس کے بعد کی سرگرمیوں کی بنیاد مسلم مفاد اور ہندوستانی منہزم کے فرقہ واری تاویلات پر ہے۔ ویسے تو باضابطہ طور پر اس کی سرکاری پالیسی حقائق کے دباؤ سے اثر پذیر ہو کر جدید یہ ہو گئی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر پاکستان کا کوئی غیر علاقائی حق نہیں ہے مگر غیر سرکاری اور جذباتی طور پر اس حق کا احساس با اصرار باقی رہا۔

ہندوستان سے متعلق پاکستان کے رویہ میں اب بھی مخالفت کا عنصر غائب تھا اور اسے اسرار تھا کہ ہندوستانی حکومت غیر فرقہ واری نہیں ہے بلکہ اس کے شہری نئے ہندوستان کی سیکولر ازم کو الٹ ڈاکٹر فرینک گراہم اقوام متحدہ کے زیندہ کے سامنے پیش کی ہوئی ایک یادداشت (۲۱ اگست ۱۹۵۷ء) جو ہندوستان کے چار مسلمان میڈوز کی طرف سے تھی۔ بلکہ اس یادداشت کا ردعمل عام طور پر پاکستان میں یہ ہوا کہ یہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو حکومت ہند نے اس طرح مغلوب کر رکھا ہے یہ رجحان اور یہ ردعمل یہی اعتبار سے حقیقت پسندی کے خلاف تھا۔ بلکہ یہ وقت بہرو پیکٹ، بدلی پیکٹ، مار اپیل ۱۹۵۸ء۔ اس کی پوری عبارت بدل سیٹ جنرل، واشنگٹن، ۴: ۳۴-۳۶، ۱۹۵۸ء میں پیش کی ہوئی تھی۔ خاص طور سے اس کا یہ پہلا آواز منظر ہو: دونوں حکومتوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ اس بات پر زور دیں کہ امتیاز کو کسی ریاست کا انداز رہنا ہے جس کے کہ وہ شہری ہیں۔ اور انہیں چاہئے کہ اپنی شکایتوں اور تکلیفوں کے مداوائے لئے وہ اپنی ہی ریاست کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ بلکہ اس ملک میں، خاص طور (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے، اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی کرنا تو بڑی بات ہے۔  
 اس حقیقت کو محسوس کرنے کے بجائے کہ ہندوستان فی مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار ان کے  
 ”ہندوستانیت“ اور ہندوستان کے سیکولر ازم کی طرف بڑھنے میں ہے، پاکستان کا رجحان  
 یہ رہا ہے کہ وہ اس سیکولر ازم کا مذاق اڑائے اور یہ فرض کرے اور اس کی بہت افزائی کرے کہ  
 ہندوستان کے مسلمان اپنی ریاست کے وفادار نہیں ہیں۔

جزوی طور پر یہ صحیح ہے کہ اس صورت حال میں مختلف قومی مفادات کے تصادم کو بھی  
 دخل ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی اور کچھ ہے، جس کی جڑیں مسلم لیگ کے اس نظریے سے ملتی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) سے مغربی پاکستان میں باہر سے جانے والے ہر شخص پر واضح طور پر یہ بات ظاہر ہو جاتی  
 ہے۔ شائع شدہ لٹریچر میں بھی یہ چیز دیکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً حکومت کے پندرہ روزہ پاکستان نیوز انکسٹ،  
 کراچی کا قاعدہ یہ شمارہ اور خاص طور سے روزنامہ ”مدن“، کراچی کے دارے۔ اسے یہ وہی ہیں از تقسیم مسلم لیگ کا  
 روزنامہ رجحان ہے جو اس نے کانگریس کے ہتھیار میں اختیار کیا تھا۔ یعنی اسے اصرار تھا کہ نہ صرف مسلم لیگ  
 ہی ایک مذہبی فرقہ (”قوم“) کی نمائندہ ہے بلکہ کانگریس بھی محض ایک ہی فرقہ کی نمائندگی کرتی ہے اور  
 اسے چاہیے کہ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرے۔ لیکن بچے آپ کو کبھی یہ مانتے پر تیار نہ کر سکی کہ کانگریس کا اصول  
 اس سے مختلف تھا یعنی یہ کہ دونوں جماعتوں کے اختلافات دراصل ایک فرقہ وارانہ جماعت تار ایک غیر  
 فرقہ وارانہ جماعت کے اختلافات تھے۔ یہی وہ حقیقی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان شروع  
 سے مصالحت کی۔ پوشش نامہ ہوئی رہی۔ (ملاحظہ ہو:- ڈبلیو سی۔ اسمتھ کی کتاب، ماڈرن اسلام  
 ان انڈیا، لاہور، ۱۹۸۷ء، صفحات ۲۹۲-۲۹۴، لندن، ”اسٹڈی“ (یا غالباً ۱۹۸۷ء)، صفحات  
 ۲۵۳-۲۵۴، مثلاً ڈان، کراچی کا ۳۱ سلسلہ میں طنز کا معیار یہ ہے کہ وہ ”سیکولر انڈیا“ ہمیشہ  
 کامیاب کے ساتھ کہے گا۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایسا ذمہ دار اور سوچنے  
 والا شخص (جب وہ پاکستانی حکومت کے ایک رکن تھے) ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اپنی مایوسیوں  
 کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ تحریری طور پر ظاہر کرے۔ پرنسٹن (امریکہ) میں ۱۹۵۳ء میں سلامک کلچر پر غور و فکر  
 کے لئے جو اجتماع ہوا تھا اس میں ڈاکٹر صاحب موعوف نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے فرمایا: ”سوسالی میں“  
 یا شاید اس سے کم مدت میں، ہو سکتا ہے کہ اس ملک (ہندوستان) میں مسلمان کا وجود ہی باقی نہ رہے۔  
 مقالہ کا عنوان تھا ”دی نیشنل انٹیلیجنس آف پاکستانی کلچر“ جو ”ی مسلم ورلڈ“ (ہارٹ فرڈ) ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔  
 مگر قطع نظر اس کے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن پر اس کا کتنا برا اثر پڑتا ہے، نہ صرف تقریروں میں یہ باتیں  
 کہی جاتی ہیں بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو جن میں بعض ذمہ دار حصوں پر ہوتے ہیں، اپنا ملک چھوڑنے پر  
 (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)



ہیں کہ ”ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں“۔۔۔۔۔ یہ نظریہ جب عمل میں آیا تو اپنے ساتھ تصادم اور تباہی بھی لایا۔ یہ نقطہ نظر اب بھی باقی ہے اور جب تک یہ باقی رہے گا، درودنا کی کے ساتھ انتشار بھی باقی رہے گا۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ خیالات اگر ان پر پہلے ہی سے اچھی طرح غور و فکر نہ کر لیا جائے، جب عمل میں لائے جاتے ہیں تو ان کا تضاد واضح ہو جاتا ہے۔ دو قومی نظریے کی مشکل بھی یہی تھی۔ اس نظریے کے ساتھ ایک بڑا پروگرام تھا اور اس کے ساتھ جذبات کا ایک اتھاہ سمندر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس ”مسلم قوم“ کے ایک طبقہ کے حق میں اس کے نتائج مضر ثابت ہوئے۔ یہ ہندوستانی مسلمان ہی ہیں جنہوں نے پاکستان کے مطالبہ کے لیے بہانے کی بھاری قیمت ادا کی۔

اس طرح جذباتی تضادات سمجھئے۔ اتھ ساتھ جہاں پاکستان کی تجویز میں ایک مثبت تبدیلی عنصر تھا وہاں شدید نفرت و خوف کا منفی پہلو بھی شامل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کے اس مثبت نصب العین کے سلسلہ میں کردہ آزاد ہو جائیں، ایک منفی جذباتیت کا اظہار کیا اور ان کے آزاد ہونے کی خواہش کی مخالفت کرتے رہے۔ پاکستان بن گیا لیکن منفی رجحان باقی رہا، ہندوستان میں اس کے رد عمل کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ پاکستان کی غامیوں کی قیمت مسلمانان ہند ادا کر رہے ہیں نہ صرف موجودہ سرگرمیوں کے نتیجے میں بلکہ نظریہ پاکستان کے بنیادی حوالے کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ابھارا جاتا ہے، جوٹس اور ریگڈ رائٹس کی مثال پہلے دی جا چکی ہے۔ انھیں پاکستان اور حکومت پاکستان کی طرف سے طرح طرح کی پیش کش کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں ہندوستان یونیورسٹیوں کے وہ گریجویٹ بھی ہیں جو امتحان پاس کرنے کے بعد فوراً پاکستان چلے جاتے ہیں اور وہاں انھیں ملازمتیں مل جاتی ہیں۔ مگر کم سے کم پاکستانیوں کے نزدیک مسٹر جناح ایک بڑے چالاک اور ہوشیار رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ایک اچھے ”مجادلہ باز“ اور وکیل تھے۔ لیکن شاید یہ موقع مناسب نہیں ہے کہ ان کی سیاست الٹی اور تذبذب کو معرضہ بحث میں لایا جائے۔ غالباً انھوں نے کبھی پنجاب اور ننگرال کا نقشہ بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پنجاب کے نہری سسٹم کا سمجھنا تو بڑی بات ہے۔ کشمیر اور پاکستان کی سرحدوں کی موجودہ صورت حال کا تصور بھی وہ نہیں کر سکے تھے۔ ان کے ذہن میں پاکستانی سرحدوں کا اور ہی نقشہ تھا۔ (ملاحظہ ہو: گاندھی



پھر انتظار کرنا پسند کریں گے۔

لیکن حضرت علیؑ پر ہنسے کے بعد جھکنے کے قائل نہ تھے وہ چال کرنے اور ناک میں ہنسنے کا کام نہیں کرتے تھے اور نہ باتوں میں لگی لپٹی یا دھکی چھپی رکھتے تھے پھر بھی معاویہؓ کے معاملے میں انھوں نے کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ مسود ابن مخزومہ کو اپنا ایک خط دے کر بھیجا جس میں معاویہؓ کو لکھا کہ وہ بیعت کر لیں اور شام کے رُوسا اور مصر زین کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ آجائیں خط میں یہ نہیں لکھا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے حاکم باقی رہیں گے کہا جاتا ہے کہ یہ خط حضرت علیؑ نے سیرہ چھنی کے ہاتھ روانہ کیا تھا، معاویہؓ نے جب یہ خط پڑھا تو کچھ جواب نہیں دیا بلکہ انتظار میں رکھا اور جیسے کی فکر کرنے لگے، حضرت علیؑ کا نام ہر جب جواب پر اصرار کرتا تو اس کو خوفناک جنگ کے مناظر پیش کرتے ولے اشعار سناتے۔

حضرت عثمانؓ کے حادثے کا تیسرا حصہ تھا جب معاویہؓ نے ایک ان بنی عباس کے ایک آدمی کو بلایا اور اس کو اپنے دستخط کا ایک طوار دیا جس کی سرخی تھی۔ من جانب معاویہ ابن ابی سفیان بنام علی ابن ابی طالب۔ اور اس کو ہدایت کر دی کہ جب مدینہ میں داخل ہو تو اس پٹے ہوئے کاغذ کو اونچا کر دے کہ وگ سرخی پڑھ لیں اس کے بعد اس کو علیؑ کے حوالے کر دینا اور اگر وہ تمہارے آنے کے بارے میں تم سے کچھ باتیں کریں تو تم ان سے یوں کہنا۔ اور یوں کہنا۔ یہ جیسی مدینہ پہنچا اور طوار کو اتنا بند کیا کہ لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ معاویہؓ کا جواب لے جا رہا ہے اب لوگوں کی آتش شوق تیز ہونے لگی کہ دیکھیں معاویہؓ نے کیا کہا ہے غائب

آدم اداۃ حصن اوخذ ابیدری  
حرباً غزوہ سالتہ الجرح والاعزوم  
فی جاکم و اھم اذ کان مقلدہ  
ستغناء شیبیت ارشد ح والہم  
اعیا المسود بہا والسید من فم  
یوجد بہا عبر موح و الاحب

فتمہ کی طرح مجھے رہو یا پھر مجھے ایک ہوساک لڑائی کی دعوت دو۔

تمہارے پڑوسیوں اور لڑکوں کی ایسی سخت خوں ریزی ہوگی کہ کپٹی درہم کے بال سفید ہو جائیں گے۔  
آقا اور غلام دونوں عاجز ہو جائیں گے اور سہارے سو کوئی دانی در حاکم نہ ہوگا۔

بہت سے لوگ عیسیٰ کے پیچھے حضرت علیؑ کے مکان تک پہنچے ہوں گے، جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے وہ طومار آپ کو دیا آپ نے اس کو کھولا تو اس میں صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا پایا اس کے سوا اس میں کچھ نہ تھا تب آپ نے عیسیٰ سے پوچھا کیا خبر لائے ہو اس نے جان کی امان طلب کی حضرت علیؑ نے منظور کر لیا اس کے بعد اس نے بتایا کہ شامی حضرت عثمانؓ کے خون کا بدلا لینے کا پکارا ارادہ کر چکے ہیں انھوں نے حضرت عثمانؓ کا خون آلود پیرس عوام کے لئے لٹکا دیا ہے جس کے گرد و پیش لوگ جمع ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں پھر اس نے کہا کہ شامی آپ کو حضرت عثمانؓ کے خون کا ملزم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کے خون کے سوا ہمیں کوئی بات منظور نہیں، اس کے بعد عیسیٰ باہر نکلا اور معاویہ کے خلاف مشتعل مجمع سے بڑی مشقت کے بعد چھٹکارا پایا سکا۔

اس کے بعد حضرت علیؑ نے مدینہ کے بڑے بڑے لوگوں کو بلایا جن میں طلحہؓ اور زبیرؓ بھی تھے اور سب کے سامنے معاویہ کی پیش کش یعنی اعلان جنگ رکھا اور کہا بھلائی اسی میں ہے کہ قتلہ بڑھنے اور بڑے ہونے سے قبل ختم کر دیا جائے اور قبل اس کے کہ شامی ان پر حملہ آور ہوں۔ شامیوں پر حملہ کر دیا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی طرف سے حضرت علیؑ کو تسلی بخش جواب نہیں ملا اور لڑائی کے لئے جس جوش و خروش کی ضرورت تھی اس کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ پھر طلحہؓ اور زبیرؓ نے آپ سے مل کر جانے کی اجازت چاہی جس میں درخواست کی سی نرمی نہیں بلکہ مطالبہ اور اصرار کی سی خدشہ تھی اور مردم منظوری کی حالت میں خلاف ورزی کی دھمکی بھی، حضرت علیؑ نے کہا جہاں تک ہو سکے گا روکنے کی کوشش کی جائے گی۔

بہت سے مورخوں کا بیان ہے کہ طلحہؓ اور زبیرؓ نے عمرہ کی غرض سے مکہ جانے کی اجازت چاہی تھی درحقیقت علیؑ کو ان کی اس غرض پر شبہ تھا اس لئے ان دونوں نے آپ کو یقین دلایا کہ ان کا مقصد صرف عمرہ ہے۔ بات جو بھی رہی ہو یہ دونوں، حضرت علیؑ کی مرضی سے یا خلاف مرضی، بہر حال مکہ روانہ ہو گئے اور حضرت علیؑ شامیوں سے جنگ کی تیاری کرنے لگے کہ ان کے اقدام سے پہلے

خود حملہ کر دیں۔

ابھی آپ لڑائی کی تیاریوں میں تھے کہ مکہ سے بے چین کر دینے والی خبریں آئیں جن سے آپ کی رائے میں تبدیلی پیدا ہو گئی، اور آپ نے اپنا منصوبہ اور منزل بدل دی۔

## علیؑ کے مخالفین

آپ جانتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کا حادثہ حج کے دنوں میں ہوا، اس وقت مدینہ کے بہت سے لوگ حج سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے، ان کو واقعے کی اطلاع مدینہ کے راستے ہی میں ملی، ان میں کچھ تو ایسے تھے جو یمن کر مدینہ پہنچے اور حضرت علیؑ کی بیعت کر لی اور کچھ ایسے تھے جو خبر پاتے ہی اٹھے پاؤں مکہ واپس آ گئے اس لئے کہ فتنہ و فساد سے دور رہنا چاہتے تھے یا یہ کہ ان واقعات کا ان پر بہت بُرا اثر پڑا اور ان کے دلوں میں نئے خلیفہ کے خلاف غصے اور مخالفت کے جذبات پنہاں تھے، خود مدینہ کے بعض لوگ جو حضرت علیؑ کی بیعت کے موقع پر حاضر تھے بیعت کر لینے یا بیعت سے انکار کر دینے کے بعد مدینہ چھوڑ رہے تھے اس لئے کہ ان کو حضرت علیؑ سے اختلاف تھا یا اس لئے کہ وہ مکہ میں گوشہ نشین ہو جانا چاہتے تھے کیوں کہ مکہ مکرمہ امن و عافیت کا حرم ہے جہاں خون خرابہ نہیں ہو سکتا جہاں پہنچ جانے والے کو ڈرایا دھمکایا نہیں جاسکتا چنانچہ عبداللہ ابن عمرؓ اپنی جان اور اپنا دین فتنوں سے بچائے مکہ کے لئے نکل پڑے، حضرت علیؑ ان کو واپس بلانے کے لئے سوار دوڑاتے کا ارادہ کر رہے تھے کہ آپ کی صاحبزادی ام کلثومؓ جو حضرت عمرؓ کی زوجہ محترمہ تھیں آگئیں اور حضرت علیؑ کو یقین دلایا کہ وہ شورش اور مخالفت پیدا کرنے کی غرض سے نہیں جا رہے ہیں، طمّحہ اور زبیرؓ نے بھی مکہ کا رخ کیا جانے کا مقصد عمرہ کرنا بتایا، یا اطمینان دلایا کہ وہ معاویہؓ اور شامیوں کی طرف سے جنگ میں حصہ نہیں لیں گے پھر حضرت عثمانؓ کے گورنروں میں سے جس کو بھی موقع مل سکا وہ مکہ آگیا، عبداللہ ابن حاتم آئے، یحییٰ ابن اُمیہؓ اسی طرح بنی اُمیہ کے بہت سے آدمی آئے انھیں میں سے مزوان



ابن حکم اور سعید ابن العاص ہیں، ازواج مطہرات میں سے مکہ میں حفصہ بنت عمرؓ، ام سلمہؓ، اور عائشہؓ بنت ابوبکرؓ موجود تھیں حضرت عائشہؓ توجہ سے فراغت پا کر مدینہ روانہ ہو چکی تھیں، اہ میں حضرت عثمانؓ کے قتل کی خبر ملی اور بتایا گیا کہ لوگوں نے طلحہؓ کی بیعت کر لی یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئیں اس لئے کہ ان کی طرح طلحہؓ بھی قبیلہ تیم کے تھے لیکن پھر ان کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جس نے ان کو حقیقت حال سے باخبر کر دیا اور بتایا کہ مدینہ میں حضرت علیؓ کی بیعت کی جا چکی ہے یہ سن کر حضرت عائشہؓ کو بڑی کوفت ہوئی اور کہا علیؓ کو خلیفہ دیکھنے سے پہلے اچھا ہوتا کہ آسمان زمین پر گر پڑتا پھر ساقیوں سے کہا کہ مجھے واپس لے چلو چنانچہ مکہ واپس آگئیں، لوگوں میں یہ بات عام ہو چکی تھی کہ حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ سے خوش نہیں ہیں بلکہ انکی الی بات کے بعد تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ حضرت علیؓ سے سخت ناراض ہیں جب آنحضرتؐ کو تسلی دیتے ہوئے حضرت علیؓ نے عائشہؓ کو طلاق دے دینے کا اشارہ کیا اور کہہ دیا کہ — اور بہت سی عورتیں ہیں۔ یہ واقعہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے جس میں اللہ نے حضرت عائشہؓ کی براءت کی ہے، پس حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ کی یہ بات دل سے بھلا نہ سکیں، اس زمانے میں مسلمانوں کی تاریخ، جن زبردست اور مؤثر ترین شخصیتوں سے رشتہ س ہو سکی ان میں ایک شخصیت حضرت عائشہؓ کی بھی ہے، اپنے اجداد کی طرح حدیث نرم دل نہ تھیں بلکہ ان میں قاروق اعظمؐ کی طرح شدت بھی تھی، پھر یہ اس وراثت کی بھی خاص حصہ دار تھیں جو جاہلیت کے دور نے عربوں کو ہاتھ چپہ نہج وہ بہت زیادہ اشعار یاد کرتی تھیں، پڑھتی تھیں اور بر محل پیش کیا کرتی تھیں چنانچہ ”مکہ کو ہاست زرع میں، بیکہ کر آئے جب شاعر کا یہ شعر پڑھا۔“

احمر رب ما لعمری انشأ عدا، اصفیٰ اذا حشر حیت یوما دضاق بہا الصدق  
نزدق کی قسم زرع کی ہاست میں درست نشان کو ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتی۔

اسے یہ شعر عربیہ شاعر نے کہا ہے۔

(باقی آئے)

# عربی کی ایک قلمی کتاب سے

## تاریخ ہند پر نئی روشنی

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد فاروق صاحب استاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

(۶)

۲۹-۲۸/۳

ابو الحسن محمد بن حرب نے مجھ سے کہا کہ شہر رتن (۶) کے باہر اس سے کوئی ساڑھے چار میل دور ایک بڑا مندر ہے جس میں پتھر کی ایک بڑی مورتی رکھی ہے، مندر میں ساٹھ عورتیں ہیں جن کی جسم فروشی کی کمائی مندر کی ضروریات، مورتی کی دیکھ بھال اور مندر کے عمل پر وقف ہے۔ اس مندر میں جو پردیسی سفر کو جاتے وقت یا سفر سے لوٹتے وقت آتے ہیں وہ ان عورتوں سے مفت اپنی جنسی ضرورت پوری کرتے ہیں (اور ہا میر اُحد منهم بغیر اُجرة ولا عوض ولا شئ) کوئی مسافر اگر کسی عورت کو کچھ دے تو وہ نہیں لیتی۔ اس منصوری نے کہا کہ میں نے بعض سادھوؤں (مُتروسیلین) کو کہتے سنا کہ عورتوں کے وقف کا سبب یہ ہے کہ ایک راجہ کی رانی ٹہل کر آ رہی تھی، وہی اللہار بن اسی برص (۷) کہ اس کا گذر ایک ناریل کے درخت کے پاس سے ہوا، درخت کے نیچے ایک شخص بیٹھا استمغنی بالند کر رہا تھا، یہ دیکھ کر وہ ٹھہر گئی اور اس کے حاشیر کے لوگ بھی رُک گئے، وہ ہاتھی پر سوار تھی۔

رانی کے حکم سے وہ شخص اُس کے پاس لایا گیا، وہ آیا تو رانی نے اس سے کہا: بھلے آدمی تجھے خدا کا کچھ خوف نہیں، تجھے کوئی بیماری نہیں اور پھر تو یہ کام کرتا ہے!“ اس شخص نے کہا: میں نے مجبور ہو کر ایسا کیا۔“ رانی: تو ایسے شہر میں آیا جہاں کسیوں کی کوئی کمی نہیں، پھر بھی تو یہ حرکت کرتے ہوئے لوٹ رہا ہے، اس شخص نے کہا: میں پردیسی ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ رانی نے نوکروں کو حکم دیا کہ اس کا جھاڑا لیں، اس کا جھاڑا لیا گیا تو اُس کے پاس کچھ نہ نکلا۔ اس شخص کی زبوں حالی دیکھ کر رانی کو بڑا قلق ہوا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کہا: واقعی یہ پردیسی ہے اور مجبور، اس کے پاس پیسہ نہیں کہ کسی کے پاس جائے، اس کی اور اس جیسے کنگلوں کی تکلیف کا گناہ ہمارے سر ہے۔“ اس نے اپنے ایک سکرٹری سے کہا: میں یہاں سے اس وقت تک نہیں ہلوں گی جب تک تم انجنیروں اور ٹھیکہ داروں کو نہیں بلاؤ گے اور اس جگہ ایک مندر کا تخمینہ نہیں لگاؤ گے، مندر میں پردیسیوں اور مسافروں کے لئے کسبیاں رکھو جو رات کو ان کے ساتھ رہیں۔ اس طرح رانی نے مندر بنوایا اور اس میں مورتی رکھی اور مسافروں کے لئے ساٹھ کینزس وقف کیں، جب کوئی کینز بوڑھی ہو جاتی تو اُس کی جگہ جوان رکھ دی جاتی۔ شہر کا کوئی آدمی یا مندر کا کوئی خدمت گار اگر ان سے جنسی ضرورت پوری کرتا تو اس کو فیس دینا ہوتی، لیکن پردیسیوں سے کچھ نہ لیا جاتا۔

۲۹/۲ شیخ بہاء الدین بن سلامہ نے مہند کے دوسرے حالات کے ضمن میں یہ واقعہ بیان کیا :-



ہم نے ایک بندر پر لنگر ڈالا جس کے ایک جانب کھیتی تھی ۔ ہم کھیتی کے برابر فردکش ہوئے ، ہمارا ایک ساتھی جو ایک ممتاز تاجر اور مال دار آدمی تھا پیٹ کے بل لیٹ گیا ، اس کا پیر پھیلا ہوا تھا ، کھیت کے آخر سے ایک سانپ نکلا اور اس کا پیر ڈس لیا ، سانپ جہاں سے آیا تھا وہاں چلا گیا ، تاجر بے ہوش ہو گیا ، ہم نے اس کو پلانے کے لئے تریاق نکالنا چاہا کہ ایک مقامی آدمی نے کہا : تریاق سے کام نہیں چلے گا ، اگر تم اپنے ساتھی کی زندگی چاہتے ہو تو سانپ کے منتر والے کو بلاؤ۔ ہماری درخواست پر وہ خود ایک شخص کو جو سانپ کاٹے کا منتر جانتا تھا بلا لایا۔ منتر والے نے سٹو دینار (اس وقت کے حساب سے تیرہ سو روپے سے زیادہ) فیس مانگی ، ہم نے کہا دیں گے۔ اُس نے ابھی منتر کے چند بول پوری طرح ادا بھی نہ کئے تھے کہ سانپ آگیا۔ منتر والا : اس سے کوئی کچھ نہ بولے ، وہ مار گزیدہ کے پاس آیا اور وہ جگہ چوسی جہاں ڈنک مارا تھا ، اس کے بعد وہ لوٹ گیا۔ مار گزیدہ کھڑا ہو گیا گویا اس کے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ہم نے سٹو دینار فیس ادا کی اور منتر کی کرامات پر حیران ہوئے اور وہ جگہ چھوڑ دی اور بندرگاہ لوٹ گئے۔

مجھ سے ایک شخص نے جو ہند کا سفر کر چکا تھا بیان کیا : میں نے سنا کہ اعلیٰ قسم کا نادر اور قیمتی الماس کشمیر میں پایا جاتا ہے۔ وہاں دو پہاڑوں کے بیچ ایک وادی ہے جس میں گرمی ہو یا جاڑا چوبیس گھنٹے آگ جلتی ہے اور الماس اس وادی میں ہوتا ہے۔ اس میں ہند کے ایک نیچ ذات لوگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جاتا۔ ان کی ایک ٹولی جان کی بازی لگا کر وہاں جاتی ہے۔ یہ لوگ دہلی بکریاں ذبح کر کے ان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں

اور خلیوں میں رکھ کر ایک ایک ٹکڑا پھینکتے ہیں، وہ خود آگ کے پاس نہیں جا سکتے، ایک تو آگ کی لپٹ بہت تیز ہوتی ہے اور دوسرے لا تعداد سانپ اور اژدھے آگ کے قریب ہوتے ہیں اور ان میں ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ منٹوں میں آدمی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ جب گوشت پھینکتے ہیں تو اس کو اٹھانے کی وجہ کثرت سے وہاں ہیں، اُترتے ہیں۔ اگر گوشت آگ سے دور گرتا ہے تو وہ اس کو اٹھا لیتے ہیں یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ گد نے گوشت اٹھا لیا ہے تو اس کا پیچھا کرتے ہیں، کبھی گوشت کے ٹکڑوں سے الماس کا کوئی دانہ گر پڑتا ہے۔ کبھی گوشت کا ٹکڑا آگ میں گرنا ہے اور جل جاتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گد گوشت کے ٹکڑے پر اُترتا ہے اور وہ ٹکڑا آگ کے قریب ہوتا ہے تو وہ گوشت کے ساتھ خود بھی جل جاتا ہے، کبھی گد ٹکڑا زمین پر گرنے سے پہلے ہی اچک لیتا ہے۔ جو صورت بھی پیش آئے الماس حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ اکثر الماس کی ہم پر جانے والے سانپوں اور اژدھوں کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ چوں کہ الماس بڑا شان دار اور قیمتی پتھر ہے اس علاقہ کے راجے اس کی ٹوہ میں رہتے ہیں، اور الماس کی ہم پر جانے والوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور ان کا بڑا سخت جھاڑا لیتے ہیں۔

۳۶/۲ ایک سے زیادہ لوگوں نے مجھے بتایا کہ انھوں نے ہند کے کسی شہر میں ہاتھی دیکھا جو اپنے مالکوں کے کام کاج کرتا تھا۔ ہاتھی کو سودے کا برتن دے دیا جاتا اور اُس میں کوڑیاں جن کے ذریعہ خرید و فروخت ہوتی، رکھ دی جاتیں اور مطلوبہ چیز کا نمونہ، جیسے مرچ، چاول اور مسقط (۹)، غرض کہ ہر مطلوبہ چیز کا نمونہ اس برتن میں ہوتا۔ برتن لے کر ہاتھی نئے کی

ردِ عمل کے طور پر بھی۔ پاکستان کی کامیابیوں میں ان کا کوئی حصہ نہیں لیکن انھیں اس کی خرابیوں کی پاداش میں مصیبتیں جھیلنی ہیں۔

پاکستان میں اس داخلی اور جذباتی ہيجان کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان نفسی طور پر اس کو برحق سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ بہت برا سلوک ہو رہا ہے اور ان کی حالت بہت خراب ہے، اس سلسلہ میں ان کا یقین اتنا پختہ ہے کہ بسا اوقات آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ پاکستان والے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق بُری خبر سُنتا پسند کرتے ہیں اور ان کے بارے میں فلاح و بہبود کی کوئی واقفیت انھیں گوارا نہیں۔ مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کا جذباتی تعلق اب بھی بہت قریبی و گہرا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان بڑی عجیب و غریب پوزیشن میں ہیں، ان کے مستقبل کا معاملہ دوبارہ گروہوں پر منحصر ہے۔ ان کے حالات پر نہ صرف یہ کہ ان کے ملک کے ان شہریوں کے رویے کا

لے اس موقع پر مسئلہ ”قربانی“ کو یاد رکھنا چاہیے۔ یعنی یہ کہ پاکستان میں اسلام کو پھولنے چھلنے کا موقع ملے اس کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے قربانی دی ہے۔ انجام کار وہ کہتے ہیں کہ ”ہمارے بھائی آزاد ہو جائیں، بلا ایسے ہمیں مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔“ یہ نقطہ نظر کافی معقول ہے اگر اس میں سنجیدگی اور غنوص ہو، اور محض ذہنی تشفی کے لئے نئی تادیل نہ ہو۔ بہر حال یہ معلوم ہونے پر کہ پاکستان میں سلام ترقی پانے کے بجائے مینافق اور بے بس سیاست دانوں کے ہاتھ میں بڑی حد تک کھنڈین کر رہ گیا ہے، قربانی دینے والے مسلمانوں کو بڑی تلخ بایوسیدوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مسئلہ بننا ہر اس قسم کا احساس خاص طور سے گفتگو کے دوران میں ہوتا ہے۔ لیکن ایسے بھی ہوتا ہے جب پاکستانی پریس میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ بُرے سلوک کی کہانیاں ایک خاص انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ ہمدردی کے علاوہ پاکستانی سیکولرزم میں ایک عنصر یہ بھی ملتا ہے، زیادہ گہرائی میں نہیں، جو ہندی مسلمانوں کے متعلق کسی بھی خیر کو مست پسند نہیں کرتا۔ آج بھی (۱۹۵۶ء) پاکستانی نیوز ڈائجیسٹ بڑے اہتمام سے ہندوستان میں عیسائیوں کے ساتھ ناروا سلوک کی کہانیاں شائع کرتا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک طرح کا نفسی ضرورت یہ پوری کرنی مقصود ہے۔ مثلاً گوئی وجہ نہیں کہ پاکستانی حکومت مصدک کے پالیسیوں کے ساتھ بڑے سادک کی داستانیں شائع کرے یا راجستان میں یہودیوں کے ساتھ جو بچہ ہوتا ہے اسے (کواشاعت دے۔)



اثر پڑتا ہیہ معلوم ہوتا ہے جو اُن کے ہم مذہب نہیں بلکہ ایک دوسری قوم کے مسلمانوں کی سرگرمیوں کا بھی۔ وہ ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہوئے پر مجبور کر دئے گئے ہیں جہاں انھیں ایک دوسری مسلم جمیعت کی حقیقی یا غیر حقیقی حرکتوں اور زیادتیوں کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ لاہور میں اگر غیر مسلم مارے جائیں تو مسلمان ہندو مجروح ہوتے ہیں، ڈھاکہ میں اگر کوئی نا انصافی ہو تو ان کے ساتھ ہندوؤں میں انصاف کرنے کا کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے پاکستان جتنا "اسلامی" بنتا ہے (خاص طور سے ابھی تک ہیئت ہی ہیئت ہے، معنی کا دور تک پہنچ نہیں، تباہی ہندی مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں۔ ایک خطی بھونڈے طریقہ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ پاکستان میں اسلام کو جتنا فروغ حاصل ہو گا اسی قدر ہندوستان میں سے انتشار کا سامنا کرنا ہو گا۔

اس خط کشیدہ ریمارک میں اگر کچھ بھی حقیقت ہے تو اس کی نفی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے مسلمان کو ایک بلند داخلی اور نازک متحرک فکر کے طے پر پڑتے ہیں۔ ان لوگوں سے جو اسلام کی اس تیسرے کو اپنانے میں ناکام رہتے ہیں داخلی اور خارجی دونوں طرح کی الجھنیں ہیں۔

اپنی بلانی ہوئی مصیبت اہم کہہ چاہیے کہ پاکستان کا نظریہ اور وجود میں ہندوستانی مسلمانوں کی "خرابی" کی ایک صورت "مغیر" رہی ہے۔ لیکن ان کی خرابی کا اس سے زیادہ اہم سبب خود ان کا اپنا ذہنی رجحان اور رویہ ہے۔ پاکستان کی حکمت عملیوں کا اثر مقابلاً ان پر کم پڑتا اگر وہ اپنے خیالات اور رویے کو ٹھیک رکھتے۔ پاکستان کے وجود سے زیادہ نظریہ پاکستان سے مسلمان ہندو کو وابستگی رہی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ وابستگی ختم نہیں ہوئی اور یہاں ان کے جذباتی اور سماجی انتشار کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ جب تک ہندوستان میں مسلمان اسی طرز پر سوچے رہیں گے اور اپنے رجحان اور رویے سے پاکستانی مسلمانوں اور ہندوستان میں ہندوؤں کو اس کا موقع دیتے رہیں گے کہ وہ انھیں "ہندوستانی مسلمان" سمجھیں اس وقت تک ان کی حیثیت غیر واضح رہے گی۔ یہ رنگ اور مہم رہے گی۔ انجام کار ان کی ساری صداقتیں تباہ ہو جائیں گی اس وقت سے بچھپے دس سالوں میں ان کے دنوں

میں خوف و ہراس پیدا کیا ہے اور آئندہ بھی اعلیٰ اور خارجی، جذباتی اور سماجی عدم تحفظ کے احساس اور پریشان کن خیالات کا منبع بن رہے گا۔ خوف و تذبذب اعلیٰ انتشار اور خارجی عدم اعتماد کی فضا میں پر دان چڑھتا ہے۔ ہندوستان کی دوسری جماعتیں اس وقت تک اُن پر بھروسہ نہیں کر سکتیں جب تک کہ وہ مفتوحہ کلمسٹ "The Gold mine" ظاہر ہوتے رہیں گے۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ان شرائط کے ساتھ وہ اس صورت حال کو جس میں کہ وہ ہیں قبول کرنا تو درکنار مشکل سے تسلیم بھی کر سکتے ہیں۔ یہ محض تاریخی الجھن ہی نہیں ہے یہ ایک دینی مسئلہ ہے۔ ان کا مذہب — اسلام — وہ چیز ہے جو عداوت کی بچیدگیوں میں ان کا سہارا ہے۔ ایک اب حقیقی سہارا جو عالم کس میرسی میں ان کو حوصلہ بخشتا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ اسلام سی ہے جو انہیں پاکستان سے جوڑتا ہے۔ اور اس ہندوستان سے الگ لگتا ہے جہاں وہ رہتے ہیں اور اسلام کافی نفسہ اس میں اتنا بکھرا نہیں ہے بلکہ یہ اسلام کی ایک مخصوص تعبیر اور تشبیح ہے جس سے ۱۹۴۷ء کے بعد کے برسوں کی ہم و تازک مدت میں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ جماعت کے سمجھدار افراد نے اپنا آپ کو الگ رکھا لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے جس نے سب سے بڑے تھپڑ دانی دئے اور ان کے اثر سے مسلمانوں کی یہ جماعت پوری طرح آزاد نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضرورت ہے کہ نئے حالات کے مطابق اسلام کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا جائے جس میں تقسیم کا جذباتی رنگ نہ ہو اور جس میں ایسی متحرک لچک ہو جو اس جماعت کو آج کے حالات و مواقع سے بہرہ آرم ہوئے

کا حوصلہ دئے۔

مسلمانان ہند کی کثرت نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ غیور ہیں، وہ بہن گئے ہیں اُن خارجی حالات و رجحانات کے، تقدیر میں بننا پر انہیں قابو نہیں ہے۔ انہیں یہ اندازہ ہوا کہ انہیں ایسی صورت حال سے سابقہ ہے جسے وہ پہلے نہیں کرتے تھے اور جس سے نجات پانے کے لئے وہ اندھے جوش و جذبہ کے ساتھ تھے، ان کے لئے یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ ضرورت حال زیادہ

آزاد کشوں کے ساتھ ان کے سر پر مسلط ہے۔

بہر حال یہ احساس، خواہ کتنا ہی گہرا اور اہم ہو، بنیادی طور پر غلط ہے۔ اُن کی تاریخ نے جو یہ نئی کردٹ بدلی ہے تو اس میں نہ تو کسی جاہر تقدیر کا ہاتھ ہے اور نہ کسی بنیادی طاقت کا۔ یہ صرف اس کے یہ سب کچھ انھیں لکھا ہوا ہے۔ اسلامی تاریخ کے اس واقعہ کی ذمہ داری خود اُن مسلمانوں پر ہے جو اس سے متعلق تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ان حالات کی آرزو نہیں کی تھی جن میں کہ آج وہ اپنے آپ کو پاتے ہیں، لیکن وہ قدم انھیں کا اٹھایا ہوا تھا جس کے نتیجہ میں یہ آج کے حالات رونما ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد، طویل عرصہ تک دبے رہنے کے بعد، یہ جماعت آزادی کی منزل کی طرف بڑھی اور پھر اس آزادی کو قیام پاکستان کی جدوجہد میں استعمال کیا۔ یعنی تقسیم ہند کا مطالبہ کیا۔ اس لئے بنیادی طور پر پاکستان کے قیام کی ذمہ داری ہندوستانی مسلمانوں پر ہے اور اسی لئے اس کے بعد ہندوستان میں اُن کی جو پوزیشن ہے اس کے بھی وہ ہی ذمہ دار ہیں۔ پاکستانیوں نے اُن کی پیروی کی اور پاکستان کو قبول کر لیا لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے راہ دکھائی اور پاکستان بنایا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ واضح طور پر اُس سانچے کو نہ دیکھ سکے جس میں کہ وہ خود اپنی تاریخ ڈھال رہے تھے۔ یہ تو ممکن ہے کہ دورانِ اندیش اور اندیش مند بننے بننے آزادی مل جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس آزادی کی ذمہ داری سبھی لزم ہو جا سکے۔ ہندوستان میں مسلمان اپنی نئی صورتِ حال کے لئے محض اس لئے ذمہ دار نہیں ہے کہ انھوں نے قیام پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ ضرور ہے کہ یہ بنیادی بات ہے لیکن اس کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جن میں سے ایک ۱۹۴۷ء کے بھارتی وقت میں لیڈروں کا پاکستان چلا جانا ہے۔ پڑھے لکھے مسلمان، تاجرانہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو با اثر مسلمان تھے ان کی اکثریت نے پاکستان کا راستہ لیا اور عام مسلمان بڑی حد تک "کاروانِ بے یوسف" بن کر رہ گئے۔ مسلم لیگ نے اس "ہجرت" کی بہت افزائی کی بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا کیا بنے گا۔ کل ہند کا پورے پیمانہ پر یہ یو جھان اہم مسلمان شخصیتوں کے



چھوٹے سے گروہ نے اٹھایا جو شروع سے قوم پرست رہی تھیں اور ہندوستانی قومیت کی آئینہ دل کی وفادار تھیں لیکن مقامی اور علاقائی پیمانے پر یہ بوجھ بہت بڑا تھا اور فوری عملی نتائج اور اخلاقی ذمہ داری و جرأت کے دیوالیہ پن کے اثرات کے لحاظ سے مسلمانان ہند کو بڑا شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ اب اس میں وقت لگے گا کہ یہ جماعت اپنے خالی اور یاس زدہ کیمپ میں سے بڑے پیمانہ پر ایک نئی لیڈر شپ پیدا کر سکے۔

یہ معاملہ اتنا زیادہ انتشار کا سبب نہ بنتا اگر ہجرت کا یہ سلسلہ جاری نہ رہا ہوتا۔ ۱۹۴۷ء کا بھران آیا اور ختم ہو گیا۔ اس وقت جن لوگوں نے پاکستان کا انتخاب کیا، انہوں نے گویا ایک فیصلہ کیا، جس کا غلط یا صحیح، احترام کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ان کا معاملہ بالکل مختلف ہے جنہوں نے پہلے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا اور وفاداری کی قسم کھائی لیکن بعد میں بے وفائی کی۔ یہ سلسلہ جاری رہا اور مسلمانوں کی بے چارگی، کس میری در اس تلخ احساس میں اضافہ ہوتا رہا کہ وہ بے رہنما کے وہ گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس مسلسل ”ہجرت“ کا اثر ہوا کہ جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی وفاداری بھی مشکوک ہو گئی۔ ہندوستان میں ایسے ہندو اور مسلمان تھے جنہوں نے عام مسلمانوں کی پشت پناہی کی یا انفرادی طور پر مسلمانوں کی ترقی، وقار اور اعتماد کے مسئلہ کو سہارا دیا اور ایسے ہندوؤں کی فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا جو ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو غیر فلاحی کہتے تھے۔ لیکن ایسے لوگوں کا موقف کمزور ہوتا رہا بعض مسلمانوں کے اعمال اور مثالوں سے جو ثابت کرتی تھیں کہ مسلمان حقیقت میں اپنے ملک کے وفادار نہیں ہیں۔

ایسے نوجوان مسلمانوں کی تعداد خاص ہے جنہوں نے یونیورسٹیوں سے ڈگری لی اور ہندوستان میں ملازمت تلاش کرنے کے بجائے پاکستان چلے گئے۔ کئی مشہور مسلم رہنماؤں نے (اور بعض مشائخ تو ایسی ہیں کہ انہوں نے اس ملک کی وفاداری کا حلف اٹھایا اور ذمہ دار پوزیشن حاصل کی) بعد میں ایسے مواقع کی تلاش کی یا انہیں ایسے مواقع پیش کئے گئے کہ وہ اچانک سرحد پار پاکستان چلے گئے۔ ادبی اور مذہبی دنیا سے تعلق رکھنے والے بعض اہم شخص نے بھی یہ کیا اور غالباً سب سے زیادہ

حضرت رساں واقعہ وہ تھا جب ہندوستانی فوج کے ایک برگیدہ ریحی، ہندوستان میں اپنے  
کافیصلہ کرنے، مذمہ دار عہدہ تک ترقی کرنے اور فوج کے خفیہ معاملات تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۷ء میں اپنی  
درخواست پر ریٹائر ہوئے اور پاکستان چلے گئے اور وہاں حکومت کے ملازم ہو گئے۔

اس بات کا نکتہ نگاہ اس کے بعد کہ اس قسم کے لوگ اپنے رویہ سے ان مسلمانوں کی پوزیشن کتنی خراب بناتے ہیں جو ہندوستان میں رہتے ہیں  
ہو جنہیں ہندوستان میں رہنا ہی بیکار یا رینے کی حرکت کی ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب کسی مسلمان کا بگڑنا یا بگڑنا مشکل ہوا اور حقیقت یہ  
ہے کہ چاہے ہی ہونا بھی مشکل ہے، اردو کے مشہور شاعر خواجہ غلام غفران کی عبارت کا یہ نتیجہ ہو کہ ہندوستان میں ان کے جانے کے بعد اردو کا مستقبل نامیکہ ہوگا  
پاکستانی اس قسم کی مثالوں کی مثال ہے کہ ہندوستان میں شہریت عام مسلمانوں کے حالات خراب ہو رہے ہیں ان کے پیش میں بلکہ مسلمان بھی ملنے نہیں ہیں  
جن پر ہندوستان کی نظر کم ہوا ہو اور انہیں بے وطن بنایا اور اس کی غصیلات پر غور و بحث کریں کہ اس موقع پر ہندوستان کی واضح حقیقت  
کی طرف دیکھ کر کہ ہم یہ مسلمان بنے ہوئے ہیں خواہ وہ کچھ بھی ہو خود اپنی غیر ذمہ داریوں کی بدناموں سے شراب کر لی  
ہے۔ یہاں ہم اس اخلاقی پہلو کی چھان بین بھی نہیں کریں گے کہ کیوں ان لیڈروں نے، اگر واقعی  
ان کے نزدیک مسلمانانِ ہند کی حالت بتر ہے۔ محض ذاتی مفاد اور بچی ترقی کا خیال رکھا اور اس کا  
محافظہ کیا کہ وہ ذمہ دار جگہوں پر رہ کر اپنے ساتھیوں کی خدمت کریں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی جماعت اپنے ملک اور اپنی موجودہ صورت حال کی حقیقتوں سے  
جو اجنبیت محسوس کرتی ہے وہ درحقیقت پیدا ہوئی ہے اس بذاتی اٹھنا دے سے جس کا رشتہ نہ  
صرف پاکستان سے بلکہ موجودہ دور میں کئے گئے پنہاں ہونے سے صحیح طور پر ہے کہ ہندوستانی  
مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کے اسباب، اگر یہ شکلیں اپنی پیدا کی ہوئی نہیں ہیں، (کاسٹریغ  
لگایا جائے) ان عوامل میں جن کا تحقق اس صورت حال سے ہے جس میں کہ وہ ہیں۔ ان میں  
سے ایک معاشی معاملہ ہے، جو بہت چھٹا ہوا اور پیچیدہ ہے اور جس کا پچھتر سالہ ارتقاء اس جماعت  
کے حق میں ناخوش گوار اور ناموفق رہا ہے کیوں کہ اس پورے زمانے میں یہ جماعت اتنے افراد  
اور ایسے گروپ نہیں پیدا کر سکی جو اسے پیچھے اٹھانے کی ترقی کرنا چاہیے تھا اور جو اس قابل  
ہوتے جو نئے مواقع، زرعی ضرورتوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکتے یا ان سے فائدہ اٹھا

کے اہل ہو سکتے۔ یہ ناموافق صورتِ حال، ایک ایسے، حوں میں جس کی پہنائیاں مستقل ترقی اور پھیلتی رہی ہیں مسلمانوں کی یہ جماعتی پسماندگی سبب بنتی ہے نہ صرف افراد اور مختلف گروہوں کی معاشی زبوں حالی کا بلکہ ان کے نفسیاتی اور جذباتی سیمان کا بھی۔ فرید پراں ان کی تہذیبی اور مذہبی سرگرمیوں میں بھی اس کے دور رس نتائج کا دخل رہا ہے۔

ایک مثال لے لیجئے: ہندوستان میں اسلامی تمدن کے تخلیقی مرکزوں میں اکثر کی مالی کفالت خاص طور سے زمینداروں یا نوابوں کی فیاضی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) (جو نیم کلاسیکی ادارہ ہے) سے لے کر حیدر آباد کے اسلامک کالج تک جو مغربی طرز کا ایک سالہ ہے۔ یہ سب ادارے اس طبقہ کی مالی امداد کے سہارے چلتے ہیں جو پچھلے عہد کی ”باقیات“ تھیں۔ اس ملک میں عرصہ سے عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق نئے حالات رونما ہو رہے تھے اور یہ ملک تیزی سے عہدِ جدید کی ”برکتوں“ کی طرف بڑھ رہا تھا اب وجود اس کے کہ برطانوی حکومت نے اس کی ظاہری آب و تاب کو دبا رکھا تھا ۱۹۴۷ء کے بعد سہ عت کے ساتھ یہ آب و تاب ظاہر ہوئی نہ وہ ع ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی آشکارا ہو گئی کہ صنعتی اور تکنیکی دور میں مسلمانوں کے جاگیردارانہ ادارے غیہ محفوظ ہیں۔ زمینداری و ریاستوں کا خاتمہ نئے ہندوستان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اسے تہیہ و ترقی کی طرف بڑا اور اسمِ قدم کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر اس سے ”ہندوستانی اسلام“ کی مشکلیں بڑھ گئیں ہیں تو یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ جماعت کتنی پسماندہ رہی ہے جو پترِ مسلمانوں کو جانبدارانہ اور متعصبانہ امتیاز کی شکل میں نظر آتی ہے وہی ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے ان کی کمزوری اورستی ظاہر کرتی ہے۔

حیدر آباد کا المیہ (۱۹۴۷ء) اور اس کے خلاف مسلمانوں کا جذباتی احتجاج، اس کی وضع مثال ہے۔ یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی اس کوشش کا ایک در ثبوت ہے کہ وہ جمہوری ہندوستان میں اپنی نئی پوزیشن تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ایک شاندار ماحول میں جس میں جہادِ جہت سے متعلق ان کے جذبات خود داری کی پوزیشن پر گزرتے ہوئے زمانہ میں بادرکار پورہ قرار رکھنے کے



لئے ان کی پرجوش لیکن بے سود کوشش۔ غرض ان کی تمام جذباتی ہیجان انگیزی اس بے نتیجہ ہنگامہ میں خوفناک طور پر ظاہر ہو گئی۔ نظام اور اس کی حکومت، بہت سے مسلمانوں کو، اسلامی تاریخ کی زمینی عظمت کی یاد دلاتی تھی اور جب اس حکومت کے زوال اور خاتمہ کے امکانات قوی ہو گئے تو انھیں اس افسوس ناک صورت حال کا احساس ہوا کہ اس ”زمینی عظمت“ کا زوال کہاں تک پہنچ چکا ہے۔

یہ سارا معاملہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اس سیاسی حماقت کی المتک اور واضح شرح ہے جس کے وہ عالم یا اس وائسردگی میں مرتکب ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ ذہنی اور اخلاقی طور پر اس بات کا اندازہ کرنے اور تسلیم کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ گرج اور آئے دے زمانہ میں اسلام کی مرنے اور غیر مرنے کی عظمت کو نئی شکل اور مختلف انداز میں ظاہر ہونا ہے۔ ان مسلمانوں کے لئے جو بچھے کی طرف دیکھنے کے عادی ہیں یہ معلوم کر کے بڑی تکلیف ہوئی ہے کہ خدا در انجمن اقوام متحدہ کسی کو بھی اس سے دل چسپی نہیں ہے کہ اسلامی کارناموں کی وہی قدیم شکل و صورت باقی رہے۔ ہندوستان میں اسلام کے عظیم اور پر شکوہ مستقبل کی تعمیر ان کے ہاتھوں نہیں ہوگی جو جاگیر داری نظام کے نمایندوں کی پرانی اور کھوکھلی جاگیروں کے خاتمہ پر ماتم کرتے ہیں، بلکہ یہ بڑا کام وہ لوگ انجام دیں گے جو اسلام کی آفاقی اور ابدی سچائیوں کی تلاش میں کوشاں ہیں اور اس بات کی جدوجہد کرتے ہیں کہ ان کا پورا اثر موجودہ حالات پر پڑے۔

حیدرآباد کے مسلمانوں کو حالات کی غلط تاویلات کی جو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اُسے بھی نہ بھولنا چاہئے۔ جب ہم مسلمانان ہند کی موجودہ پریشانیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کا اندازہ بھی کرنا چاہیں کہ کہاں تک یہ دشواریاں خود ان کی اپنی پیدار کی ہوئی ہیں، تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ان کا ہر غلط قدم کتنے تباہ کن نتائج کا سبب بنا ہے۔

امید کی کرن ان بڑھتے ہوئے حالات میں جتنا کہ انھیں سامنا ہے ہندوستان کے مسلمانوں میں دو رجحانات نمایاں رہے ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں یعنی احساس نامطابقت

وعدم تحفظ کا خطرناک چکر اور دوسرا ہے حقیقت پرستی کی تکلیف دہ اور سُست رفتار کامیابی یعنی یہ رجحان کہ تلخ حقائق کو سمجھنا چاہیے، اس سے سمجھوتہ کرنا چاہیے اور سمجھ بوجھ کر، آزادی اور ذمہ داری کے ساتھ نئے ہندوستان کی سرگرمیوں میں شرکت کرنی چاہیے، پہلے رجحان میں افسردگی اور فرار کی تلاش تھی، دوسرے میں سلام اور سلامیاب ہند کی نئی زندگی کی جس کے ٹائٹلے میں جس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ایک نئی آزادی اور حالات سے مطابقت کا ایک تخلیقی حوصلہ، اہم تعمیر ترقی اور نتیجہ خیز نشوونما کا ایک امید افزا سلسلہ جو ہندوستان کی سرحدوں کو بھی پار کر جائے۔

یہاں ایک بار پھر ہم اسلام کے بنیادی ”بحران“ سے دوچار ہوتے ہیں، اس بحران کا تعلق ہے اُس اہم اور بڑھتے ہوئے تضاد سے جو مسلمانوں کے موجودہ حالات اور اُن پرانے اُرن موافق جذبات و نظریات میں ہے جن کے سہارے وہ نئی صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تضاد ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ یہ حقیقت بیک وقت ان کی بے چینیوں اور ان بے چینیوں کے مداوا کے امکانات کا پیمانہ ہے۔

حالات کا خطرناک چکر برابر چل رہا ہے۔ خارجی حالات کو دیکھتے ہوئے جن کا تعلق ہندوؤں، پاکستان اور گزری ہوئی تاریخ سے ہے، یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ ہی محسوس کر سکتے ہیں اور یہ احساس عدم تحفظ ہی حقیقی صورت حال سے سمجھوتہ کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور ان کے ذہنی و جذباتی فرار اور موقع ملنے پر جسمانی فرار — یعنی پاکستان کا رخ کرنا — کا سب سے بڑا سبب ہے۔

مثلاً، ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہندوستان میں مسلم اقلیت کی کمزوری کا بنیادی سبب اس کا پاکستان سے (ذہنی و جذباتی) تعلق ہے۔ اور یہی وہ کمزوری ہے جس کی وجہ سے یہ مسلم قیامت اس تعلق کو ختم کر دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ رشتہ منقطع ہو چکا ہے، اس حقیقت کو باتو یہ جان بوجھ کر تسلیم نہیں کرتی یا اسے مان لینے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی۔ جتنی زیادہ غیر محفوظ رہی ہے تہا ہی اس نے یہ تعلق برقرار رکھنے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ پایا ہے۔ (جب کہ یہ خارجی تعلق ہندوستان

میں اس کی پوزیشن کو نازک تر بنادیتا ہے۔)۔ اسی طرح اگر ایک طرف خلیق الزماں، جوٹہ اور برگڈیرائیس کا پاکستان بھاگ جانے سے مسلمانان ہند کی دشواریاں بڑھ جاتی ہیں تو دوسری طرف یہی بات کسی دوسرے آدمی کے پاکستان چلے جانے کا معقول سبب قرار دی جاسکتی ہے۔ (اور قرار دی گئی ہے۔) حیدرآباد کے رعنا کاروں کا ہنگامہ جن تباہ کاریوں کا سبب بنا ان کا نتیجہ ہو سکتا تھا کہ بہت سے حیدرآبادی مسلمان جنہیں ان کا سامنا کرنا پڑا، اور بھی زیادہ مایوس ہو کر شکار ہو گئے، معقول اور مناسب رویے کے لئے پہلے سے بھی کم تیار ہو سکے اور تعمیری اشتراک تعاون کی ذمہ داری لینے کے لئے پہلے سے اور بھی کم اپنے آپ کو اہل ثابت کر سکے۔ وہاں کے پڑھ لکھے طبقہ نے اپنے نظریوں و رجحانات پر نظر ثانی کرنے کے لئے جس سہ زندگی کے نئے مسائل حل کرنے میں ان کو مدد ملتی، کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

ایسے حالات میں انش مندی کی منطق ناکارہ ثابت ہوتی ہے۔ یہاں جذبات پورے طور پر غائب رہے ہیں اور نظریات کی جڑیں دور تک گہرائی میں پہنچی ہوئی ہیں۔ ہندوؤں باتوں کے حقیقت یہ ہے کہ صورت حال سنبھلی ہے۔ مذکورہ بالا دور جانات میں سے ایک جو مایوسی و افسردگی کی طرف بے جاتا تھا، صرف تین چار سال تک غالب رہا۔ ۱۹۵۰ء کے بتدریج مسلمان اہل کے ٹپکل سے آزاد ہوتے رہے اور جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، یہ تبدیلی ہمارے نزدیک بڑی کامیابیوں کے امکانات کا پیش خیمہ ہے۔ کیوں کہ واقعات نے خود بخود اور بے رحمی کے ساتھ سبق سکھایا ہے۔ غلط تصورات اور ان احتمالات و دیات کی بے منطقیت ہی نہیں بلکہ عملاً ان کے متواتر اور مجموعی طور پر تباہ کن نتائج نے حالات کا از سر نو جائزہ لینے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔ مزید برآں ہندوستان میں جو کچھ ہوا ہے اور عام ترقی اور فلاح کی طرف جو قدم اٹھایا گیا ہے اس کی تعمیری خوبیوں کا بھی اس تبدیلی میں بڑا ہاتھ ہے۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ مسلمانان ہند کی، دی اور روحانی فلاح و بہبود کا راز اس میں ہے کہ وہ اپنے دل کے قابل احترام مستثنیات بھی ہیں۔ یک مثال اکر سید عبداللطیف کی ہے جو اکیڈمی آف اسلامک اسٹڈیز کے تنظیم کار اور صدر ہیں۔



خدا کے بھروسہ پر اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہوں، ہندوستان میں اپنی نئی صورتِ حال کو تسلیم کریں اور اس میں خود اپنی قسمت بتانے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو پہچانیں اور قبول کریں، دوسروں پر بھروسہ اور اپنے آپ پر اعتماد کرنے کی صلاحیت پیدا کریں اور آزادی، ایمان داری اور تخلیقی قوتوں کے ساتھ نئی قوم کی زندگی کی سرگرمیوں میں شریک ہوں۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ گزشتہ پینچ برس کی مدت میں، تمام دشواریوں اور پریشانیوں کے باوجود، ہندوستانی مسلمان اس طرف آگے بڑھے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا ہاتھ سیکولرزم کی کامیابی کا ہے۔ سیکولرزم اگرچہ پوری طور پر کامیاب نہیں ہے لیکن بنیادی طور پر اس کا اثر پڑا ہے اور جتنا کچھ ہے ٹھوس ہے۔ مسلمانوں نے دیکھا ہے کہ ہندوستان میں لاقانونیت نہیں ہے، انہوں نے دیکھا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں پولیس نے انصاف برتنے کی کوشش کی ہے اور اس کا بھی تجربہ کیا ہے کہ سیکولر اسٹیٹ نے نشہ کمارانی سے مخمور ہندوؤں کو مسجدوں کو مندر میں منتقل کرنے کی کوشش سے روکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہندوستان میں رہ سکتے ہیں اور اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں آزاد ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کے اکثر مسلمان تسلیم کرنے کے لئے آمادہ معلوم ہوتے تھے کہ ان کی حالت توقع سے زیادہ بہتر ہے۔

(پس ہندوستان میں مسلمان ہیں اور کافی ہیں۔۔۔ حقیقتاً) لیکن زندہ بچ جانے اور رہ جانے کے علاوہ بھی اور کچھ ہے، بعض لوگوں نے تو رہ جانے ہی کو غنیمت سمجھا ہے اور غیر شعوری طور پر اسی حالت پر مطمئن ہیں، اس معاملہ میں زیادہ غور و فکر نہیں کیا گیا ہے کہ ان کا ہندوستان میں رہنا اور ان کی فلاح و بہبود یہ سب منحصر ہے اسٹیٹ کے سیکولر ہونے پر اور اس طرح اس صورتِ حال کی دینی حیثیت کیا ہے (اور سیکولرزم اور اسلام کے اصولوں میں کہاں تک مطابقت ہے۔ حقیقتاً) اس مسئلہ پر بھی بھی نہیں سوچا گیا ہے۔ لیکن حقیقت واضح ہے، خواہ روایاتی مذہب اس کے بارے میں کچھ ہی کیوں نہ کہے، کہ سیکولرزم اپنا کام کر رہا ہے اور مسلمانوں کے حق میں یہ نعمت ثابت ملے ملاحظہ ہو فیض آباد (ریو۔ پی) کے قریب جو دھبیا کی بڑی مسجد کا واقعہ۔

ہوئی ہے۔ گئے چنے چند لوگ ہیں جو ابھی تک اسلامی اسٹیٹ کے نظریہ سے چکے ہوئے ہیں۔ اس نظریہ کی خوبیاں اور اس کے معنی اصولی طور پر چاہے جو کچھ ہوں، مسلمانان ہند کی اکثریت اس بات پر متفق ہو گئی ہے کہ موجودہ حالات میں یہ غیر ضروری، بے محل و مضر نتائج ہے۔ حیدرآباد کے واقعہ نے اس احساس کو اور شدید کر دیا ہے۔ ایک مسلمان نے مجھ سے کہا کہ ”جب مجھے معلوم ہوا کہ حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا ہے، تو میں مسلمانوں کی حالت پر رویا، لیکن آخر میں، اُن کے تمام آلام و مصائب کے باوجود، میرا خیال یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حق میں یہ بہت مفید ثابت ہوا یعنی یہ کہ حقانہ جذباتیت کا چراغ آخری بار بج کر کر بج گیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انھیں زندگی کی حقیقتوں کا جیسی کچھ بھی وہ ہیں، مقابلہ کرنا چاہیے۔“

حقیقت پسندی کے اس رجحان کو اور تقویت ملی جب معلوم ہوا کہ پاکستان جنت نہیں ہے جس طرح بتدریج یہ بات معلوم ہوئی کہ ہندوستان کے حالات بہت خراب نہیں ہیں اسی طرح یہ چیز بھی آشکارا ہوتی رہی کہ پاکستان میں عورت حال بہت اچھی نہیں ہے، اور کچھ لوگ کم از کم انتہا یمن دار ہیں کہ یہ باتیں کہ نظری در عملی اعتبار سے ہندوستان میں ایک اقلیت کی حیثیت سے اُن کی پوزیشن ٹروس کی اسلامی جمہوریہ کی ہندو اقلیت سے بہتر ہے۔

جہاں تک مسئلہ کے مثبت پہلو کا تعلق ہے، محفوظ انتخابات نے کم از کم کچھ مسلمانوں پر ”قومی“ سیاست کا مطلب واضح کر دیا ہے اور فرقہ وارانہ موقف سے ہٹا کر اُن کی توجہ انسانی پہلوؤں کی طرف پھردی ہے۔ یو۔ پی کے میونسپل انتخابات میں کانگرس امیدواروں کے مقابلہ میں اُن حقوق میں جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے، آزاد مسلم امیدواروں کی کامیابی سے بھی مسلمانوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اسی طرح یہ تجربہ بھی ان کے نزدیک بڑی بہت رکھتا ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۹ء کے عام انتخابات میں اپنے ووٹوں سے ہندو فرقہ پرستی کو بھاری

شکست دی ہے۔

(باقی)

۱۔ جماعت اسلامی پاکستان کے سربراہ مولانا محمد امجد علی صاحب کی اسی نام کی چار جلدی کتاب ہے۔  
۲۔ مہاراشٹر ریورس یو۔ پی میں ۱۹۵۷ء کے انتخابات میں کانگرس امیدواروں کے مقابلہ میں

# ”عقاید جامی اُس کی شرح و تراجم“

جناب محمد سخاوت مرزا مقابلی۔ اے ال ال بی عثمانیہ

قدوة المحققین مولانا نور الدین عبدالرحمن جامی قدس سرہ (المتوفی ۸۹۸ھ)۔ نویں صدی ہجری کے نہ صرف ایک زبردست شاعر و ادیب بلکہ محقق صوفی گزیر ہیں جو محتاج تعارف نہیں حضرت موصوف کی تصانیف کے متعلق اختلاف آرا ہے پاپوار انسائیکلو پیڈیا میں آپ کی تصنیفات کی تعداد سناؤں درج کی گئی ہے، آر تھناٹ کہتا ہے کہ ان کی تعداد ۴۰ تا ۵۰ ہے۔ تذکرہ علی قلی خاں داغستانی میں لفظ جامی کے اعداد کے برابر ۵ بیان کی گئی ہے۔ مگر عام تذکروں میں تصنیفات کی تعداد لفظ ”جام“ کے لحاظ سے ۴۴ ہے جس کی تفصیل مولانا اسلم جیراج پوری نے اپنی تالیف حیات جامی میں دی ہے۔ مگر عقاید جامی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جو عقاید نامہ یا اعتقاد نامہ یا عقاید جامی کے نام سے مشہور ہے۔ اور یورپی مستشرقین نے اس کو جامی سے منسوب کیا ہے اور یہ شبہ ظاہر کیا ہے۔ کہ یہ کتاب حضرت جامی کی تصنیفات میں پائی نہیں جاتی۔

انڈیا آفس میں عقاید جامی کے تین نسخے ۱۳۸۱ء۔ پر درج ہیں۔ (فہرست کتاب خانہ انڈیا آفس مرتبہ برمن ایسٹ جلد ۱) فاضل و رب ہرمن اتھے نے عقاید جامی کو ایک مستقل تصنیف قرار دیا ہے اور یہ لکھا ہے :-

”عقاید جامی ایک مختصر مثنوی صوفیانہ مصنف مولانا جامی ہے جس کا“

”دوسرا نام اعتقاد نامہ بھی ہے۔ اس کا ابتدائی شعر یہ ہے ”بعد حمد خدا و نعت رسول الخ“

مشرقیو (R. ۱۹۰۰) برٹش میوزیم کے نسخوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ :-

”یہ جامی کی عام منظومات میں پائی نہیں جاتی“ (ترجمہ)

لے حیات جامی مطبوعہ ۱۹۰۰ فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس مطبوعہ آصفیہ۔ ۱۹۰۰ فہرست مخطوطات فارسی مرتبہ لے



"It is not found in the Usual"

"Collections of Jamia Press Works"

برٹش میوزیم میں اس کے چار نسخے ہیں :—

(۱) پہلا نسخہ مکتوبہ ۸ رذی الحجہ ۱۱۲۳ھ

(۲) دوسرا نسخہ ۱۶۲۱ء دو صفحات تقطیع ۳-۴ × ۱-۲ خط شکستہ کتابت

ندارد ناقص۔

(۳) تیسرا نسخہ ۱۳۸۲ھ مکتوبہ ۵ شوال ۱۲۰۹ھ ۲۵ اپریل ۱۷۹۵ء

(۴) چوتھا نسخہ ۱۳۲۵ھ از صفحات ۲۵ تا ۵۵ تقطیع ۳-۴ × ۱-۲ کتابت نندارد

قیمہ فہرست برٹش میوزیم میں ایک پانچواں نسخہ بھی ہے جو ۱۶۸۹ء کے مجموعہ میں محفوظ ہے۔

اور یہ لکھا ہے۔ عقاید نامہ (عقاید اسلامیہ منظوم) اور ڈاکٹر اسپرنگر کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے

کہ یہ غالباً مولانا جامی کی ہے۔ دیکھو بلیو تھیکا اسپرنگر (۳-۵۹۱)۔

نسخہ جات عقاید جامی مخزنہ کتب خانہ آصفیہ :— (۱) ۵۰۱ھ فن کلام فارسی میں درود سرا

نسخہ ۸۳۵ھ شمولہ ۱۷۷۸ء رسالہ تکمیل الایمان مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے ساتھ شیرازہ بند ہے جس کا

سکنا بت ۱۱۴۱ھ ہے اور یہ نسخہ برٹش میوزیم کے نسخہ سے قدیم ہے۔

نسخہ اویستا عقاید نامہ فارسی :— عقاید نامہ مولانا عبد الرحمن جامی مکتوبہ غزہ رجب ۱۲۷۷ھ ناقص الاول۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد ۱۷۸۷ھ۔

کتاب زیر بحث طبع بھی ہو چکی ہے۔ جس کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۲۸۷ھ مطبوعہ مطبع حیدری مدنی

احقر کے پاس ہے دوسرا نسخہ مطبع انوری ۱۳۱۷ھ (دراس ۱) (۱۳۱۷ھ کتب خانہ سعید حیدر آباد

دکن میں محفوظ ہے) اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ حضرت جامی کی کوئی علیحدہ مستقل تصنیف ہے یا

درحقیقت یہ کوئی علیحدہ تصنیف نہیں بلکہ مولانا جامی کی مستقل تصنیف سلسلۃ الذہب کا ایک

حصہ ہے۔ جس کو ہمارے علماء اور صوفیاء کرام نے کارآمد اور مفید سمجھ کر کتابی شکل میں علیحدہ کر لیا اور

یہ علوم دریا سلامیہ میں شامل تھی، اس لحاظ سے چارلس ریو، ہرمن ایچھے، اور ڈاکٹر اسپرنگر کی صاف اور واضح طور پر تردید ہو جاتی ہے کہ عقاید جامی ”غالباً جامی کی تصنیف ہے یا جامی سے منسوب ہے“ اس غلط فہمی کا ایک سبب تو سلسلۃ الذہب کا شاید عدم مطالعہ ہے یا سہو نظری دوسرے یہ کہ عقاید جامی کے علاوہ نسخوں میں وہ تمہید نہیں ملتی جو سلسلۃ الذہب میں موجود ہے جس کو ہم احتیاطاً درج ذیل کرتے ہیں:

عنوان ”رجوع بانچہ پیش ازین“ اشارتے ہاں رفتہ بود“

پیش ازین ذکر قاصد و نامہ	ز د بلوچ بیان رقم خامہ
نامہ بود بس عظیم الشان	قرۃ العین خواجہ مرسل آن
حاصل نامہ آنکہ می باید	چند بیتے رواں بنظم آید
در بیان عقاید اسلام	کافی اندر بیان آن و تمام
آن عقاید کہ ضبطش آسان است	و ندران خاص و عام یکسانست
ہر کہ ہست اہل سنت و دیدار	باشد اور از حفظ آن تا چار
اینک آزا ہی کنم املا	مستعینا بر بنا الاعلیٰ
عقاید جامی کی ابتداء حمد سے ہوتی ہے	
بعد حمد خدا و لغت رسول	بشنو این نکتہ را بسمع قبول الخ
اور خاتمہ سے	

نہبت آن بود بروں ز شمار برتر از جملہ دیدار  
 کہ بہ بیند خدائے را بہ بصر چوں شب چار وہ مہ الزور  
 عقاید نامہ یا اعتقاد نامہ کے اختتام کے بعد حضرت جامیؒ نے سالک کو عشق حقیقی کی طرف ہدائی فرمائی ہے چنانچہ سلسلۃ الذہب میں فرماتے ہیں:۔  
 گفتار در ختم و قرار از کتاب سلسلۃ الذہب رفتن بسوئے انچہ تقریب ہاں رسیدہ بود و ز املائے  
 سخن عشق بد فتر دیگر الخ

چوں شد این اعتقاد نامہ درست • باز کردم بکار و بار تختست  
کار من عشق و بار من عشق است حاصل روزگار من عشق است

جس سے یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ عقاید جامی مولانا جامی کی تصنیف سلسلۃ الذہب کا ایک جزو ہے۔ اور اس میں تقریباً وہی مسائل ہیں جو عام طور پر عقاید کی مشہور کتابوں مثلاً عقایدنی، عقاید نقی، فقہ اکبر، امام اعظم کوئی، تمکیل الایمان شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ میں ہیں۔ دل لائق ذکر تین کتابوں کی مکمل شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ مگر ان میں محض متکلمین کا نقطہ نظر ملحوظ ہے۔ اس لئے عقاید صوفیہ میں جو کتابیں مدون ہوئی ہیں وہ نہ صرف عقیدہ اسلام بلکہ حقایق و دقائق اور معارف پر مشتمل ہیں۔ جنوبی ہند کے عقاید ناموں | (۱) استقامۃ الشریعت بطریق الحقیقت، سید محمد حسینی گیسو دراز پر ایک سرسری نظر تصنیف ۱۹۲ء ھ

(۲) عقاید بندہ نواز (سید محمد حسینی گیسو دراز اشرفی ۸۲۵ ھ)۔

(۳) شرح فقہ اکبر فارسی (سید محمد حسینی گیسو دراز اشرفی ۸۲۵ ھ)۔

(۴) فتوح العقاید، شیخ فتح محمد بانی پوری المتوفی ( )

(۵) عقاید حسینی، علامہ محمد حسین شہید، الملقب بامام المدرسین، مدرسہ محمود گاداں،

بیدر المتوفی ۱۱۰۸ ھ۔

(۶) عقاید صوفیہ مؤلفہ شیخ عبدالحق مخدوم سادی بجا پوری المتوفی ۱۱۶۵ ھ۔

(۷) میزان العقاید، مولانا ابوالحسن قربی دیپوری، المتوفی ۱۱۸۳ ھ۔

(۸) عقاید نامہ از علامہ محمد باقر آگاہ المتوفی ۱۲۲۰ ھ۔ (مدرسہ) (عقاید جامی پر مبنی ہے)

(۹) شرح عقاید جامی لموسوم بہ خلاصۃ البیان مؤلفہ علامہ محمد غوث المحاطب بہ شرف الملک

مدرسہ مولوی عبدالباقی طیب بہ دارالامارات تصنیف ۱۲۶۹ ھ (مطبوعہ ۱۲۷۱ ھ۔ مدرسہ)

(۱۰) عقاید الاسلام (اردو)۔ مؤلفہ عبدعجیل، منظوم۔ (اس کا ماخذ عقاید جامی ہے۔)

(۱۱) عقاید مصنف مولانا ابراہیم بن محمد، مکتوبہ سید شاہ محمد قادری حسینی الحسینی ۱۲۵۶ ھ



بمقام چنیا بین مدراس۔ بعد میں بہت عظیم جاہ۔ زمانہ طفولیت نواب غلام غوث خاں اعظم جوہا  
نواب اعظم کے لئے تالیف کی گئی تھی۔

(۱۲) عقاید الاسلام مؤلف مولانا ابوالمحمد عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی، (بعہد نواب میر محبوب علی خاں صف جاہ ششم)

(۱۳) شرح عقاید جامی (فارسی) منسوب بہ شیخ عبدالحق مخدوم سادی (متوفی ۱۶۵ھ)  
 و مؤلفہ شیخ جمال محمد۔ (مدراسی ؟) شیخ صاحب مخدوم سادی کے غائبانہ مریدین میں سے تھے۔  
 مخدوم صاحب کا ایک طویل مکتوب بنام جمال محمد، ایک سادگی شکل میں محفوظ ہے۔۔۔ بہر حال  
 شرح مذکور شریعت و طریقت و حقیقت اور علم کلام میں نہایت مدلل و جامع اور غنیجہ ہے۔

(۱۴) ایک کتاب شیعہ عقیدہ میں موسوم بہ ”صراطِ مستقیم فی دینِ توہم“ سلطانِ برہم  
قطبشہر (۱۹۵۷ء تا ۱۹۵۸ء) سے منسوب کی گئی ہے۔ متبنینِ فہرستِ کتب خانہ سلاہر  
بہادر حیدر آباد نے تصنیف و چھپی گوگلنڈری۔ لکھا ہے۔ گربھاری رائے میں مشتبہ ہے۔ اس میں فرقہ  
ناجیہ، اور امامت، پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

عقائد نامہ جاتی گو مختصر ہے مگر عقاید اسلام کے معرکہ لارامیل پر مبنی ہے۔ اور مذہبی طور پر بہت سے اس میں ایسے اہم مسائل مضمر ہیں جو علم کلام اور عقیدہ صوفیہ میں مشترک ہیں۔ جس کی ترجمانی اور شرح کوئی محقق صوفی ہی کر سکتا ہے جو علوم ظاہری و باطنی کا جامع ہو۔

عقاید جامی کے اردو ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ جن کا مختصر طور پر ذکر نامناسب نہ ہوگا :-

(۱) ترجمہ رد و عقاید جامی از احمد علی میسوری، (دیکھو تذکرہ یادگار حنیفہ، لیف سہ ماہیہ مطبوعہ)

(۲) ترجمہ اردو عقاید جہمی، (کرتب خانہ) نجمن ترقی اردو علی گڑھ، نام مترجم: کاتب و نواز۔

(۳) حمایت الاسلام ترجمہ عقاید جامی، اہم ہے۔ مترجمہ مضطرب دین معنی سید ریاض دہلوی۔

یا ایما عنواب فضیلت جناب مولوی حاتم التوار شد خاں بہادر مدحوم۔ میرائے تعظیم عنواب مجیدیا۔

حمایت علی خاں بہادر دلی عہد آصف جاہ سابع مطبوعہ ۱۳۳۲ھ۔ جو بہت مقبول ہوا اور اس کے تین ڈیشن چھپے اور تاح ہوئے اور محکمہ امور مذہبی حیدرآباد نے نہ صرف طلباء بلکہ اہل خدمات شریعہ کے لئے کئی سو صدیوں خریدیں۔ بڑا اچھا ترجمہ ہے بیش قیمت۔ حاشیہ بھی مدلل بحوالہ احادیث و آیات قرآنی لکھا ہے۔

ابتداء سے

محمد حق نعت نبی کے بعد مومن جان لے اس نصیحت کو مری دل سے یقیناً مان لے

وجہ تالیف سے

یہ دیکار مہمذت تعلیم کے آغا ز پر اس رسالہ کا ہوا ہے ترجمہ بھی پُر اثر  
نام نہاد سے ہے۔ بے موسوم جو نیک نام ہے حمایت نامہ ایماں مقرر اس کا نام  
ترجمہ منظوم جو ہیں نے یہ اردو میں کیا فیض ہے بس حضرت جامی کی روح پاک کا

سہ تالیف سے

کی جو فکر سالیں نے اے معنی نیک ہے کہہ دیا دل نے تمامی ترجمہ مقبول ہے

۱۳۳۲ھ

خاتمہ سے

نعت دیدار خالق نعمت عظمیٰ ہے بس ختم ہے اس پر سخن اللہ لیں باقی ہو بس  
عقاید جامی کی ناسی ٹھہری (۱) شرح عقاید جامی لموسوم یہ خلاصۃ البیان، مشرح علامہ محمد غوث اعظمی  
بہ شہرت المسک بہادر (مدرسہ) جس کا تھمذ نواب مدار نامہ اعراس رکاٹ نے کیا۔ "جدد بخش  
گوہر ایمن" تاریخی مادہ ہے جو ۱۳۳۲ھ میں مطبع شرقیہ میں طبع اور شائع ہوئی۔

۱۳۳۹ھ شرح عقاید جامی از مولانا نور الدین سیال کوٹی، جو میری نظر سے نہیں گزری۔

(۳) شرح عقاید جامی منسوب بہ شیخ عبدالحق سادی بیچ پوری المتوفی ۱۱۶۵ھ المعروف بہ  
دستگیر صاحب سادی مدفن مدرسہ اس جو ایک بڑے محقق صوفی تھے، جن کے مکتبہ الآرامیہ ختمہ مسابغ تصوف

میں، بمقام دہلی، فتح خاں المعروف بہ فقی خاں مہتمم حضرت شاہ رسولؒ نما سے نیز ایک عالم مولوی عزت اللہ سے بنگال میں ہوا تھا۔ مگر بہار خیال ہے کہ غالباً یہ شرح آپ کے ایک مرید شیخ جمال محمد کی لکھی ہوئی ہے جنہوں نے اسی میں اپنی تالیفات میزان التوحید اور بزم توحید کے حوالے دئے ہیں۔

میزان التوحید مطبع برہانی حیدرآباد میں چھپ چکی ہے اور یہ بھی مخدوم سادگی سے منسوب ہے؛ تحقیق اور مدلل مختصر جامع رسالہ ہے۔ جس کی حضرت خواجہ علیہ الرحمۃ نے اپنے خاص مرید شیخ نور الدین کو گاہر میں لفظ بہ لفظ پڑھایا تھا۔ (محبت نامہ)۔ اور شریعت پر استقامت کے لئے خاص زور دیا ہے۔ اور اپنے مقولات میں فرمایا ہے کہ لوگ حقیقت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ میرا قول یہ ہے "الشریعت افضل من الحقیقت" اور یہ استدلال کیا ہے کہ میں نے جو گیون ورسنیا سیدوں سے بھی حقیقت کے باریک نکات سنے ہیں، مگر اس کو شریعت کا پاس ملی ظاہر ہے، گویا عظم نعم ہیں، یہی اُن سچے صوفیاء کا تصور کرنا چاہیے جو شریعت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جس سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ویدانت اور عقیدہ فداطون اور اسلامی وحدۃ الوجود میں مناسبت کا فرق ہے۔

میزان التوحید میں اسی مصنف نے اپنا نام قصداً ظاہر نہیں کیا ہے اور وہ یہ بیان کی ہے کہ "ایں فقیر اہل نام خود دریں سالہ نمودہ بنا برانست کہ اکثر مردم از کسے سخن شنوند نظر بیرہ می گوید نداشت برکہ می گویدی بندہ الخ"۔

بہر حال اس شرح کی تدوین کا زمانہ وسط بارہویں صدی یا ربع سوم یا چھویں صدی ہجری ہے اور یہ کتاب علاقہ مدراس کے محققین صوفیاء کی اہم تالیفات سے ہے۔

مولانا سید منظر احسن گیلانیؒ نے سوانح مولانا حکیم سید برکات احمدؒ لوکی کے ضمن میں شہ کیا ہے کہ حکیم صاحب مغفور، ایسی کتابیں فراہم کر کے ٹونک لے گئے تھے

شرح عقیدہ جامی زیر بحث کے نسخے :-

(۱) شرح عقیدہ جامی، مکتوبہ شریفہ۔ کاتب سید عبد الستارؒ زین الدین دارالشیعہ حیدرآباد  
میدرخی ابتدائی چہ ورق نادر و مخطوطہ کتب خانہ مصفیہ



(۲) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۲۹۵ھ کاتب سید وزیر علی حیدر آباد دکن (کتب خانہ آصفیہ)  
(۳) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۲۹۵ھ، جامع عثمانیہ حیدر آباد دکن۔

(۴) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۲۹۵ھ نام کاتب ندارد، عہد آصفیہ چاہ ششم (کتب خانہ حنفیہ)  
(۵) شرح عقاید جامی الموسوم بہ منج العقاید، مکتوبہ ۱۳۱۶ھ۔ حسب ذیل عبارت۔  
نقل من مسودۃ الاصل ۱۳۱۶ھ۔ بقلم سید خلیل۔

غالباً یہ وہی سید خلیل ہیں جو نواب خورشید جاہ کے استاد تھے۔ (مخطوطہ کتب خانہ مکرمی)  
شیخ علاء الدین جنبی حیدر آباد دکن (منج العقاید وہی شرح زیر بحث رہی ہے۔  
(۵) شرح عقاید جامی مکتوبہ ۱۳۳۶ھ۔ مکتوبہ قدوة العارفین شاہ کمال اللہ عرف پھلی واسی  
شاہ حیدر آبادی جس کی اصل عبارت تین درج ذیل ہے :-

”مورفہ ۲۲ راہ شعبان المعظم ۱۳۳۶ھ ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بقلم فقیر حقیر کمال اللہ  
شاہ چشتی نقادری نقشبندی۔ برائے محب الفقراء العلماء جامع صدیق شاہ احمد حسین چشتی نقادری  
النقشبندی بمقام کاجی گورہ تحریر نمود و دادہ شد۔ اللہ تعالیٰ از مطالعہ اس شرح عقاید جامی رحمۃ اللہ  
علیہ شاہ احمد حسین چشتی نقادری نقشبندی را بہرہ اندوز سازد و بمقام قربیت خود رساند آمین  
یہ رہا عالمین۔“

(۶) شرح عقاید جامی، مکتوبہ ۱۳۵۸ھ کتب خانہ مولوی عبد المجید مرحوم انجمن ایش بلدہ  
حیدر آباد جواب مورخہ نوری شاہ صاحب کے پاس ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

(۷) شرح عقاید جامی سنہ کتابت درج نہیں۔ بظاہر مکتوبہ وسط چودھویں صدی (کتب  
خانہ آصفیہ ۱۲۹۵ھ)

(۸) شرح عقاید جامی سنہ کتابت درج نہیں تا قصا لاول بخط نستعلیق معمولی (کتب  
خانہ آصفیہ ۱۲۹۵ھ)

شمالی بہار اور یوپی کے کتب خانوں کی بہتوں میں اس کا کوئی نسخہ نظر سے نہیں گزرا۔

## ابواب عقاید جامی :-

- (۱) حمد - (۱۷) شریعت محمدی ناسخ ادیان ہے -
- (۲) ایمانِ مجمل - (۱۸) معراج آنحضرت صلعم -
- (۳) حق تعالیٰ کے واجب الوجود ہونے کا بیان (۱۹) معجزات و کرامات انبیاء و اولیاء -
- (۴) حق تعالیٰ کی یکتائی کا بیان (۲۰) آسمانی کتب پر ایمان لانے کا
- (۵) حق تعالیٰ کے سار جلالی جمالی کمال کا بیان (۲۱) کلام الہی قدیم ہے
- (۶) حیاتِ باری کی صفت - (۲۲) امت محمدی، فضل ہے
- (۷) علم حق تعالیٰ کی صفت - (۲۳) اہل قید کو کافر نہ کہو
- (۸) ارادت و مشیت حق تعالیٰ کی صفت - (۲۴) سوالِ منکر و نکیر و عذابِ قبر
- (۹) قدرت حق تعالیٰ کی صفت - (۲۵) نفعِ صور و حشر و نشر
- (۱۰) سمع و بصر حق تعالیٰ کی صفت - (۲۶) اعمال ناموں کا بیان
- (۱۱) حق تعالیٰ کے کلام کا بیان - (۲۷) میزان
- (۱۲) خلق و تکوین و فرقِ رضا - (۲۸) پلِ صراط
- (۱۳) فرشتوں پر ایمان لانے کا بیان - (۲۹) قیامت کے پانچ مواقع
- (۱۴) انبیاء علیہ السلام پر ایمان لانے کا بیان - (۳۰) کافرا اور دوزخ
- (۱۵) فضیلتِ رسولِ کریم صلعم - (۳۱) حوضِ کدر
- (۱۶) بیانِ خاتم النبیین و ختم نبوت - (۳۲) درجاتِ بہشت و دیدار حق تعالیٰ
- ابتداء :- بعد حمدِ خدا و نسبِ رسول بشنوائیں نکتہ را بسمع قبول
- خاتمہ :- نعمتِ آوی بود بروں ز شہر برتر از جہدِ نعمت دیدار
- کہ بینند خدا کے را بہ بصر چون شب چاروہ مہانور
- دعوتِ شریفِ حق مدجای | بد کلمہ میں اعتقاد مختصر کہ از حضرت جوی قدس سرہ نسائی شہد

منظوم بود بحیث تنبیہ خاص و عام خصوص محققان ناقص تحقیق ازہن کہ از مسئلہ وحدت الوجود حقیقی و ہمہ دوست معنوی کہ مرہیت، انشوراست منکراند و از غیریت حقیقی کہ فیما بین خلق و خالق من حیث لذات و صفات انرا از تا ابد است ناواقف و در مسد جبر و قدر بالکل نامطیع، پادیر بود، مدنی تصرف بود، تو عجب کہ منکران را در وحدت الوجود و ہمہ دوست معنوی من حیث الظہور انکار نمائند، و قدرے بغیرت سنی عبد و رب من الازل الی الابد من حیث الذا حاصل آید، و از بس کہ جبر و قدر کما یشی مطیع شیند تا در مغز قبر و در ذیبت است کہ سخت زمین رفتہ است آسانی بار و نماید و دشواری ہست و نہ اہک دشوار تر از ہمہ دشواری ہست و متفع گردد۔ بغور مطاع فرمائی و با من بنظر ملاحظہ کن، اگر نہ خسرین بدی و زیان کاری سردی، آہ وہ ہاشی و در قبر دنیا مست بمواخذہ گرفتاری است و حد ۱۰-۱۱

تاریخ نے زیادہ تر قرآن و حدیث سے سند رکھی ہے۔ اور حسب ذیل مستند کتابوں سے مدد لی ہے مثلاً

(۱) فتوح الغیب، مصنفہ حضرت میر شیخ عبد سفا در جیلانی لندادی قدس سرہ (۲) فتاویٰ ابراہیم سمقندی، (۳) فقہ اکبر، امام شافعی (۴) سنن کبیر، مصنفہ شیخ عبد کبیر محمدی (۵) بحر المعانی (۶) اقوال شیخ اکبر از فصوص احمد و فتوح ابی حمزہ، تفسیر حضرت ابن عباس (۸) کرامات اولیاء اللہ شیخ عمر بن عثمان علی (۹) فتویٰ مولانا رحمہ (۱۰) اقوال شیخ جنید بغدادی قدس سرہ۔

اپنی بعض تصنیفات کے ذرائع دے دیے ہیں مثلاً بزم التوحید، میزان التوحید، مدار المتقین، رسالہ تجدد، مثال۔

رسائل و ۳ حق کے پاس موجود ہیں، اور میزان التوحید مطبع برطانیہ حیدرآباد دکن میں چھپ گئی ہے۔ درستی خانہ آئینہ میں اس کے نسخے محفوظ ہیں۔

ہم یہاں بعض ابتدائی و راجحی شدہ کی توضیح نمونہ پیش کرتے ہیں، جس سے طریقہ تنبیہ اور استدلال پر روشنی پڑتی ہے :-



مثلاً ہست ایمان بقول پیغمبر + علم شش چیزانے کو محضر کی طوئی توضیح کا خلاصہ یہ ہے :-  
علم کی دو قسمیں ہیں، ایک علم ایمانی، دوسرا علم عملی،

علم ایمانی یعنی علم عقاید، مثلاً آمنت باللہ و ملائکتہ و کتبیہ و رسلہ الخ

منع علم ایمانی کلمہ علیہ ہے جس میں علم کو نین پوشدہ ہے۔ اور علم کو نین کے مدارج یہ ہیں :-

(۱) درجہ جمع ، - (۲) درجہ فرق - (۳) درجہ جمع الجمع

(وجود) (ذات) (اثبات در اثبات)

علم عملی :- تزکیہ نفس و تصفیہ قلب -

توحید کے دو مدارج :- ۱۔ وعدہ مقیدہ - ۲۔ وحدت مطلقہ - اور وحدت مقیدہ مطلقہ  
کی توضیح کے متعلق مختصر و جامع الفاظ یہ ہیں :-

وحدت مقیدہ من حیث الصفات نامن حیث الذات، (نفی مثل) موجب الہام مثل

وحدت مطلقہ من حیث الذات و الصفات بود، (نفی غیر)، موجب الہام وجود غیر،

گویا توحید کا حاصل یہ ہے جو محققین "یک ذات با صفات خود موجود و ذات

صوفیاء کی تعلیم کالب لباب ہے" دیگر با صفات خود معدوم الخ ..

(نیز ملاحظہ ہو لطیفہ بست و بستم - شایف اشرفی مصنف میر شرف جہانگیر سمنانی کچھو

شریف) جس کی شرح مخدوم ساوی بیجا پوری نے دلیل محکم کے نام سے فرمائی ہے (آصفیہ)  
خاتمہ :- دیدار حق تعالی :-

نعمت آں بود بردوں ز شمار برتر از حمد نعمت دیدار

کہ بہ بیند خدائے را بہ بصر چوں شب چارہ در مہ انور

خواجہ سید محمد حسینی بیسودراز استوفی ۸۲۵ھ نے اپنی رسالہ "رویت حق" میں علامہ

بحث کی ہے غرض اس مؤلف نے بھی اس مسئلہ کی تشریح میں مدلل طور پر عقیقہ کے صفحے رنگ  
دئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے :-

اہل سنت جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو چشم سر سے دیکھنا ممکن ہے، یعنی حق تعالیٰ قادر ہے کہ خود کو چشم سر سے دکھلائے درجنت میں مومن حق تعالیٰ کو بے مقابلہ بے جہت و مکان و غیر ذالک من الامادات الحدوث والتقصان دیکھیں گے۔

فرقہ مقررہ اور شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ چشم سر سے خدا کا دیدار ناممکن ہے یعنی وہ اس امر پر قادر نہیں کہ خود کو چشم سر سے دکھلا سکے، بلکہ ان کے پاس رویت حق کفر میں داخل ہے اس کے آٹھ احتمالات کے متعلق اس طرح فرماتے ہیں :-

”تحقیق اس مقدمہ میں است کہ احتمالات چار پر یہ عقیدہ رہا ہے رویت ہشت اند چار ازاں ممکن، و چار ازاں در وقوع، اما در ممکن نیست کہ ممکن است در دنیا و آخرت، و اس مذہب بعض اہل سنت جماعت است، یا متمنع است در دنیا و آخرت، و اس مذہب مقررہ و شیعہ است و یا ممکن است در دنیا و در آخرت متمنع است اس مذہب کے نیست و یا در آخرت ممکن است یا متمنع در دنیا و اس مذہب اس تسنن است الخ“

بقولہ تعالیٰ رب ارنی دن ترانی پر بحث کر کے نتیجہ نکالا ہے کہ :- رب ارنی دلیل صریح ہے کہ خود موسیٰ نے دیدار حق کی خواہش کی نہ ان کی قوم نے، اگر یہ جائز نہ ہوتی اور قوم کی تمنا ہوتی تو موسیٰ خود قوم کو منع فرماتے۔

دن ترانی کا مقصد راستہ لال | یہ کہ دنیا میں خدا کو نہیں دیکھ سکتے، نہ یہ کہ آخرت میں بھی، حضرت موسیٰ کی خواہش اُس وقت صرف دنیا میں دیکھنے کی تھی جواب ملا کہ دنیا میں نہیں دیکھ سکتے، اگر اس کے معنی مطلق ہیں در کہیں کہ آخرت میں بھی دیدار کا یہی حکم ہے تو حضرت موسیٰ کی تمنا باطل ہو جائے گی اور موسیٰ کے متعلق ایسا اعتقاد باطل ہے۔ غرض اس سے ثابت ہوا کہ رویت ممکن ہے رویت کے وقوع کے متعلق اعتبارات میں :-

دنیا اور آخرت میں دیدار ممکن ہے۔ اور مذہب اہل سنت کا یہ ہے کہ حضرت رسول کریم صلعم نے شبہ حاج میں بحالت بیداری چشم سر سے خدا کو دیکھا اور آخرت میں بھی دیکھیں گے، اولیاء کرام

اُن حضرت کی اتباع میں خدا کو بحالت بیداری بصیرت سے دیکھتے ہیں اور آخرت میں چشم سر سے یعنی بصارت سے دیکھیں گے۔

معتزلہ اور شیعہ کا استدلال نفی رویت کی دلیل لَا تَدْرُکُہُ اِلَّا بِصَاسُورٍ ہے مگر ابصار کے معنی ہیں :-  
(۱) عقل، یعنی ”عقلہا بکنہ ذات و صفات اور سرمد و ابکنہ انہا برسد“

(۲) دید :- معنی اور انکے غایت چیزے رسیدن و غایت چیزے را دریا قطن یا شد مثلا اور انکے <sup>الغیر</sup> معنی ہیں :-

معنی رویت دیدن است نہ اور انکے ذات خدا عزوجل زاں منزہ است کا از غایت یا شد تا دیدہا  
آنرا دریا بند، پس معنی لَا تَدْرُکُہُ اِلَّا بِصَاسُورٍ درک ذات است، و بعد رویت غلط فہمیدہ تسکمی کنند...  
رویت کے متعلق بارہ شرائط عقلی یہ ہیں :-

” (۱) سلامت حالت قوت ادراک (۲) بودن شیء جائز الرویت (۳) بودن شے مقابل

بلیندہ (۴) عدم غایت صغیر (۵) عدم غایت قرب (۶) عدم غایت بعد - (۷) عدم

غایت لطافت (۸) عدم جہ - حائل (۹) عدم ضد درک کہ نوم و غفلت و توجہ بچیزے دیگر است (۱۰) بودن

شے روشن بذاتہ (۱۱) متصل تدریس یا کہ خارج از میں است مگر فی (۱۲) منتقل شدن نمونہ، زمینی در حد

رائی . . . . .

و بے وجود این شروط حصول رویت باطل محال عقل است —

بدانکہ وجود این شروط مشروط عادیہ است یعنی حق تعالیٰ عادت خود جاری کردہ تخلق رویت

با وجود این شروط نیز قریب است بر عدم خلق رویت با وجود این شروط ثبوت میں چارہ دلیل نقل است :-

(۱) تَرَوْنَهُمْ مِنْ دُورٍ اَعْمٰی :۔ جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ۳۱۲ اشخاص

تھے اور کفار کے ہزار، مگر کافروں کی نظر میں سمان و دہزار دکھلائے گئے۔ ”یعنی دہزار و چشم

کافران خلق کرد، و این شرط موجود نبود“

(۲) وَاِذْ يُرِيكُمُ هُمْ اِذَا التَّغَيُّمُ فِيْ عَيْكُمُ قَلِيْلًا :۔ کافر زیادہ تھے مگر مسلمانوں کو ان کی تعداد

کم دکھلائی گئی



”بیان آنست کہ حق تعالیٰ . . . . . باوجود شرط خلق رویت نکرد“

(۳) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ دونوں تشریف فرما تھے، ابوالہبؓ ایذا دینے آیا اور کہا کہ حضرت صلعم کہاں ہیں، شرط موجود تھی، حق تعالیٰ نے رویت، ابوالہبؓ کی آنکھ میں پیدا نہ کی۔

(۴) رسول کریمؐ جس طرح سامنے سے دیکھتے تھے اسی طرح پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔ اور بعض شرط موجود نہ تھے رویت کے متعلق بہت سی دلیلیں موجود ہیں :-

(۱) آیت کریمہ :- ”وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاطِقَةٌ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ :-“ نظر۔ کے چار معنی ہیں :-

(۱) اعتبار (۲) بخشش و مہربانی (۳) انتظار (۴) رویت ۔

اعتبار = اس لئے نہیں کہ آں جہاں سرائے اعتبار نیست — دہمینی بخشش و مہربانی، و اس زندہ بخدا روانہ باشد۔ و انتظار اس معنی ہم در اینجا بار نہید۔ زیرا کہ انتظار پنج و ناخوشی است اس آیت بر سبیل بشارت گفتم شدہ کہ بہشت سرائے انتظار باشد — و نظر بمعنی رویت از لنت ہے تاویل است واضح :- شیعہ کہتے ہیں ”ناظرۃ آنست کہ الی ثواب“ یہاں ناظرہ یعنی ثواب حق نگران باشد و این تاویل فاسد است :-

حدیث شریف :- انکم لتدرون دیکم يوم القيامة کما ترون القدر لیلۃ البدر ۔

..... یہ تشبیہ توضیح رویت کے لئے ہے نہ کہ چاند کی طرح مدور دیکھیں گے جو باطل و محال ہے

حدیث :- سب ہنٹی جمع ہوں گے، لہٰذا اودی شروع ہوگا، تسبیح و تہلیل ہوگی، حمد و ثنائیں

سے شرف ہوں گے اس کے بعد تجلی خداوندی سے بہرہ ور ہوں گے۔

حدیث :- بعد اذ حال جنت حجاب دور ہو جائے گا اور خدا کو دیکھیں گے۔

حدیث :- سب بڑا جنتی وہ ہوگا جس کو حق کا دیدار دو مرتبہ رات دن میں میسر ہو۔

لیکن یہ رویت بے کیف ہے جس طرح ذات بے کیف ہے۔

آخر میں فرماتے ہیں :- رویت تنزیہ جزیہ بصیرت امکان ندارد باشتہار رسول کریم صلعم و در خواب ممکن

مثلاً حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ را :- ۱۲

## رفتار ادب

(سہ ماہی تبصرہ)  
(جناب نثار احمد صاحب فاروقی)

پچھلے چند مہینوں سے اردو کتابوں کی اشاعت کی رفتار خاصی مسرت انگیز ہے۔ ایسی کتابیں منظر عام پر آنے لگی ہیں جو لکھنے والوں کی محنت اور موضوع سے محبت کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر اردو کے کلاسیکی سرمائے پر روشنی ڈالتی ہیں اس سے نہ صرف ماضی کی اچھی روایتوں کا تحفظ ہوتا ہے بلکہ ان کی قدر شناسی اور ان کے محاسن کی پزیرائی سے جدید ادبی میلانات کی جڑ اور تصقیہ بھی ہو رہا ہے۔ اس سے مستقبل کے ادب کی گذرگاہیں صاف اور روشن ہوں گی۔ یہ رفتار اسی لئے نیک فال ہے۔

تحقیق اور کاوش کا یہ رجحان ہمارے ادبی بزرگوں ہی میں ملتے جلتے ہے جو اپنے فن اور موضوع کے ساتھ سنجیدہ ہیں اور برسوں رہسرج کرنے کے بعد اپنی تحقیقات منظر عام پر لاتے ہیں۔ تحقیق اور جہاں فتنی کے اخراجات بالواسطہ جہاں تک بھی ہوں یقیناً مفید ہی ہوں گے اس سے ہمارے نئے ناقدوں میں بھی تحقیق کی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوگا۔

میں اس وقت ایسی ہی تین کتابوں کا ذکر کروں گا جو ہمارے لئے معلومات افزا بھی ہیں اور مشعل راہ بھی۔ ان کے نام یہ ہیں: ۱۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی دو کتابیں:

۱۔ لکھنؤ کا عوامی اسٹیج - ۲۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج

اور جناب خلیق احمد نظامی کی بتدریج تصنیف:

۳۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات -

جو کچھ سرمایہ اردو ڈراما پر اب تک موجود ہے اس کے بہت سے گوشے مبہم ہیں اور ضرورت پڑتی کہ کوئی بالغ نظر ادیب اردو ڈراما کی تاریخ کے ابتدائی دور پر روشنی ڈالے۔ یہ اہم کام لکھنؤ کے پروفیسر

سید مسعود حسن رضوی ادیب نے کیا ہے تحقیق و تنقید ان کے خاص موضوع ہیں اور اس دشت کی سیاحت میں انھوں نے ایک عمر گزاری ہے۔

لکھنؤ کا عوامی اسٹیج، امانت لکھنوی کی اندر سبھا کا مقدمہ و تعارف ہے۔ امانت کی اندر سبھا اور داج علی شاہی ریس پر سیرج کرنے کا انھیں پورا حق پہنچتا تھا۔ انھوں نے یہ حق ادا کر دیا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے کتنی محنت کی ہے، کیا نتائج برآمد کئے ہیں تحقیقی اعتبار اور تنقیدی معیار سے کتنا بلند پایہ کام کیا ہے اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جس نے کسی موضوع کی تحقیق میں اپنی جان کھپائی ہو اس بازار میں "کاتا در لے دوڑی" کا کوئی گاہک نہیں۔ سب سے پہلا مرحلہ تو صحیح مآخذ کے حصول کا ہوتا ہے جس کی گرفت میں مآخذ ہی نہ آسکیں وہ موضوع سے کیا انصاف کرے گا؟

آغا حسن امانت لکھنوی کی اندر سبھا جب پہلی بار اسٹیج کھیل گئی تو خلقت اُسے دیکھنے کو ٹوٹی پڑتی تھی ہر گلی کوچے میں اسی کا چرچا تھا۔ اس کے اشعار اور مکالمے سیکڑوں لوگوں کو زبانی یاد تھے مولوی مظہر علی سندیلوی نے اپنے روزنامے میں کئی جگہ اندر سبھا کے ریس کا تذکرہ کیا ہے اور اُسے پڑھ کر اس ملک کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے بڑے بڑے پرانی قدردان کے پرستار در اخلاق وضع داری کے نگہبان، برسوں اس ڈرامے کو "مغرب اخلاق" اور "ناشائے" ہی سمجھتے رہے۔ انھوں نے زہر عشق، سحرالبیان اور اندر سبھا کو تہذیب کے دامن کا داغ سمجھا۔ لیکن آج وہ تصورات بدل گئے ہیں یہی کہیں ماضی کے ثقافتی سرے کا بقیہ اور گذری ہوئی تہذیبی روایات کے قافلے کا نقش قدم معلوم ہوتی ہیں۔ عوامی ذہن مزاج کا عکس اب انھیں میں صوڈھیں مل سکتا ہے۔ ادبی سے زیادہ ان کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت ہے۔ اندر سبھا پہلا ڈراما تھا جو عوامی اسٹیج پر کھیلا گیا اسی لئے پروفیسر مسعود حسن رضوی نے کتاب کا نام بھی لکھنؤ کا عوامی اسٹیج رکھا ہے۔ انھوں نے اندر سبھا کے متعدد مطبوعہ نسخوں سے نائدہ اٹھایا ہے اس کے سوا انھیں اندر سبھا کا وہ چھاپا بھی دستیاب ہو گیا تھا جو خود امانت کی زندگی میں چھپا تھا اور صحیح ترین ہے۔ اس پر امانت نے اپنی جہانگار اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ اس میں کوئی نقطہ کیا، نقطہ بھی غلط نہیں ہے۔

فاضل مرتبے فرسٹ اور غیر مانوس یا شکل نقطوں کے معنی لکھنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ لیکن سب سے



زیادہ اہم ان کا مقدمہ ہے۔ جسے اردو ڈرامے کی تاریخ کا مقدمہ کہنا چاہیے۔ اس میں انھوں نے امانت کی زندگی، ان کے فن، ڈرامے کی مقبولیت اور اس کی، دلی رفتی حیثیت کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جس پر سیر حاصل نہ کیا ہو۔ اس کتاب کے دق اور بلند پایہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

دوسری اہم کتاب "گھنٹوں کا شاہی ایجنڈا" بھی پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تصنیف ہے۔ واجد علی شاہ کے دوبار میں جو رہس ہوا کرتے تھے، ان کی تاریخی تفصیل اس میں پیش کی گئی ہے۔ یہ سوادِ دوسو صفحات کی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے واجد علی شاہ کے حالات اور فنونِ لطیفہ سے ان کی دلچسپی کا بیان کیا گیا ہے۔ انگریزوں نے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہندوستان کی تاریخ میں بہت کچھ کتر بکثرت کی ہے اور تاریخی کرداروں کے چہرے مسخ کر دیئے ہیں۔ یہی تاریخی تحریفوں کا ستم رسیدہ واجد علی شاہ کا کردار بھی ہے۔ انھیں صرف عیاش اکاہن، ناچ گانے کا رس، امورِ نمکست سے قطعاً غافل اور انتظامِ سلطنت کے لئے سمجھنا، اہل قسم کا بادشاہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے مگر ہم عصر مورخوں کے بیان سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

فنونِ لطیفہ سے شاہِ اودھ کی دلچسپی کے ہر روں ثبوت ہیں "رہس" کا ایہی داد اور اس کی سرپرستی بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ خود واجد علی شاہ نے "رادھا کھنڈ کا قصہ" میں ہدایاتِ تمثیل (Directions) کے لکھ بھی تھا۔ پروفیسر رضوی کا کہنا ہے کہ یہ اردو کا پہلا معیاری ڈرامہ ہے۔ امانت کی اندر سمجھا، اس کے بہت بعد میں لکھی گئی۔ یہ جو مشہور ہے کہ امانت نے واجد علی شاہ کی فرمائش پر اندر سمجھا لکھی وہ قیصر باغ میں لکھی گئی، اور خود شاہ نے اس میں کوئی پارٹ ادا کیا، یہ سب فرعی باتیں ہیں ایسے بہت سے مفرد مسائل کی تردید دیوبند کے رفیق پروفیسر رضوی نے کر دی ہے۔

ایک اور ایسی ہی بلند پایہ علمی تصنیف "سلاطینِ دہلی کے مذہبی رجحانات" ہے اس کا موضوع تاریخ ہے اور مصنف اسماعیل یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبہ تاریخ کے ریڈر جناب خلیق احمد نظامی ہیں۔ جنھوں نے تاریخِ مشائخِ چشت، حیاتِ شیخ عبدالغفور محدث دہلوی، شاہِ دل اللہ دہلوی کے سب سے زیادہ لائف، ہنڈ ٹائٹل آف، فریڈم فائٹنگ سٹار، اور ایسٹ اینڈ ڈاکٹر اس کی تاریخ کا ضخیم جیسی ہنڈ میار علمی کتاب میں لکھ کر ہندوستان کے سائنس تاریخ میں اپنا امتیاز قائم کر لیا ہے اس کتاب

میں انھوں نے سیکڑوں تاریخی کتابوں، دستاویزوں، اور نسخوں سے فائدہ اٹھا کر سلاطین دہلی کی مذہبی پالیسی کا مفصل اور مشروح بیان کیا ہے۔ علمی تحقیق اور تاریخی بند نظری دہے بعضی کا یہ ایک عمدہ نمونہ ہے۔ نظامی صاحب اپنے موضوع میں ڈوب کر ابھرتے ہیں اور اس پر حاوی ہو کر لکھتے ہیں وہ کسی موہوم اور مبہم سے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تحقیق کی ذمہ داری بہت بڑی ہوتی ہے۔ خلیق احمد نظامی اس سے عہدہ برآ ہونا جانتے ہیں۔

ان کی یہ کتاب اس لئے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے کہ اس سے سیکڑوں سال کی غلط بیناں "ہیتِ عنکبوت" کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں، تاریخی شعور میں بائیدگی پیدا ہوتی ہے درہم ضی کی طرف ہم دور تک اور دیر تک دیکھ سکتے ہیں۔ اس سے اپنے عظیم کلاسیکی سرمائے کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں، اُس عہد کے میلانات و رجحانات کا پتہ لگا سکتے ہیں اور یہ ایک مثالی تصنیفی نمونہ بھی بن سکتی ہے۔

شاید ایسے ہی علمی کارناموں کے لئے کہا گیا ہے کہ "اچھا کام پن انعام آپ ہوتا ہے" معنوی اور ظاہری خوبیوں سے کتاب ہر طرح آراستہ پیراستہ ہے اور مہدی افادی کا جلد "عروسِ جمیل و لباسِ حریر" اس پر صادق آتا ہے۔

(دہ شکر یہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی)

اردو کے عظیم المرتبت شاعر میر محمد تقی میر کے اپنے قلم سے لکھے ہوئے دچسپ، عبرت انگیز،

اور حیرت آمیز واقعات

## میر کی آپ بیتی

میں ملاحظہ فرمائیے

اسے معروف نقاد شاعر احمد فاروقی نے جس فارسی کتاب سے ترجمہ کیا ہے اور جو بخضروری معلومات خوانشی میں کمزوری میں ترجمہ و تالیف کے حسن کا اعتراف تمام مقتدر علمی جریدوں اور مولے نے کیا ہے۔

طباعت اعلیٰ۔ کتابت عمدہ۔ کاغذ نفیس۔ گٹ اپ شاندار، مکتبہ برہان دہلی سے ۲/۸ میں طلب فرمائیے۔

# آخرِ پست غزل

از

جناب الم مظفر نگری

جو ہیں رند ازل گلشن کو نجات سمجھتے ہیں  
کلی کو شیشہ سے گل کو پیمانہ سمجھتے ہیں  
محبت میں یہ رتبہ بھی نہیں ملتا یا سانی  
غیمت سے ہمیں وہ اپنا دیوانہ سمجھتے ہیں  
مجھے حیرت ہے اہل بزم کی کوتاہی پر  
نال سوز غم کو خاک پروانہ سمجھتے ہیں  
حقیقت آشنا کے گستاخ فصل بہاراں میں  
ہجوم رنگ و بو کو برقی کاشانہ سمجھتے ہیں  
بنایا تھا جنہیں فصل جنوں پرورنے دیوانہ  
وہی اب تو بہا رنگل کو دیوانہ سمجھتے ہیں  
اذا ان عشق کی ہے ایک وہ بگڑی ہوئی  
جسے ہم شورِ ناقوسِ صنم خانہ سمجھتے ہیں  
سحر تک رنگ کیا بدس لگی محفل پوچھ لو ہم  
کہ ہم انجام و جد و قص پر وانہ سمجھتے ہیں  
یہ منجانہ ہے بے رنگی بہاں ملتی ہوائے واعظ  
طلب کو تو یہاں رسم غلامانہ سمجھتے ہیں  
سرِ محفل وہ کیا سمجھیں گے سازِ شمع کے نغمے  
جو سوز غم کی چنگاری کو پروانہ سمجھتے ہیں  
کسی دن جس کے شعلے خرمین بستی کو کھنڈکیں گے  
اسی بجلی کو ہم شمعِ طرب خانہ سمجھتے ہیں  
کہاں سمجھے گی موجِ بوسے گل اس کی حقیقت کو  
بلوے قدر جو لا نگاہِ دیرانہ سمجھتے ہیں  
نکا ہیں ڈالتے ہیں مرکزِ وحدت سے کثرت پر  
حرم میں رہ کے ہم رازِ صنم خانہ سمجھتے ہیں

الم کیا اُن جفا کیغوں سے امیدِ عنایت ہو

بیانِ دردِ دل کو جو کہ افسانہ سمجھتے ہیں



## تبصرہ

**اسباب بغاوت ہند** | از سرسید احمد خاں مع مقدمہ از فوق کریکری تقطیع ۱۸-۲۲ کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۱۸۵۷ء کے خونچکاں دور میں جب کہ ہندوستان کی پوری فضا مظالموں کے خون سے شفق آلود ہو چکی تھی اور انگریزوں کے مظالم سے وحشت زدہ ہو کر ہندوستانیوں کی جرأت و عزم ٹھٹھ کر رہ گئے تھے سرسید مرحوم نے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد اور حوصلہ مقابلہ کے اسباب کا گہری نظر سے تجزیہ کیا اور واقعات حقائق کی روشنی میں انقلابی اقدامات کی صحیح توجیہ و معقول وجہ متیں کہیں جن حوصلہ فرسا حالات میں یہ سب کچھ لکھا گیا تھا اس وقت اس کے کسی حصے کو بھی زبانِ قلم پر لانا ممکن نہیں تھا سرسید کی اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بڑے بڑے خونیں کے فوراً بعد جب پوری انگریز قوم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے انتہائی بدظن اور مشتعل تھی مولف نے اپنی کتاب کی کافی اشاعت برطانیہ تو میں کی اور ان کے ذہنوں کو بدلنے میں کافی بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، آج کے دور میں انگریزوں کے خلاف بولنا اور کہنا ایک معمولی سی بات ہے۔ لیکن سو سال قبل حالات ایسے تھے کہ انگریزوں سے ٹکرانا پہاڑ سے نہیں ندی سے ٹکرانا تھا۔ یہ مفید رسالہ عرصہ سے نایاب تھا۔ حال ہی میں ہندو پاک میں اس کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں زیر نظر ایڈیشن یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، کتاب کے شروع میں فوق کریکری صاحب نے ایک طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے جس میں سرسید کی شخصیت، ان کی تحریک اور مقاصد کی نقاب کشائی کرتے ہوئے بعض الزامات کی تردید کی ہے۔ یہ مقدمہ معلومات افزا مضامین پر پھیلا ہوا ہے اس مقدمے کے ساتھ کتاب کی اشاعت بدلے ہوئے حالات کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے اور اس سے کتاب کی معلوماتی اور افادی حیثیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، اگرچہ فاضل مقدمہ نگار کے اخذ کئے ہوئے نتائج کے تمام پہلوؤں سے اتفاق کرنا ہرگز ضروری نہیں۔



## تبصرہ

**اسباب بغاوت ہند** | از سرسید احمد خاں مع مقدمہ از فوق کریکری تقطیع ۱۸-۲۲ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ نیچر یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

۱۸۵۷ء کے خونریز دور میں جب کہ ہندوستان کی پوری فضا مظالموں کے خون سے شفق آلود ہو چکی تھی اور انگریزوں کے مظالم سے وحشت زدہ ہو کر ہندوستانیوں کی جرأت و عزم ٹھٹھ کر گئے تھے سرسید مرحوم نے انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد اور زیر حوصلہ مقابلہ کے اسباب کا گہری نظر سے تجزیہ کیا اور واقعات و حقائق کی روشنی میں انقلابی اقدامات کی صحیح توجیہ و معقول وجہ متعین کیں جن حوصلہ فرسا حالات میں یہ سب کچھ لکھا گیا تھا اس وقت اس کے کسی حصے کو بھی زبان قلم پر لانا ممکن نہیں تھا سرسید کی اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ عرصہ کے بعد انگریزوں کے فوراً بعد جب پوری انگریز قوم ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے انتہائی بدظن اور مشتعل تھی، مؤلف نے اپنی کتاب کی کافی اشاعت برطانیہ قوم میں کی اور ان کے ذہنوں کو بدلنے میں کافی بڑی حد تک کامیابی حاصل کی، آج کے دور میں انگریزوں کے خلاف بولنا اور کہنا ایک معمولی سی بات ہے۔ لیکن سو سال قبل حالات ایسے تھے کہ انگریزوں سے ٹکرانا پہاڑ سے نہیں زندگی سے ٹکرانا تھا۔ یہ مفید رسالہ عرصہ سے نایاب تھا۔ حال ہی میں ہندوپاک میں اس کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں زیر نظر ایڈیشن یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، کتاب کے شروع میں فوق کریکری صاحب نے ایک طویل مقدمہ سپرد قلم کیا ہے جس میں سرسید کی شخصیت، ان کی تحریک اور مقاصد کی نقاب کشائی کرتے ہوئے بعض الزامات کی تردید کی ہے۔ یہ مقدمہ معلومات افزا مضامین پر پھیلا ہوا ہے اس مقدمے کے ساتھ کتاب کی اشاعت بدلے ہوئے حالات کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہے اور اس سے کتاب کی معلوماتی اور افادی حیثیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے، اگرچہ فاضل مقدمہ نگار کے اخذ کئے ہوئے نتائج کے تمام پہلوؤں سے اتفاق کرنا ہرگز ضروری نہیں۔



# المصنفین کی تاریخی کتابیں

غلامان اسلام

عرب اور اسلام

اسی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور  
کارناموں کا ایمان افروز بیان۔  
قیمت پانچ روپے آٹھ آنے۔ جلد چہر روپے آٹھ آنے۔

حکمائے اسلام

تاریخ اسلام پر ایک نظر

شان دار کارنامے

تاریخ اسلام کے تمام ادوار کے ضروری حالات  
واقعات کی تفصیل تاریخ نویسی کے  
جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر،  
اسلوب بیان نہایت ہی دل نشین،  
قیمت چہر روپے۔  
جلد چہر روپے آٹھ آنے۔

تاریخ اسلام نو جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب  
بہت مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع  
و مکمل بھی، طرز بیان نہایت شگفتہ و روان و ترتیب دل نشین۔

خلافت عباسیہ اولیٰ جلد ۱	خلافت عباسیہ دوم
خلافت عباسیہ ثانیہ	تاریخ معتمدی
خلافت عباسیہ ثانیہ	خلافت عباسیہ ثانیہ
تاریخ معتمدی جلد ۱	قیمت مکمل سیٹ غیر جلد ۱
جلد ۱	جلد ۱

مسلمانوں کا نظم مملکت

مسلمانوں کے نظام حکمرانی کی بصیرت افروز  
تاریخ، جس میں مسلمانوں کے آئین جہان بینی کے تمام شعبوں  
سے متعلق نہایت صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں۔  
قیمت چار روپے۔ جلد پانچ روپے۔

تاریخ مشائخ چشت

سلسلہ چشت کے صوفیائے کرام کی معتقدات تاریخ اور ان  
کے نظام اصلاح و تربیت کا مکمل تذکرہ لائق مطالعہ کتاب۔  
قیمت بارہ روپے۔ جلد تیرہ روپے۔

حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی

شیخ محدث کے کمالات و فضائل کا صاف و شفاف نقشہ اور  
اس دور کی بصیرت افروز تاریخ۔ قیمت تین روپے۔ جلد ۱

مصنفین کی تاریخی کتابیں



# ندوة مبین کی ممبر شپ

۱۔ لاکھ ممبر کم سے کم ایک ہزار روپے ایک مشمت مرحمت فرمانے والے اصحاب اس حلقے میں شامل کئے جاتے ہیں، ایسے ارباب ذوق کی خدمت میں برہان اور مکتبہ برہان اور

ادارے کی تمام مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، کتابوں کی جلد پر لاکھ ممبر کا نام نامی سنہری حروف سے ثبت کیا جاتا ہے کم سے کم سو روپے سالانہ مرحمت فرمانے والے اصحاب حلقہ معاونین خاص

۲۔ معاونین خاص میں داخل کئے جاتے ہیں اور ان کی یہ اعانت عطیہ خالص کے طور پر قبول کی جاتی ہے، ان حضرات کی خدمت میں بھی سال کی تمام مطبوعات اور برہان بغیر کسی معاوضے کے پیش کیا جاتا ہے۔

۳۔ معاونین اس حلقے کی سالانہ فیس تیس روپے ہے، معاونین کی خدمت میں سال بھر کی تمام مطبوعات ادارہ اور برہان کسی مزید معاوضے کے بغیر پیش کئے جاتے ہیں۔

۴۔ معاونین عام معاونین عام کی سالانہ فیس بیس روپے ہے، ان کو سال کی تمام غیر مجلد مطبوعات دی جاتی ہیں اور برہان بلا قیمت دیا جاتا ہے۔

۵۔ اجبار حلقہ اجبار کی سالانہ فیس دس روپے ہے، ان کی خدمت میں برہان بلا قیمت پیش کیا جاتا ہے اور ان کی طلب پر ایک فیس کے بدلے میں ایک سال کی غیر مجلد مطبوعات ادارہ نصف قیمت پر دی جاتی ہیں۔

قواعد رسالہ برہان (۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ (۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیج دیا جائے گا۔

اس کے بعد شکایت قابل اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔ (۵) قیمت سالانہ چھ روپے۔ دوسرے ملکوں سے گیارہ شلنگ (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ آنے۔

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔